اِس صدی کا آخری گرہن
کشمیری لال ذاکر
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

اِس صدی کا آخری گرہن

کشمیری لال ذاکر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

Is Sadi Ka Akhri Girhan
By
Kashmiri Lal Zakir

1994

Price Rs. 125/-

سنِ اشاعت — ۱۹۹۴ء

قیمت — ۱۲۵/- روپے

تعداد — ۶۰۰

کتابت — لقارالرحمٰن

مطبع — عفیف پرنٹرس لال کنواں دہلی ۶

ISBN 81-86232-04-4

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

۳۱۰۸ گلی عزیزالدین وکیل، کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶

جنابِ وِنود دُگل صاحب

کی نذر

جنھیں اُردو زبان سے بے پناہ محبت ہے

فہرست

بس مجھے یہی کہنا ہے

کچھ روز پہلے نمرتا جوشی کے ستیش گجرال سے ایک انٹرویو کا ذکر تھا کسی اخبار میں۔ ستیش گجرال نے اپنی سوانح حیات کا آغاز مشہور جرمن شاعر رنیر ماریا رلکے کی ان سطور سے کیا ہے۔

IS IT LIFE ?

NO, IT IS DESIRE TO LIVE IN HASTE, IN PURSUIT.

IT IS THE IMPATIENCE TO POSSESS ALL OF LIFE RIGHT AWAY, RIGHT HERE.

رلکے کی یہ سطور اس صدی میں جینے والے ہر انسان کی زندگی کی صحیح تصویر پیش کرتی ہیں۔ کتنی جلدی میں ہیں ہم سب۔ اور ہم کتنے بے صبرے ہو رہے ہیں، زندگی سے سب کچھ حاصل کر لینے کو۔ اسی بے صبرے پن کا نتیجہ ہے کہ نہ ہماری محبتیں، نہ دوستیاں، نہ تعلقات، نہ وابستگیاں کچھ بھی دیر پا نہیں رہ گئیں۔ اسی لیے زندگی کے ان بنیادی تقاضوں میں سے کسی سے بھی انصاف نہیں کر سکتے ہم۔ خود اپنے آپ سے بھی کہاں انصاف کرتے ہیں ہم؟ کتنا بھروسہ کر سکتے ہیں ہم اپنی وفاداریوں پر؟ اسی لیے ہم ایک دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کسی پر اعتماد نہیں ہمیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہماری روایات اور قدریں اور سنسکار سبھی ٹوٹ کر بکھرتے جا رہے ہیں۔ اور تو جانے کیا ہوگا لیکن اکیسویں صدی میں انسانی رشتوں کا تقدس ایکدم فنا ہو جائے گا۔ اور جب انسانی رشتوں کی عظمت پر سے وشواس اٹھ جاتا ہے انسان کا

تو اُس کے پاس جینے کو کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ جو کچھ رہ جاتا ہے اُس کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ بس زندگی فقیر کے کشکول کی طرح ہو جاتی ہے، جس میں کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ فقیر نے اِدھر اُدھر در بدر بھٹک کر جو کچھ اکٹھا کیا ہے سب لُٹ جاتا ہے۔ زندگی ایک لُٹی ہوئی بھکارن بن جاتی ہے، جس کے پاس دُعاؤں کی جگہ بددعاؤں کی بھیک رہ جاتی ہے۔ زندگی کی بددُعا کتنی تباہ کُن ہوتی ہے، اِس کا اندازہ ہر شخص کو نہیں ہو سکتا۔ کچھ بدنصیب لوگوں ہی کو ہو سکتا ہے۔

میں نے اِن کہانیوں میں اُن لمحوں کی عکاسی کرنے کی سعی کی ہے، جن لمحوں میں میرے کرداروں نے زندگی کو پہچاننے اور اِنسانی قدروں اور اِنسانی رِشتوں کو مضبوط کرنے کی معمولی معمولی سی کوششیں کی ہیں۔ ہماری یہ چھوٹی چھوٹی کوششیں ہی زندگی کو جینے کے قابل بناتی ہیں اور ہم میں یہ اعتماد پیدا کرتی ہیں کہ زندگی خوبصورت ہے اور ہمیں اِسے زیادہ دِلکش اور زیادہ سُندر بنانے کا جتن کرنا چاہیئے۔ ورنہ آنے والی نسل کے لیے ہم کوئی ایسا وِرثہ نہیں چھوڑ سکیں گے، جس پر اُسے فخر بھی ہو اور ہمارے لیے احترام کا جذبہ بھی ہو۔

بس مجھے یہی کہنا ہے، اِن کہانیوں کے حوالے سے۔

کشمیری لال ذاکر

۳۶۷۔ سیکٹر ۴۴، اے
چنڈی گڑھ

دسمبر ۱۹۹۳ء

چھٹا ادھیائے

کہانی تو بہت طویل نہیں لیکن اتنی مختصر بھی نہیں کہ فوراً ہی ختم ہو جائے اور اس میں پڑھنے والوں کی دلچسپی نہ بنی رہے۔

آج سے چھبیس سال پہلے کہانی کا ہیرو اپنی ایک غیر ہندوستانی دوست کا کیمبرج کے ایک ریستوران کے باہر انتظار کر رہا تھا۔ اس کا دل اُسی طرح تیزی سے دھڑک رہا تھا، جس طرح ان لمحوں میں کسی محبت کرنے والے نوجوان کا دھڑکتا ہے۔ ایک خوبصورت نوجوان نے اپنی تعلیم کے ساتھ عشق کے مکتب میں بھی داخلہ لے لیا تھا اور اُس گھڑی اُسے اس مکتب میں حاصل کیا ہوا علم ہی سب سے زیادہ اہم لگ رہا تھا۔ وہ اسی کا پاٹھ کر رہا تھا اور اس کی آنکھیں اس راہ پر جمی تھیں جس راہ سے اس کی دوست آنے والی تھی۔ جس کا نام سونیا مائینو تھا اور جو اٹلی کی رہنے والی تھی۔ اور وہ معصوم نوجوان جس کا دل دھڑک رہا تھا، راجیو گاندھی تھا، پنڈت جواہر لال نہرو کا دوہتا۔

اور فیروز گاندھی اور اِندرا پریہ درشنی کا بیٹا۔

اور سنجے کا بڑا بھائی۔

یہ وہی راجیو تھا جس نے پانچ سال پہلے، جب اس کی عمر صرف سولہ برس کی تھی، [illegible] گاندھی کی چتا کو آگ دی تھی۔ [illegible] اس روز بھی بھڑکے تھے۔ اور اس روز راجیو نے اپنی کہانی کے پہلے ادھیائے کی پہلی پنکتیاں کاغذ کی بجائے شعلوں پر ہی لکھی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت اسے یہ خیال نہیں تھا کہ وہ انجانے میں، جب وہ اور اس کا بھائی غم کی بھاری چٹان کے نیچے دبے سسک رہے تھے، اپنی زندگی کے ایک شاہکار کی تخلیق کر رہا تھا۔

اور اس سمے ریسٹوراں کے باہر اپنی دوست کا انتظار کرتے ہوئے اُسے اپنے پتا کی یاد آرہی تھی، جو اسے بے حد پیار کرتا تھا۔ اسے اپنی ماں پریہ درشنی کی یاد آرہی تھی اور اس کا خوبصورت چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا اور اُسے اپنا پیارا اور معصوم بھائی سنجے یاد آرہا تھا جو اتنی چھوٹی عمر میں باپ کی شفقت اور محبّت سے محروم ہو گیا تھا۔

اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے نانا پنڈت جواہر لال نہرو کا چہرہ گھوم گیا جو ایک سال پہلے ہندوستان کا وزیر اعظم تھا اور جس نے اپنی آٹو بائیوگرافی اور "ڈسکوری آف انڈیا" میں جہان بھر کی وِزڈم بھر دی تھی۔

اور اسے ایک دم یاد آیا کہ وہ عظیم شخص کئی بار اس کے لیے اور سنجے کے لیے گھوڑا بن کر اور انھیں پیٹھ پر لاد کر، لان میں چکر لگایا کرتا تھا، جیسے وہ ایک بہت ہی معمولی آدمی ہو اور ایک معمولی آدمی کی طرح اپنے بچّوں کا من بہلانا ایک قدرتی عمل ہو اور جب وہ ماضی کے کینوس پر اپنے نانا کو گھوڑا بنے ہوئے گھاس کے چکر لگاتے ہوئے دیکھ رہا تھا تو تصویر کے ایک کونے سے ایک خوبصورت سایہ اچانک اُبھر آیا۔

اس کے سامنے اس کی دوست سونیا مائینو کھڑی تھی۔

وہ ایک دم چونک اٹھا۔

اسے لگا کہ وہ ساعت بڑی نیک تھی اور یہ لڑکی جس سے وہ اس طرح پہلی بار مِل رہا تھا، اس کے لیے بڑی لکی ثابت ہوگی۔

اور اسے ایک سال پہلے کا منظر اپنی پوری جُزویات کے ساتھ یاد آگیا۔ اس کے نانا پنڈت جواہر لال نہرو کا انتقال ہو گیا تھا۔ دراصل پچھلے کچھ سمے سے ان کے من پر بڑا بھاری بوجھ تھا۔ چین جو ایک عرصے سے ہندی چینی بھائی بھائی کے نعرے لگاتا رہا تھا، اچانک اچھے پڑوسیوں کے تمام آداب بھول گیا تھا اور اس نے بنا کسی معقول وجہ کے ہندوستان کی سیماؤں پر حملہ کر دیا تھا۔ انسانی قدروں کے پجاری پر یہ بڑا مہلک وار تھا۔ اس کا اثر گھر کے ماحول پر بھی پڑا تھا۔ پنڈت نہرو ایکدم مایوس اور پست ہمت ہو گئے تھے۔ تین مورتی بھون کی زندگی بخش فضا میں گھُٹن بھر گئی تھی۔ ڈھیر سارے عناصر نے مل کر پنڈت نہرو کی صحت پر بہت ہی بُرا اثر ڈالا تھا۔

گھر کا پُرانا نوکر، ہیرالال ہر روز لان میں سے ایک سرخ گلاب ٹہنی سے توڑ کر لایا کرتا تھا۔

اور پنڈت جی کی اچکن میں لگایا کرتا تھا۔ ہیرا لال ابھی ابھی ایک سرخ گلاب لایا تھا اور اُسے اپنے آنسوؤں سے بھگو کر، پنڈت جی کی اچکن میں لگا دیا تھا۔ لیکن روز کی طرح آج پنڈت جی نے مُسکرا کر اس کا شکریہ ادا نہیں کیا تھا۔ وہ گہری نیند سو چکے تھے اور اب اس نیند سے انھیں کوئی بھی نہیں جگا سکتا تھا۔ جب تین مورتی بھون سے پنڈت جی کی ارتھی کا ماتمی جلوس نکلا تو لگتا تھا، جیسے ان کی ارتھی انسانوں کے سمندر کی سطح پر دھیرے دھیرے تیرتی ہوئی راج گھاٹ کی طرف بڑھتی جا رہی تھی اور پھر طوفان خیز سمندر ایک دم خاموش ہو گیا۔ لہروں کا سارا شور ایک بھرپور سنّاٹے میں سما گیا۔

ارتھی راج گھاٹ پہونچ گئی تھی۔

پھر پنڈت جی کا مردہ جسم چندن کی چتا پر رکھ دیا گیا تھا۔ آج پھر راجیو کو ہی اپنے نانا پنڈت جواہر لال نہرو کی چتا میں آگ دینی تھی۔ اس نے چتا کے گرد سات چکر لگا کر پنڈت جی کی چتا کو آگ دی۔ تینوں فوجی ٹکڑیوں کے سپاہیوں نے اپنے ہتھیار اُلٹے کر دیئے۔ اِدھر فضا میں "پنڈت جواہر لال نہرو امر رہے" کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ اُدھر بیس برس کا راجیو اپنے مخلوط خاندان کی کہانی کا دوسرا ادھیائے اپنے آنسوؤں کی مدد سے شعلوں کی سطح پر لکھ رہا تھا۔ اور اس کی ماں اِندرا گاندھی اور اس کا بھائی سنجے بھی اس ادھیائے کی تکمیل میں اپنے اپنے خاموش الفاظ جوڑے جا رہے تھے۔

شاید انسانی زندگی کی تاریخ اسی طرح لکھی جاتی ہے، آنسوؤں اور شعلوں کی مدد سے۔ اور ہر ایک تاریخ ہر دُوسری تاریخ سے مختلف ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر کوئی اپنی کہانی الگ انداز سے لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسانی زندگی کی یہ کہانیاں اکثر دردناک ہوتی ہیں۔

راجیو کے لیے یہ لمحہ بڑی متضاد کیفیتوں کا حامل تھا۔ اس کا ذہن ماضی کے صحرا میں آبلہ پا گھوم رہا تھا اور اس کے دل کے دریچوں پر حال کی ایک خوشگوار صبح دستک دے رہی تھی۔ ایک آبلہ پا شخص صبح کی نرم نرم آہٹ کو دھیرے دھیرے سُن رہا تھا۔

جب اس نے دل کا دریچہ کھولا تو سامنے سونیا ماینو کھڑی تھی، اپنی تمام تر معصومیت اور خوبصورتی کے ساتھ۔ راجیو کو لگا جیسے اس کے دل کے دریچے اسی لڑکی کے انتظار میں تھے اور یہی وہ لڑکی تھی جو اس کی زندگی کی شریک ہو سکتی تھی اور شاید یہی احساس سونیا ماینو کو بھی ہوا تھا۔ اسے بھی اس کی زندگی کا حصّہ دار مل گیا تھا۔ یہ آپسی کشش رفتہ رفتہ مضبوط ہوتی گئی۔

راجیو کا پہلا پیار ہی اس کا آخری پیار ثابت ہوا۔

جب اس نے اس کا ذکر اپنی ماں سے کیا تو اس نے اپنے بیٹے کے اس جذبے کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایک عارضی قسم کا جذباتی لگاؤ تھا جو رفتہ رفتہ خود ہی کمزور پڑ جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ان دونوں کا آپسی تعلق وقت کے ساتھ زیادہ مستحکم ہوتا گیا۔ بلکہ ایک بار جب راجیو نے لندن میں سونیا کو اپنی ماں سے ملوایا اور کہا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اس کی ماں نے اپنی رضامندی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ راجیو کو ماں کے اس رویّے سے تکلیف ضرور پہونچی تھی لیکن اس کا ارادہ کمزور نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے فیصلے پر اڑا رہا۔

آخر راجیو جیت گیا۔

اندرا گاندھی نے جو اب ہندوستان کی وزیر اعظم تھیں، راجیو کو سونیا سے شادی کرنے پر اپنی رضامندی کا اظہار پہونچا دیا اور شادی صفدر جنگ روڈ کی اُسی کوٹھی میں ہوئی جہاں مسز اندرا گاندھی اب رہتی تھیں۔ انھوں نے شادی کے وقت سونیا کو وہی ساڑھی پہننے کو دی جو انھوں نے فیروز گاندھی سے اپنی شادی کے موقع پر پہنی تھی اور یہ وہ ساڑھی تھی جو جو اُس سُوت سے بنی تھی جو پنڈت نہرو نے جنگ آزادی کے دوران اپنی نظر بندی کے دنوں میں کاتا تھا۔

یہ گلابی ساڑھی مسز اندرا گاندھی اور سونیا کے درمیان ایک مضبوط رشتے کی امانتدار تھی۔ سونیا مائینو اب سونیا گاندھی بن گئی تھی اور اسے نہرو خاندان کی ایک چہیتی خاتون تصوّر کیا جانے لگا تھا۔

شادی کے وقت پہنی ہوئی گلابی ساڑھی، سونیا کے لیے افق پر پھیلا وہ گلابی پن تھا، جس کی وسعتوں کی اوٹ میں ایک حسین صبح اس کی منتظر تھی۔ جب اس صبح کے سوگندھ بھرے اُجالے نے سونیا کو اپنی بانہوں میں لے کر اس کا شفاف ماتھا چُوما، تو اُسے لگا کہ صبح کی دہلیز پر ایک خوبصورت مستقبل اس کے استقبال کو کھڑا تھا۔ اس صحت مند اور مضبوط اور نکھرے ہوئے مستقبل نے سونیا کا ہاتھ تھام کر اسے ایک نئے راستے پر گامزن ہونے کی پریرنا دی۔ وہ راستہ ایک انوکھی منزل کا ساکھشی تھا۔

اور وہ منزل تھی ایک پُرسکون متابل زندگی۔

جب راجیو ہوائی جہازوں کی لمبی اڑانوں کے بعد گھر لوٹا کرے گا، تو وہ اسے دھرتی کی ان تمام خوشیوں اور راحتوں سے مالا مال کر دے گی جو خوشیاں اور راحتیں صرف دھرتی کا ہی حصہ ہیں۔ آسمان کی بلندیاں اور وسعتیں جن کا تصوّر بھی نہیں کر سکتیں۔

اور وہ کئی برسوں تک اپنے خاوند کو وہ سب کچھ دیتی رہی، جو ایک نیک ہندوستانی گرہستن دے سکتی ہے۔ سونیا کے آجانے سے گھر کا سارا ماحول اتنا پرسُکون اور راحت پرور بن گیا تھا کہ راجیو ایکدم بھول گیا کہ وہ پچھلے کئی برسوں سے ایک کہانی بھی لکھتا آرہا تھا۔ اُس نے تو کہانی کے تحریر کردہ وہ صفحے اپنے بیڈرُوم کے ایک نیند آلُود کونے میں ڈال دیئے تھے، اور ان اوراق پر لکھی ہوئی سطریں اس پرسُکون اور سحر آلود فضا میں ہر چیز سے بے نیاز گہری نیند سو رہی تھیں۔

ایک طرف گھر کی مالکن تھی اِندرا گاندھی۔

دوسری طرف سونیا تھی اور اس کے دو معصوم بچے تھے۔ راہُل اور پرینکا۔

تیسری طرف راجیو تھا اور اس کا بھائی سنجے تھا، جو ایک دوسرے سے بھرپُور پیار کرتے تھے حالانکہ دونوں کے مزاج میں کچھ بنیادی اختلافات بھی تھے۔

چوتھی طرف سنجے کی بیوی مینکا تھی اور اس کے ساتھ اس کے مستقبل کے خواب تھے۔

یہ سب ایک خاندان کی کہانی کے مختلف باب تھے لیکن مرکزی کردار ایک ہی تھا۔

دونوں بھائیوں کی ماں جیسے سارے ادھیائے ایکدم ہی لکھ ڈالنے کی جلدی نہیں تھی۔

کہانی کی جو سطریں کاغذوں پر لکھیں، گھر کے ایک خاموش کونے میں سو رہی تھیں، پڑی سوتی رہیں۔ انھیں جگا کر کیا لینا تھا اُسے۔

لیکن وقت کہاں سونے دیتا ہے کسی کو آرام اور سُکون سے۔ وقت تو نیند کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ کال تو شانتی کا ستھائی بَیری ہے۔

اسے یہ کہاں قبول تھا کہ ایک بھرپُور خاندان راحت اور سُکون سے زندگی گذارے۔ اور اپنے خوابوں کو اپنی مرضی کے مطابق سجاتا سنوارتا رہے۔

کال کو تو پرلیہ لانے کا کوئی بہانہ چاہیئے۔

وقت کو تو قیامت کا انتظار رہتا ہے ہمیشہ۔

اور ماہ جون کی ایک صبح کو سنجے ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گیا اور لُو سے جلتی ہوئی اُسی

دوپہر کے تھوڑی دیر بعد، ایک بار پھر راجیو نے چندن کی ایک اور چتا کو آگ دی۔ اس بار وہ اپنے نہایت ہی پیارے چھوٹے بھائی کو شعلوں کے سپرد کر رہا تھا۔

اچانک ہی گھر کے ایک کمرے کے نیند آلود کونے میں سوئے پڑے کاغذ کے اوراق جن پر دو دفعہ پہلے وہ ایک ایک ادھیائے لکھ چکا تھا، اس کی آنسو بھری آنکھوں کے سامنے بیدردی سے پھڑپھڑانے لگے۔

"آگے لکھو نا اپنی کہانی۔" کال راجیو کے کانوں میں بار بار کہے جا رہا تھا۔

"بس کر دو اب۔ اتنا ظلم نہ کرو۔"

"کال سے کہتے ہو وہ ظلم نہ کرے۔ بڑے مُورکھ ہو تم۔" کال بڑی کرختگی سے بولا۔ شاید اس درد کی گھڑی میں اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ بھی لگایا تھا۔

راجیو نے آنسو برساتی ہوئی آنکھوں سے، چتا کے شعلوں پر اپنے خاندان کی کتھا کا ایک اور باب لکھنا شروع کر دیا۔ اس میں اس بار مینکا بھی شامل تھی۔ اس کے پیارے بھائی کی پیاری سی بیوی۔ گھر کی چھوٹی بہو۔

اس چھوٹی بہو نے اپنے پتی کی موت کے بعد ایک بیٹے کو جنم دیا جس کا نام رکھا گیا، فیروز ورن گاندھی۔

اور پھر کال نے ایک اور وار کیا کہ اس پرانے خاندان کی کتھا میں کچھ اور انتر کتھائیں شامل ہوتی رہیں اور یہ کتھا سمے کے ساتھ اور زیادہ الجھتی جائے اور اُس ڈھنگ سے کلائمکس تک نہ پہونچ سکے جس ڈھنگ سے اُسے نارمل طریقے سے پہونچنا چاہیئے تھا۔

ایک اور انتر کتھا کی شروعات ہو گئی۔

سنجے کی موت کے کچھ مہینوں کے بعد یہ چرچا ہونے لگا کہ راجیو گاندھی اپنی ماں کے اصرار پر سیاست کے میدان میں داخل ہونے کی سوچ رہا تھا۔ لیکن اس کی طرف سے اس قسم کا کوئی اشارہ نہ تھا۔

پانچ سال کے وقفے کے بعد، دہلی سے کُلو کی فلائٹ کو دوبارہ شروع کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ یہ فلائٹ دہلی سے چنڈیگڑھ اور یہاں سے بھُنتر جائے گی جو کُلو کی ایئر سٹرپ تھی۔ اصل میں ہماچل میں اس وقت تک دوسرا ہوائی اڈہ تھا بھی نہیں۔ اپریل ۱۹۸۱ء کے آخری ہفتے میں، جو ایورو فلائٹ دہلی سے کُلو کے لیے صبح سوا چھ بجے چلی تھی، اس ہوائی جہاز میں دو پائلٹ تھے جن

میں ایک راجیو گاندھی تھا۔ بھنتر ہوائی اڈے پر اس کا بڑا زبردست استقبال ہوا۔ لوگ اُس خوبصورت پائلٹ کو اپنی وردی میں دیکھنے کے لیے دُور دُور کے پہاڑی علاقوں سے آئے تھے، جس کی ماں اس وقت ہندوستان کی وزیراعظم تھی۔

یہ افواہ عام تھی کہ راجیو گاندھی انڈین ایرلائینز سے استعفیٰ دینے والا تھا۔ جب پریس والوں نے اس سے اس بارے میں سوال کیے تو راجیو گاندھی نے بڑی ہی پیاری اور پرکشش مسکراہٹ کے ساتھ بڑی شائستگی سے جواب دیا۔

"اس وقت میں یونیفارم میں ہوں اس لیے صرف ہوائی جہازوں اور ان کی فضائی پروازوں کے بارے میں ہی بات کروں گا۔"

اس نے بڑی خوبصورتی سے پریس والوں کو ٹال دیا تھا اس وقت، حالانکہ کچھ ہی روز بعد اس نے اپنی ماں کی خواہش پر ہندوستانی فضائیہ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اور اسے کانگریس کا جنرل سکریٹری بنا دیا گیا تھا۔ اب اس نے ہندوستانی فضائیہ کی یونیفارم اُتار دی تھی۔ بس اس انتر کتھا نے تمام کتھا کی ترتیب بگاڑ دی تھی اور اب تک کے لکھے ہوئے تینوں ادھیائے آپس میں گڈمڈ ہونے لگے تھے۔ راجیو کو یہ قدم سونیا کے ہزار بار منع کرنے کے باوجود اٹھانا پڑا تھا۔ کچھ اس کی مجبوریاں تھیں اور کچھ لمحوں کی سازشیں۔

چوتھا ادھیائے سب سے زیادہ دردناک تھا۔

ہندوستان کی وزیراعظم اندرا گاندھی اپنے ہی گھر میں، اپنے ہی باڈی گارڈز کے ہاتھوں قتل کر دی گئی تھی۔ سال تھا ۱۹۸۴ء

تاریخ تھی ۳۱ اکتوبر۔

راجیو گاندھی نے یہ خبر اس وقت سُنی جب وہ اپنے سیاسی دورے پر مغربی بنگال کے دیہات میں گھوم رہا تھا۔ جب وہ واپس پہونچا تو راجدھانی کی فضا آگ اور خون میں نہا رہی تھی۔

اسی فضا کے دم گھونٹ دینے والے واتاورن میں راجیو گاندھی، چوتھی بار چندن کی چتا پر رکھے اپنی ماں کے مردہ جسم کو آگ دے رہا تھا۔ شاید اپنے خاندان کے مرنے والوں کی چتاؤں کو آگ دینا ہی اس کا مُقدر بن چکا تھا اب۔ وہ چتا کے گرد سات چکر لگا کر چندن کی لکڑی سے ان شعلوں کو اونچا کر رہا تھا، جن شعلوں میں کچھ دیر کے بعد اس کی ماں کا جسم تپتی ہوئی راکھ کے ڈھیر میں بدل جائے گا۔

اس بار راجیو گاندھی جتنا رویا تھا، آج تک کسی کی چتا کو آگ دیتے ہوئے اتنا نہیں رویا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ہی چتائیں جل رہی تھیں۔ ایک ساتھ تین چتائیں جل رہی تھیں اس لمحہ۔

ایک چتا اس کی ماں کی تھی، جس نے اسے جنم دیا تھا۔

اور دو چتائیں وہ تھیں، جو اس کی آنکھوں میں جل رہی تھیں، جن آنکھوں سے وہ جنم سے اب تک اپنی ماں کو نہارتا آرہا تھا۔

اور پھر رات کی رات میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک غیر متوقع انقلاب آگیا۔

راجیو گاندھی ہندوستان کا وزیر اعظم بن گیا تھا۔

ملک کی جمہوریت کے لیے یہ پہلا تجربہ تھا کہ اُسے اتنی چھوٹی عمر کا وزیر اعظم ملا تھا، جسے سیاست کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ شاید یہی کارن تھا کہ ملک کے عوام کی تمام ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔ اس کم عمر اور سیاسی طور پر ناتجربہ کار شخص نے اپنی پُرکشش مسکراہٹ اور خوبصورت شخصیت سے، ایک عام آدمی کے دل میں ایک نیا وشواس جگا دیا تھا۔ جب تک سیاسی چالباز اپنے ہتھکنڈوں کے استعمال سے اس پر اپنے اپنے جال پھینکنے میں کامیاب نہ ہوئے، وہ عوام کی زبان میں بات کرتا رہا۔ جن کے پاس جہالت، ان پڑھتا، غربت اور بیماری کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف اپنے اپنے ووٹ کی طاقت ہی تھی ان کے پاس اور اس طاقت کو بھی خود غرض لوگ ضرورت کے وقت، اپنے اپنے مفاد کے لیے استعمال کر لیتے تھے۔ غریب آدمی کے پاس اپنی طاقت کا صرف ایک ہی ہتھیار تھا اور سیاسی جرنیل، چناؤ کے دوران، اِن کا وہی مضبوط ہتھیار ان سے لے کر اپنے اسلحہ کے گودام میں اضافہ کر لیتے تھے اور غریب آدمی کو نہتا کر کے، اس کا ہتھیار اسی پر استعمال کرتے تھے۔ پچھلے پینتالیس برسوں سے ایسا ہی ہوتا آرہا تھا اور طاقت کے شیدائی اس روایت کو کسی قیمت پر بھی ختم کرنا نہ چاہتے تھے۔

یہ ایک خاموش جنگ تھی۔ جو خاموشی سے لڑی جارہی تھی، جس میں استعمال ہونے والا اور ہارنے والا بھی ایک عام آدمی تھا اور مرنے والا بھی وہی تھا۔

اور یہی عام آدمی صدیوں سے ہارتا آیا تھا اور مرتا آیا تھا اور المیہ یہ تھا کہ نئی صبح اور نئے مستقبل کے خوبصورت خواب بھی اسی عام آدمی نے بُنے تھے اور سجائے تھے اور سنوارے تھے اور پھر ان کی موت پر زار و قطار رویا بھی تھا۔ شاید عام آدمی کا مُقدر یہی ہے کہ وہ اپنے کمزور ہاتھوں

سے خوبصورت خوابوں کے تاج محل بناتا رہے اور جب وہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں تو ان پر خون کے آنسو بھی روئے۔

عام آدمی کے ساتھ ایک بار پھر یہی ہوا۔

راجیو کو ہٹا کر ہندوستان کی باگ ڈور ایک اور شخص اور ایک اور سیاسی پارٹی نے سنبھال لی۔ ایک بار پھر عوام کا آزمایا ہوا ہتھیار ان سے چھین کر، انھیں پر استعمال کیا جانے لگا۔ غریب اور محتاج آدمی اپنی کمزور نگاہیں آکاش پر گاڑے اُس گھٹا کو تلاش کرتا رہا، جو برسے گی تو اس کے سُوکھے ہوئے کھیت ایکدم لہلہا اٹھیں گے اور اس کی ٹھنڈک سے اس کے بچوں کے ہونٹوں پر بھوک پیاس سے جمی پپڑیاں پھولوں کی پنکھڑیوں میں بدل جائیں گی۔ گھٹائیں اٹھیں، آکاش پر چھائیں بھی، ہلکی سی نم آلود ہوائیں بھی چلیں لیکن وہ یُگ یُگ کی پیاسی دھرتی پر برسیں نہیں، بس بڑی بے تُلی رفتار سے، اس کے اوپر سے تیرتی ہوئی آگے نکل گئیں۔ وہ کہاں اور کب برسیں گی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ کسی جیوتشی اور ستارہ شناس کو بھی نہیں، جن کے پاس دولت اور طاقت کے پُجاریوں کے ٹھٹھ لگے رہتے تھے۔ عام آدمی نے تھک ہار کر اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ماؤں نے اپنے بھوکے پیاسے بچّوں کو بے معنی اور بے مقصد لوریوں سے بھوکے پیٹ ہی سُلا دیا۔

ہندوستان کا عام آدمی بڑا سخت جان ہے۔

اس میں صبر کی بڑی قوت ہے۔

وہ ایک بار ہارتا ہے تو جنگ کرنا نہیں چھوڑ دیتا۔

جوں ہی اسے اپنے تھکے ہوئے جسم میں تازگی کی ہلکی سی رمق محسوس ہوتی ہے، وہ ایک بار پھر جنگ کے لیے کمر کس لیتا ہے۔

ایک حسین مستقبل میں اس کا بھرپور وشواس کبھی نہیں مرتا۔

شاید اسی لیے ہندوستان کی اپنی مخصوص روایات ابھی تک زندہ ہیں۔

ہندوستان کا عام آدمی ایک بار پھر بہکاوے میں آگیا۔ چھلاوے دیکھنے کا عادی ہوگیا ہے شاید۔

پھر چناؤ ہوئے۔

اب ایک اور سیاسی لیڈر اپنے مہرے لے کر آگیا۔ بساط جم گئی۔ جم کر چالیں چلی گئیں۔

انجام کے طور پر ملک کا نظام اب ایک اور پرانے سیاسی کھلاڑی اور اس کی مخلوط قسم کی پارٹی کے ہاتھ میں آ گیا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ جس دن ایک نئے وزیر اعظم نے حلف لیا، اس سے اگلے دن ہی ایک جوتشی نے پیشن گوئی کر دی کہ یہ وزیر اعظم سات مہینے اور دس دن سے زیادہ اپنے عہدے پر نہیں رہے گا۔

اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی پیشن گوئی دُرست ثابت ہوئی اور ایک بار ہندوستان کے عام آدمی پر یہ ذمہ داری ڈال دی گئی کہ وہ اپنے لیے اب کسی اور شخص کو وزیر اعظم چُننے اور کسی دوسری سیاسی پارٹی کو اپنا ہتھیار سونپ دے۔ اس کے ساتھ تو ہمیشہ ہی ایسا ہوتا آیا ہے۔ وہ سدا اپنا ہتھیار دوسروں کے حوالے کرتا رہا ہے اور خود اسی ہتھیار سے زخم پر زخم کھاتا رہا ہے۔ ایک عام آدمی کا دل زخموں سے گلزار بنا ہوا ہے۔

اور اب درجنوں سیاسی پارٹیاں میدان میں آ گئی تھیں۔

ہر پارٹی کو ہندوستان کی باگ ڈور سنبھالنے کا دعویٰ تھا۔ ملک ایک بار سیاسی پہلوانوں کا اکھاڑہ بن گیا تھا۔ کئی بہت پرانے پہلوان تھے۔ جنھیں کُشتی کے سارے داؤ پیچ یاد تھے۔ کچھ بالکل نئے لوگ تھے، جنھیں اس کھیل کا تو کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن ایڈونچر کا شوق تھا۔ ملک کے کونے کونے میں انتخابات کی مہمیں چل رہی تھیں۔ کہیں بہت تیز، کہیں کم تیز اور کہیں ایکدم سست رفتار۔

بہر حال کھیل جاری تھا اور کھلاڑی اپنے اپنے حمایتیوں کے ساتھ، اپنے اپنے مقدر آزمانے میں مصروف تھے۔ ہر سیاسی پارٹی عام آدمی کو یہ یقین دلانے میں جُٹی ہوئی تھی کہ اگر وہ اقتدار میں آ گئی تو ایک عام ہندوستانی کے تمام دکھ درد دور ہو جائیں گے اور اس کی تقدیر سنور جائے گی۔

ایک عام آدمی بڑے تذبذب میں تھا۔

آخر وہ کس پر یقین کرے؟

جس پر بھی اس نے بھروسہ کیا تھا، اسی لیڈر اور اس کی پارٹی نے اسے لُوٹا تھا۔ ایک عام آدمی کو یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ اب وہ کس کے ہاتھوں لُٹے گا۔

ملک کی فضا بڑی ہی غیر یقینی تھی۔

اور اسی غیر یقینی فضا میں ہر سیاسی پارٹی وشواس اور یقین کی برقی لہریں دوڑا رہی تھی۔

اسی غیر یقینی فضا میں یقین اور وشواس کی شمع جلاکر، راجیو گاندھی اپنی پارٹی کے ایک جلسے میں مدراس سے کچھ دور سری پیرم بدور میں تقریر کے لیے گیا تھا۔ لیکن سٹیج پر پہونچنے سے پہلے ہی ایک عورت نے بم سے راجیو گاندھی کو بُری طرح ہلاک کر دیا اور خود بھی مر گئی۔

یہ دردناک سانحہ ۲۱ مئی کو رات کو سوا دس بجے کے قریب ہوا۔

۲۲ مئی کے اخبار اس حادثہ کی تفصیلات سے بھرے پڑے تھے۔ سونیا اور اس کی بیٹی پرینکا ۲۱ مئی کی رات کو ہی ہوائی جہاز سے مدراس پہونچ گئیں، تاکہ راجیو گاندھی کے مرتک شریر کو دہلی لے آئیں۔ ۲۲ مئی کی صبح ہی کو راجیو گاندھی کا مرتک شریر تین مورتی بھون میں لوگوں کے درشنوں کے لیے رکھ دیا گیا۔ اسی بھون میں تو اس کا تمام بچپن گزرا تھا۔

یہیں تو اسے اپنے نانا پنڈت جواہر لال نہرو کی محبت اور شفقت ملی تھی۔ یہیں تو اس کی ماں شریمتی اندرا گاندھی نے اسے اور اس کے چھوٹے بھائی سنجے گاندھی کی ارتھی پر آنسوؤں میں تر عقیدت کے پھول چڑھائے تھے۔ کئی ملکوں کے سربراہ ماتم پرسی کو آئے اور اس کے ماتمی جلوس میں شامل ہوئے۔ ملک بھر میں راجیو کی موت پر سناٹا چھا گیا تھا۔

جس شخص نے اپنے خاندان کی کہانی کے چار ادھیائے لکھے تھے اور ہر ادھیائے کو چتا کے شعلوں پر تحریر کیا تھا، آج خود اس کہانی کا ایک ادھیائے بن گیا تھا۔

۲۴ مئی کی آگ اگلتی ہوئی شام۔

ہزاروں لوگوں نے دیکھا اپنی ماں کے سمارک کے قریب شکتی ستھل پر اس شخص کا مرتک شریر چندن کی چتا پر رکھا تھا اور اس کا بیٹا چندن کی جلتی ہوئی لکڑی سے اس کی چتا کو آگ دیکر، اس کہانی کا پانچواں ادھیائے شعلوں کی پٹوں پر لکھ رہا تھا اور اس لہو سے لکھی جاتی ہوئی سطروں کو لکھنے میں اس کی ماں سفید ساڑھی پہنے ہوئے، سونیا گاندھی اور سفید شلوار قمیص پہنے، اس کی بہن پرینکا بھی شامل تھیں۔ جنھوں نے اپنے دلوں پر ضبط کی سلیں رکھ کر آنکھوں کے سوتے سُکھا دیئے تھے لیکن ان کی روحیں تڑپ رہی تھیں اور ان میں انگارے دہک رہے تھے اور ان سب کی گواہ تھی راجیو گاندھی کی ماں۔ جس کی چتا کو چھ سال پہلے، یہیں قریب ہی، راجیو نے آگ دیکر اس کہانی کا چوتھا ادھیائے لکھا تھا، جو بے حد دردناک تھا۔ گیتا کے اٹھارہ ادھیائوں میں سے سب سے زیادہ اہمیت دسویں ادھیائے کی ہے، کیونکہ اس ادھیائے کو سننے سے مرتو شَیّا (بستر مرگ) پر پڑا پرانی مکت ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی کہا تھا بھگوان کرشن نے ارجن سے، کورکشیتر کی رن بھومی میں،

جب اس نے کوروؤں کے خلاف جنگ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن شری مد بھگوت گیتا کا پانچواں ادھیائے اس لیے اہم ہے کہ بھگوان کرشن نے اس ادھیائے میں' ارجن سے یہ کہا تھا کہ انسان کو عمل سے منہ نہیں موڑنا چاہیے۔ منشیہ کو کرم کرنا چاہیے لیکن نشکام ہوکر اور بنا اس کے پھل کی آکانکشا کیے۔ جہاں مکتی پانے کے لیے دسویں ادھیائے کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ وہاں سنسار میں زندہ رہ کر کرم کرنے کے لیے پانچویں ادھیائے کو ہر کشن دھیان میں رکھنا چاہیے۔ کیونکہ عمل ہی زندگی کی بنیاد ہے۔ کرم ہی جیون کا شیر شک ہے۔ مرتیو تو انت ــــــ ہے جیون کا۔
حالانکہ جیون کا انت کبھی نہیں ہوتا۔ وہ صرف اپنا روپ بدلتا ہے۔ اپنا چولا بدل کر کسی دوسری شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ جیون امر ہے وہ کبھی مرتا نہیں ہے۔ صرف اپنی شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ گیانی وہی ہے جو اس حقیقت کو پہچانتا ہے ورنہ سنسار میں اگیان کی کوئی سیما نہیں۔ اگیان سیما ہین ہے۔ روشنی اپنی جگہ اہم ہے اندھیرا اپنی جگہ۔ دونوں کا مقابلہ کرنے سے سمسیا کا سمادھان نہیں ہوتا۔ ان پر وچار کرنے سے ہی حل ملتا ہے۔

آج پانچ دن کے بعد ۲۹ مئی کو راجیو کی استھیوں کو کلش میں رکھ کر نئی دہلی ریلوے اسٹیشن سے اسپیشل ٹرین کے ذریعے الہ آباد لے جایا جا رہا ہے۔ کل دوپہر کے بعد پورے سرکاری سمان کے ساتھ استھیوں کو سنگم میں، تینوں ندیوں کے پانیوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ گنگا، جمنا، سرسوتی کے پانیوں میں۔ جو انسانی تہذیب کے خاموش ساکشی ہیں۔ پانچویں ادھیائے کی ان سطروں میں جو پانچ دن پہلے، دہلی کے شکتی ستھل میں شعلوں پر لکھی گئی تھیں، پانی کی لہروں کی مدد سے کچھ اور سطریں جوڑ دی جائیں گی اور اسی طرح مختلف جگہوں پر اور مختلف اوقات پر اور مختلف ذریعے سے پانچویں ادھیائے کی سطروں میں اضافہ ہوتا رہے گا، جب تک کہ یہ ادھیائے پورن نہیں ہو جاتا۔

لیکن کتھا کے اس ادھیائے کا کیا ہوگا جو ابھی لکھا جانے والا تھا؟ جو صرف ابھی کلپنا ہی میں تھا۔ جس کی کوئی واضح شکل نہیں بنی تھی ابھی۔ کتھا کا چھٹا ادھیائے۔ جس میں ہندوستان کے اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی بات کہی جانے والی تھی۔ اس اَن کہی بات کو کون پورا کرے گا اب؟

کون کرے گا اسے پورا؟

کتھا کے چھٹے ادھیائے کو؟

پھولاں پتھیرن

راج موہن میرا سب سے چھوٹا بھائی تھا۔

۳۰ر اپریل کی شام کو وہ مجھے ہریانہ بھون میں ملا ہیں اُسی شام دہلی سے چنڈی گڑھ واپس آگیا۔ اور وہ روہتک چلا گیا۔ پانی پت تک اس نے میرے ساتھ سفر بھی کیا تھا۔

اچانک پہلی مئی کی رات کو ٹیلی فون آیا کہ راج موہن کا شام کو میڈیکل کالج میں انتقال ہو گیا۔ کارن تھا شدید قسم کا ہارٹ اٹیک۔ میں ایک دم سناٹے میں آگیا۔ رات ہی کو کار سے روہتک روانہ ہو گیا اور صبح ہونے سے بہت پہلے پہونچ گیا۔

راج کا مُردہ جسم سفید چادر سے پوری طرح ڈھکا کمرے کے فرش پر رکھا تھا اور جسم کے اِرد گِرد برف کی سِلیں رکھی تھیں۔ میں نے چادر ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ ایک دم شانت تھا ــ لگتا تھا دن بھر کے کام کے بعد دیر میں سویا ہوا اور تھوڑی دیر میں جاگ جائے گا۔ لیکن تھوڑی دیر تو کیا وہ دوپہر تک بھی نہیں جاگا۔ مُردہ جسم کہاں جاگتے ہیں ؟

راج موہن میرے دوسرے بھائی کے ساتھ اینٹوں کے بھٹے کا کاروبار کرتا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس کاروبار میں پورے علاقے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ دو ایک بار میں خود بھی اس کے بھٹے پر گیا تھا اور بھٹے کی تمام ورکنگ دیکھی تھی۔ کچی مٹی کی کھُدائی، کچی اینٹوں کو سانچوں میں ڈھالنا، اینٹوں کی پکائی، کچی اینٹوں کو پکانے کے لیے کوئلے کی تہیں، پکی اینٹوں کی نکاسی۔ کوئلے کو کئی کئی جگہ سے بھٹے میں لگاتار ڈالنا۔ مزدوروں کی چوکسی، جو لکڑی کی موٹی موٹی کھڑاویں پہن کر دن رات جلتے ہوئے بھٹے کی اوپر کی سطح پر چکر لگاتے رہتے تھے۔ کچی اینٹیں بنانے والوں کو پتھیرے کہتے ہیں۔ اور عورتیں پتھیرنیں کہلاتی ہیں۔ اینٹوں کے بھٹے کا کام مرد اور عورتیں مل کر کرتے ہیں۔ اس لیے بھٹے کے پاس ایک چھوٹا سا گاؤں بن جاتا ہے۔ اینٹوں کی چھوٹی چھوٹی

جھونپڑیاں جن میں مزدور اور ان کے کُنبے رہتے ہیں۔ کوئی کوئی مزدور تو گائے بھی رکھ لیتا ہے جس کا دودھ وہ دو چار جھونپڑیوں میں بیچ دیتا ہے۔ پاس کے کسی گاؤں کا کوئی آدمی وہاں ایک چھوٹی موٹی دکان بھی بنالیتا ہے، جہاں سے مزدور لوگ اپنی روزمرّہ کی ضرورت کی چیزیں بھی خریدتے ہیں اور یہ سارا کام اُدھار پر چلتا ہے۔ مزدوروں کو ہر اماوس اور پورنماشی کے دن ان کے حساب کے مطابق مزدوری کا بھگتان ہوتا ہے۔ بھٹّے کا مُنشی ان دو دنوں میں بڑی اہم شخصیت کا مالک ہوتا ہے کیوں کہ مزدوروں کی روزی روٹی کا سارا کھاتہ مُنشی ہی کے پاس ہوتا ہے۔ بھٹّے کا مالک مہینہ بھر چاہے کہیں رہے لیکن اماوس اور پورنماشی کے دن بھٹّے پر اس کی حاضری ضروری ہوتی ہے۔ یہی دو دن مزدوروں کے جشن کے ہوتے ہیں۔ رات بھر گاتے ہیں اور دارو پیتے ہیں اور چار دن کے بعد دکان دار سے اُدھار پر آٹا، دال، چاول خریدنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے اکثر دیکھا کہ راج موہن چاہے کہیں ہو اماوس اور پورنماشی کے دن ضرور ہی بھٹّے پر موجود ہوتا تھا۔ بعض اوقات اسے مزدوروں کی اُجرت ادا کرنے کے لیے رقم کا انتظام کرنے میں پریشانی بھی ہوتی تھی۔

لیکن بھٹّے کے سبھی مزدور جن کی کل آبادی چار سو کے قریب تھی، راج موہن کا بیحد احترام کرتے تھے اور اس سے بنا جھجک اپنی مشکلات اور اپنے مسائل کا ذکر کرتے تھے۔ ان سب کا یہ کہنا تھا کہ ان کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جسے راج موہن نے حل نہ کردیا ہو۔ وہ ایک طرح سے ان کی بستی کا مُکھیا تھا۔

بھٹّے پر دو ایک بار جانے کے بعد میں نے مزدوروں کی زندگی کو زیادہ قریب سے دیکھنے کی کوشش کی۔ بھٹّے پر کام کرنے والے مزدوروں کی زندگی کا ڈھانچہ دوسرے مزدوروں کے لائف پیٹرن سے مختلف نظر آیا۔ ان مزدوروں کو کام دلانے کے لیے بھی ایک تیسرا شخص ہوتا ہے جو نمبردار کہلاتا ہے۔ وہ بھٹّے کے مالک سے مزدور سپلائی کرنے کا ایگری مینٹ کرتا ہے۔ وہ دونوں پارٹیوں سے کمیشن لیتا ہے۔ مالک سے بھی اور مزدور سے بھی۔ یہ روایت اتنی پرانی ہے کہ بعض بھٹّوں پر تو بندھوا مزدوروں کی پرتھا چل پڑی ہے۔ نمبردار اور بھٹّے کے مالکوں نے آپس میں ایک گہری سازش کے تحت مزدور اور اس کے خاندان کو ایک طرح سے اپنا غلام بنالیا ہے۔ وہ چاہیں بھی تو بھٹّہ چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ نمبردار نے دھیرے دھیرے وِلن کا رول لے لیا اور اس سارے ڈرامے کو اپنی مرضی سے ڈائرکٹ کرنے لگا ایلنٹوں کے بھٹّوں پر کام کرنے والے مزدوروں کا لگ بھگ یہی طریقہ کار ہے۔ جہاں مالک زیادہ لالچی نہیں اس عمل میں لچکیلاپن

پیدا ہو گیا ہے ــــ اینٹوں کے بھٹّے پر کام کرنے والے مزدوروں کے استحصال کو میں نے محسوس کیا اور اس موضوع پر کئی بار میں نے راج موہن سے بات بھی کی۔ راج موہن بہت زیادہ پڑھا لکھا نوجوان نہیں تھا لیکن زندگی کے مکتب میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرتے رہنے کے بعد اس کے پاس بڑی پریکٹیکل نالج آگئی تھی۔ وہ فطرتاً بڑا سادہ، حسّاس اور نرم دل تھا اس لیے اس کی طرف سے کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوئی تھی۔ اسے ادب سے لگاؤ تھا اور اُردو میں چھپی کہانیاں اور کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ کبھی کسی کہانی یا ناول کے بارے میں مجھ سے بھی گفتگو کر لیا کرتا تھا۔ یہ جبھی ہوتا تھا جب اس کا چنڈی گڑھ آنا ہوتا تھا یا میں کسی کام سے روہتک جاتا تھا۔ مجھے راج موہن کی دو باتیں پسند تھیں۔ اُردو ادب سے اس کی گہری دلچسپی اور پس ماندہ طبقے سے رفاقت کا اظہار۔ اسی لیے چاروں بھائیوں میں سے مجھے راج موہن سے زیادہ محبت تھی۔ اور وہ ہم سب سے عمر میں بھی چھوٹا تھا۔

ایک دن گفتگو کے دوران اس نے مشورہ دیا کہ میں اینٹوں کے بھٹّے پر کام کرنے والے مزدوروں پر ایک چھوٹا سا ناول لکھوں۔ اس کی بات سمجھ میں آگئی۔ اُس نے اس موضوع پر مجھے بہت سا مواد بھی دیا۔ کچھ کرداروں کے خاکے بھی دیئے۔ ان کے مسائل پر بھی طویل گفتگو کی۔ اس دن راج موہن بہت موڈ میں تھا۔ اُسے کسی قسم کی کوئی بری عادت نہیں تھی۔ البتہ سگریٹ بہت پیتا تھا۔ اُس دن اس نے باتیں بھی بہت کیں۔ بھٹّے پر کام کرنے والے مزدوروں اور پتھیرنوں کے بھی بہت سے قصّے سُنائے۔ غرض اُس نے مجھے اچھے خاصے ناول کا مواد دے دیا اور ڈھیروں سگریٹ پھونک ڈالے۔

پھر اس نے مسکرا کر کہا۔

"اپنے ناول کا ہیرو مجھے رکھ لیجیے۔"

"رکھ لیا۔"

"تو کب سے ناول لکھنا شروع کریں گے؟"

"بس ہیروئن تلاش کر لوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"میں اس میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔" اس نے جواب دیا۔

بات یہیں ختم ہو گئی۔

اینٹوں کے بھٹّوں پر کام کرنے والے مزدوروں پر ناول لکھنے کا منصوبہ تو میں نے بنالیا

لیکن ناول نہیں لکھ سکا۔ ناول کے لیے ہیرو کی ٹکر کی ہیروئن نہیں ملی۔ ہیروئن ملتی تو ناول کی روپ ریکھا بنتی۔ ہیرو بہت مضبوط تھا۔ اُس جیسی مضبوط ہیروئن ملتی تو بات آگے چلتی۔ ہیروئن نہ مل سکنے کے کارن ایک نئے اور اچھوتے موضوع پر لکھا جانے والا ناول تکمیل نہ پا سکا۔ بیچ میں دو ایک بار راج موہن نے ناول کے بارے میں پوچھا بھی لیکن سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ سوچا تو یہ تھا کہ اس ناول کا انتساب بھی میں راج موہن کے نام ہی کروں گا لیکن اب تو اسے موت نے اپنے نام منسوب کر لیا تھا اور تمام داستان ہی ختم ہو گئی تھی۔

دوپہر تک راج موہن کی موت کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ گھر کا لان اور ساتھ لگتی دونوں گلیاں لوگوں سے بھر گئی تھیں۔ ایک عام آدمی کی موت کا بھی یہ ردِ عمل ہو سکتا ہے۔ اس کا تجربہ پہلی بار ہوا تھا۔ جتنے لوگ ارتھی میں شامل ہونے کے لیے آئے تھے اُن میں آدھی سے زیادہ تعداد غریب، بدحال، میلے کچیلے کپڑے پہنے مزدوروں کی تھی، جو راج موہن کے بھٹے کے علاوہ آس پاس کے بھٹوں پر کام کرتے تھے وہ سب گلی میں خاموشی سے ایک طرف کھڑے تھے اور بار بار اپنی گیلی آنکھوں کو اپنے میلے کُرتوں کی آستینوں سے پونچھ رہے تھے۔

یکم مئی کا دن پچھلے ایک سو برس سے لیبر ڈے کے حوالے سے منایا جا رہا ہے۔ اُس دن سبھی سیاسی اور غیر سیاسی پارٹیاں مزدوروں کی بہبود کے لیے خیالی اور کاغذی پروگرام بنا کر ان کی دلجوئی کرتی ہیں۔ مزدور دنیا بھر میں اس روز ریلیاں آرگنائز کرتے ہیں۔ مجھے لگا کہ راج موہن کے گھر کے سامنے بھی مزدوروں کی ایک ریلی ہو رہی تھی، اپنے بھر لپور اتحاد کی گواہی دینے اور اپنے لیڈر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے۔ وہ عقیدت جو وہ ایک دن پہلے نہیں پیش کر سکے تھے۔ راج موہن غیر شادی شدہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس کی آخری رسومات کون ادا کرے اور اس کی چتا میں آگ کون لگائے؟ اس بات کی طرف کسی نے اب تک دھیان ہی نہیں دیا تھا آچاریہ آ گیا تھا۔ جو سامگری اسے چاہیے تھی وہ بھی منگوالی گئی تھی۔ تینوں بھائیوں کے بیٹے اِدھر اُدھر کھڑے اپنی ماؤں سے صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ تبھی میں نے دیکھا ششی، بے ماں کا میرا بیٹا آیا اور آچاریہ کے سامنے بیٹھ گیا۔

"میں راج صاحب کا بھتیجا ہوں، چتا میں آگ میں لگاؤں گا۔"

میں نے یہ سُنا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جب سے میں یہاں پہونچا تھا مجھے رونا نہیں آیا تھا۔ اپنے بیٹے کی بات سن کر میں پھپھک پڑا۔

ششی، کوری دھوتی اور کوری بنیان لے کر نہانے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا۔ دوسرے دونوں بھائیوں کے بیٹے اپنی ماؤں سے مشورہ کرنے کے بعد آکر ایک طرف کھڑے ہو گئے تھے۔

اور پھر راج موہن کی ارتھی کو گھر کے باہر لان میں رکھا گیا اور اسی لمحہ گلی میں ایک طرف جمع مزدوروں کی بھیڑ اندر گھس آئی اور فضا دردناک چیخوں کی گونج سے تھرّا گئی۔ ششی کوری دھوتی اور بنیان پہنے، ہاتھ میں پانی کا لوٹا لیے ارتھی کے اٹھنے کا انتظار کرتے ہوئے، بہت اُداس اور نڈھال لگ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ میں ایک دم ٹوٹنے لگا ہوں۔ چند لمحوں کے بعد گھر کے اندر باہر گونجتی چیخوں کے درمیان میرے بھائی کی ارتھی کو مزدور کندھا دیتے ہوئے اس سڑک کی طرف بڑھنے لگے جو سڑک شمشان گھاٹ کو جاتی ہے اور جو ہر انسان کے سفر کی آخری کٹھن سڑک ہے، جس پر وہ اپنے پاؤں سے نہیں چلتا۔ دوسروں کے کندھوں کا سہارا لے کر یہ سفر طے کرتا ہے۔

میں بہت دیر تک گیٹ کے سہارے کھڑا رہا۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ گیا۔ میرے جاننے والے دو ایک لوگ، جن میں بھٹّے کا مُنشی سنت لال بھی تھا، میرے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ سنت لال اندر سے پانی کا گلاس لے آیا۔ پانی پیا تو طبیعت کچھ سنبھلی۔

"آپ کار سے چلیں۔ شمشان بھومی یہاں سے کافی دور ہے"۔ سنت لال نے کہا۔ میں ابھی اس کی تجویز پر سوچ بھی نہیں سکا تھا کہ ایک بوڑھی دیہاتی عورت میلا سا کُرتا اور میلا سا سُوتی لہنگا پہنے، دہاڑیں مارتی ہوئی گلی میں داخل ہوئی۔

"کہاں ہے میرا بیٹا؟" وہ چیخی

اور پھر اس نے مُنشی سنت لال کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"بولتے کیوں نہیں، کت بھیج دیا میرے بیٹے کو؟" وہ اور بھی زور سے چیخی۔

"پھولاں تائی، راج بابو کو تو شمشان لے گئے ہیں"۔

"میرا بھی اِنتجار نہیں کیا جالمو!"

اور پھر سب کے روکنے کے باوجود وہ بزرگ دیہاتی عورت ننگے پاؤں، اس سڑک پر بھاگ کھڑی ہوئی، جو سڑک شمشان کو جاتی تھی اور جو یہاں سے بہت دُور تھا اور جہاں تک جانے کے لیے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے کار کے استعمال کا مشورہ دیا گیا تھا۔

"کون تھی یہ عورت؟" میں نے مُنشی سنت لال سے پوچھا۔

سنت لال نے اس عورت کے متعلق جو تفصیلات بتائیں وہ اس طرح سے تھیں۔

اس عورت کا نام پھُولاں تھا۔ اس کے ماں باپ بھی بھٹّوں پر پتھیروں کا ہی کام کرتے تھے۔ وہ بھی انہی کے ساتھ رہ کر پتھیرن کا کام کرتی تھی۔ وہ راجستھان کے ایک گاؤں میں بنے بھٹّے پر پیدا ہوئی تھی۔ اُن دِنوں آس پاس کے کھیتوں میں سرسوں پھولی ہوئی تھی۔ جس دائی نے اسے بھٹّے پر بنی ایک جھونپڑی میں جنم دلوایا تھا، اسی نے اس کا نام پھُولاں رکھا تھا۔ پھُولاں جب جوان ہوئی تو بھوانی کے ایک گاؤں میں پتھیروں ہی کے ایک کنبے میں اس کا بیاہ ہوگیا۔ پھُولاں بہت خوبصورت تو نہیں تھی لیکن اس کی دیہہ تگڑی تھی اور وہ کام سے نہیں گھبراتی تھی۔ بیاہ کے بعد پھُولاں کی زندگی میں جو تبدیلی آئی وہ صرف اتنی تھی کہ وہ راجستھان کے ایک بھٹّے سے اٹھ کر ہریانہ کے ایک گاؤں والے بھٹّے پر آگئی تھی۔ ویسا ہی ماحول تھا، ویسا ہی کام تھا۔ لگ بھگ ویسے ہی لوگ تھے۔ جس قسم کی زندگی اس نے اب تک گذاری تھی ویسی ہی زندگی اسے یہاں ملی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے باپ کو کوئی عیب نہیں تھا اور یہاں اس کے خاوند کو دارُو پینے کی لت تھی۔ شروع شروع میں تو سُسرال والوں سے اس کا بہت جھگڑا رہتا تھا۔ بلکہ ایک بار تو وہ اپنے ماں باپ کے پاس بھی چلی گئی تھی۔ لیکن پھر پتھیروں کی پنچایت نے دونوں گھروں میں صلح صفائی کرادی اور پھُولاں سُسرال کے بھٹّے پر واپس آگئی۔ لیکن اس کے خاوند نے دارُو نہیں چھوڑی۔ اور آخر کار پھُولاں نے ہار مان لی اور اس ماحول سے سمجھوتہ کرلیا۔ پھر اس کے خاوند کا اپنے ماں باپ سے جھگڑا ہوگیا اور ایک دن پھُولاں پتھیرن اور اس کا خاوند اپنے ماں باپ کا بھٹّہ چھوڑ کر کسی دوسرے بھٹّے پر کام کرنے لگے۔ اس طرح دس بارہ سالوں میں انھوں نے کئی بھٹّے چھوڑے اور کئی بھٹّوں پر کام کیا۔ لیکن پھُولاں جو بانجھ بھی تھی اور شاید اسی لیے تیز مزاج بھی ہوگئی تھی، ایک بھٹّے پر زیادہ دیر نہ ٹکتی تھی۔ اس کا جھگڑا ہو جاتا تھا جس کی وجہ اس کے خاوند کی شراب نوشی اور دوسروں سے اُدھار لینے کی عادت تھی۔ جس بھٹّے پر پھُولاں پتھیرن اب آئی تھی وہ روہتک کے پاس ڈوب گاؤں میں راج موہن کا بھٹّہ تھا۔ راج موہن نے بھی یہ بھٹّہ کسی دوسرے آدمی سے خریدا تھا۔ اور مزدوروں کا جو نمبردار اس بھٹّے کے لیے پتھیرے اکٹھے کرکے لاتا تھا وہی نمبردار ہردیو اور اس کی گھر والی پھُولاں پتھیرن کو بھی کام کرنے کے لیے اس بھٹّے پر لایا تھا۔ پھُولاں اور ہردیو پچھلے دس برس سے راج موہن کے بھٹّے پر ہی تھے۔ انھوں نے اس بھٹّے کو چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ چلے جانے کی بات کبھی نہیں سوچی تھی۔ پھُولاں اس بھٹّے پر کام کرنے والی سبھی پتھیرنوں

کی اگوا بن گئی تھی۔ کئی پتھیرے اپنی گھر والیوں سمیت راج موہن کا بھٹہ چھوڑ کر چلے جاتے تھے لیکن ناراض ہو کر یا تنگ ہو کر نہیں، اپنی کسی ذاتی مجبوری کے کارن۔ راج موہن اپنی بساط کے مطابق سب کی مدد کرتا تھا، اور کسی کو ناراض نہیں ہونے دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مزدوروں کے کئی کُنبے برسوں سے اسی بھٹے سے جُڑے ہوئے تھے۔ کیوں کہ اینٹوں کے بھٹوں پر کام سیزنل ہوتا ہے، اس لیے جب برسات کا موسم شروع ہو جاتا تھا تو مزدور اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے اور جب بارشیں بند ہو جاتی تھیں تو کچھ مزدوروں کو چھوڑ کر باقی سب اسی بھٹے پر واپس آجاتے تھے لیکن پھولاں کی بات دوسری تھی۔ اس نے تو راج موہن کے بھٹے پر اپنی پکی جھونپڑی بنالی تھی اور اس جھونپڑی میں اینٹیں بھی اپنے ہی ہاتھ کی پکائی ہوئی نمبر ون کی استعمال کی تھیں۔ اُس نے ایک گائے بھی خرید لی تھی اور دُودھ دہی کا انتظام بھی ہو گیا تھا۔ برسات کے دنوں میں پھولاں کا گھر والا ہردیو، آس پاس کے گاؤں میں سبزی بیچنے کا کام کرنے لگتا تھا اس لیے وہ بیروزگار نہیں رہتا تھا۔

راج موہن سے پھولاں پتھیرن کا ماں بیٹے کا جو رشتہ بنا اس کی تفصیل مُنشی سنت لال نے بتاتے ہوئے ایک واقعہ کا ذکر کیا۔

گرمی بہت زوروں پر تھی اور بھٹے میں اینٹوں کی پکائی ہو رہی تھی۔ ایک مزدور جب خالی جگہ سے لوہے کا پترا اُٹھا کر بھٹے میں کوئلہ ڈالنے لگا تو جلتے ہوئے کوئلے کی ناقابل برداشت تپش کے ساتھ کچھ چنگاریاں یک لخت اس کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ وہ درد سے چیخا اور بھٹے کی گرم گرم مٹی پر گر پڑا۔ اس کے پاؤں سے لکڑی کی کھڑاویں بھی الگ ہو گئیں۔ اس کی چیخ سُن کر کچھ مزدور اس کی طرف لپکے۔ اس کا جسم بھی جُھلس گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں بے پناہ جلن اور اذیت تھی۔ مزدور بڑی مشکل سے اسے اٹھا کر بھٹے سے نیچے لائے۔ اگلے دن اماوس تھی اور راج موہن اپنے مُنشی کے ساتھ مزدوروں کی اجُرت کا حساب کر رہا تھا اور بھٹے کے ایک طرف بنے اپنے دفتر میں بیٹھا تھا، جو صرف ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اور جس کی چھت سے لگا پنکھا گرم ہوا کے ریلے ان دونوں پر پھینک رہا تھا۔ مزدوروں کا شور سُن کر راج موہن دفتر کے کمرے سے باہر نکلا۔ مزدور زمین پر بے ہوش پڑا تھا اور اس کی گھر والی زور زور سے چیخ رہی تھی۔

راج موہن نے مزدور کو اُٹھوا کر اپنے ٹرک میں رکھوایا، جو ابھی ابھی شہر میں اینٹیں ڈال کر واپس پہونچا تھا۔ کچھ مزدور بھی ٹرک میں بیٹھ گئے۔ ان مزدوروں میں پھولاں پتھیرن کا گھر والا

ہر دیپا بھی تھا۔ راج موہن بجائے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کے، مزدوروں کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ وہ ڈرائیور کو ہدایت دے رہا تھا کہ وہ سنبھل کر ٹرک چلائے۔ میڈیکل کالج کے بھی کئی ڈاکٹر راج موہن کے دوست بن گئے تھے کیوں کہ وہ اکثر کسی نہ کسی مزدور کو لے کر وہاں آتا رہتا تھا۔ مزدور چاہے کہیں کا ہو راج اس کے دکھ درد میں اس کے ساتھ تھا۔ بے ہوش مزدور کو بڑی احتیاط سے ٹرک سے اتار کر ٹرالی پر لٹایا گیا اور پھر راج موہن خود ٹرالی کو دھکیل کر ایمرجنسی وارڈ میں لے گیا۔ اس کی جان پہچان کے ڈاکٹر فوراً آ گئے اور انھوں نے جلن اور درد سے تڑپتے مزدور کو سنبھال لیا۔ کچھ دیر کی تگ و دو کے بعد اور پوری میڈیکل ایڈ کے مل جانے سے مزدور کی حالت خطرے سے باہر ہو گئی۔ راج موہن نے سب مزدوروں کو ٹرک میں بیٹھ کر بھٹے پر چلے جانے کو کہہ دیا۔ صرف ہر دیپا اور اس کا ایک اور ساتھی اسپتال میں رہ گئے۔

بہت دیر ایمرجنسی وارڈ کے باہر کھڑا راج موہن اور ہر دیپا اور اس کا ساتھی مزدور تینوں تھک گئے تھے۔ رات بھی ہو گئی تھی۔ سگریٹ بیڑی پینے اور تازہ ہوا لینے کے لیے تینوں میڈیکل کالج کی بلڈنگ سے باہر نکل آئے۔ اب گرمی کا پرکوپ کم ہو گیا تھا۔ ہوا تو خیر ابھی تک گرم تھی لیکن اماوس سے ایک دن پہلے کی کالی سیاہ رات دن کے مقابلے میں تو کم ہی گرم تھی۔ اس وقت انھیں دراصل چائے کی تلاش تھی۔ اور وہ اسی غرض سے اسپتال سے باہر بازار کی طرف جا رہے تھے جو بہت دور نہیں تھا۔ اسی وقت راج موہن کا ٹرک بھٹے سے دوبارہ اسپتال آ رہا تھا اور ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ پر پھولاں پتھیرن بیٹھی تھی۔

عین اسی لمحہ ایک کار بہت تیز رفتار سے ان تینوں کے پاس سے گذری، شاید اس میں کوئی نازک حالت والا مریض تھا۔ اور راج موہن نے دیکھا کہ ہر دیپا سڑک کے کنارے خون میں لت پت تڑپ رہا تھا۔ سڑک سنسان ہو گئی۔ آس پاس نہ کوئی آدمی تھا نہ اسکوٹر رکشا تھی۔ راج موہن کو جانے کیا سوجھی۔ اس نے ہر دیپا کے ساتھی مزدور کی مدد سے زخمی ہر دیپا کو اپنی باہنوں میں اٹھایا اور مزدور ہی کے سہارے سے ہر دیپے کے خون میں لتھڑے ہوئے جسم کو ہانپتے کانپتے ہسپتال کے مین گیٹ تک لے آیا۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی تھے جنھوں نے بے ہوش ہر دیپے کو ٹرالی میں ڈال کر ایمرجنسی وارڈ میں پہونچا دیا۔ راج موہن کے کپڑے بازو اور ہاتھ خون سے تر تھے اور وہ ایک دم خاموش تھا، جیسے اس کے ہونٹ سل گئے ہوں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیوار کے ساتھ کھڑا دیکھے جا رہا تھا۔ راج موہن کے بھٹے کا ایک اور مزدور بھی تو ایمرجنسی وارڈ میں تھا۔

اس کا بہت خون نکل چکا تھا۔ ہردیوا کو فوراً خون کی ضرورت تھی۔ اب تو وہاں کوئی مزدور بھی نہیں تھا جو خون دینے کو تیار ہو جاتا۔ آدھی رات کے وقت بیڈ پر پڑا راج موہن ہردیو پتھیرے کے لیے اپنا خون دے رہا تھا اور پھولاں پتھیرن اس کے سرہانے کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھولاں کو لگا جیسے اب وہ بانجھ نہیں رہی تھی۔ اس کا بیٹا تو اس کے عین سامنے سکون سے اپنی زندگی کے لمحے کسی اور کو دیے جا رہا تھا۔ وہ ایک دم کمرے سے باہر نکل گئی اور باہر آکر زور زور سے رونے لگی۔

ہردیوا بچ گیا تھا۔

اور پھولاں پتھیرن جو تیس برس سے بانجھ تھی، اچانک ماں بن گئی تھی۔

میں اپنے بھائی کے گھر کے گیٹ کے باہر کھڑا تھا اور اس سڑک کو دیکھ رہا تھا، جو ایک موڑ کے بعد اس سڑک میں مل جاتی تھی جو سڑک شمشان بھومی کو جا رہی تھی اور ابھی کچھ ہی لمحے پہلے پھولاں پتھیرن جس کی طرف ننگے پاؤں بھاگی تھی۔ مجھے لگا کہ ستی کی رسم کی ایک اور پرتھا قائم ہونے والی تھی۔ ایک عورت اپنے خاوند کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے بیٹے کی لاش کے ساتھ چتا میں کود کر جلنے والی تھی۔ یہ ایک اور غلط پرتھا قائم ہونے والی تھی۔ ہندوستانی عورت کا مقدر کیا صرف جلنا ہی ہے؟ چاہے وہ بیوی ہو، چاہے ماں! ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے منشی سنت لال کی بات مان لی کہ شمشان بھومی تک کار ہی میں جانا چاہیے نہیں تو پھولاں پتھیرن مجھ سے پہلے وہاں پہنچ جائے گی۔

میں نے دیکھا تپتی ہوئی سڑک پر بدحال پھولاں پتھیرن ننگے پاؤں دوڑے جا رہی تھی لیکن لگتا تھا اب اس کی رفتار کمزور ہو گئی تھی۔ جب ڈرائیور نے اس کے قریب پہنچ کر کار کو روکا اور منشی سنت لال اور ڈرائیور دونوں نے مل کر اسے کار میں بٹھا دیا تو اس نے کوئی مدافعت نہیں کی۔ وہ بہت نڈھال ہو گئی تھی۔

میں راج موہن کی موت کے چوتھے دن کی بات کر رہا ہوں۔ صبح سویرے سات بجے استھیاں چُنی جانی تھیں۔ طے یہ ہوا تھا کہ میرا بیٹا ششی، استھیاں لے کر اپنے انکل کے ساتھ وہیں سے ہری دوار چلا جائے گا۔ استھیاں چُننے کے بعد وہ گھر واپس نہیں جائے گا۔

استھیاں چُننے کی رسم ادا ہو رہی تھی۔ کوری دھوتی اور بنیان پہنے، ششی ننگے پاؤں ٹھنڈی ہو چکی چتا کے گرد چکر لگا رہا تھا اور آچاریہ منتروں کے اُچارن کے ساتھ ساتھ چتا کی راکھ پر کچی لسّی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ چتا کے اردگرد دوستوں اور رشتہ داروں کی بھیڑ تھی اور اس بھیڑ میں زیادہ تعداد

مزدوروں کی تھی جن میں ہردیوا اور اُس کے کئی مزدور ساتھی شامل تھے جن کی مدد، راج موہن نے ان گھڑیوں میں کی تھی جب وہ بالکل مایوس ہو چکے تھے۔

آچاریہ راج موہن کی ایک ایک استھی چن کر اور اسے کچی لسّی سے دھو کر، اُس تھالی میں ڈالے جا رہا تھا، جو چِتا کی ایک طرف بیٹھے ششی کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ استھیاں بھی تھالی میں ڈلوائے جا رہا تھا اور ان پر اس کے آنسوؤں کا گنگا جل بھی گر رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں گنگا جل کے پوِتر جل سے آنکھوں کے جھرنوں سے برستا ہوا جل زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

پھر کورے سفید کپڑے کی چھوٹی سی تھیلی میں راج موہن کی استھیاں سرخ مولی کے دھاگے سے باندھ دی گئیں اور تھیلی ششی نے دونوں ہاتھوں میں تھام لی اور شمشان بھومی کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ ششی ایک دم خاموش تھا اور ننگے پاؤں چلتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا اور بڑی بیدردی سے روئے جا رہا تھا۔ گیٹ سے باہر سڑک پر کار کھڑی تھی جس میں وہ اپنے انکل کے ساتھ بیٹھ کر سیدھا ہری دوار چلا جائے گا اور اگلی صبح سورج چڑھنے سے پہلے راج موہن کی استھیاں گنگا کے پوِتر جل کے سپرد کر دی جائیں گی۔

پھر ایک ایسی گھٹنا ہوئی جس کا مجھے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔

شمشان بھومی کے گیٹ سے پھولاں پتھیرن داخل ہو رہی تھی۔ وہ بے حد کمزور اور تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ میرے علاوہ شاید کچھ ہی لوگوں نے اسے دیکھا تھا۔

وہ ایک دم ششی کی طرف لپکی اور اس کے ہاتھوں سے راج موہن کی استھیوں کی تھیلی چھین لی۔ ششی ایک دم بھونچکا سا اسے دیکھتا رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے ایک بار رو رو کر سوجی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ شاید اسے اطمینان ہو گیا کہ کچھ غلط نہیں ہوا تھا۔ بھیڑ میں سے کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ پھولاں پتھیرن سے کچھ کہتا۔ سب خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے — پھولاں پتھیرن نے استھیوں والی تھیلی کو اپنی چھاتی کے ساتھ چمٹا لیا۔ وہ ایک دم خاموش تھی اور اس کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔

میں نے دیکھا وہ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی اور اس نے راج موہن کی استھیوں کی سفید تھیلی اپنی میلی، پُرانی اور جگہ جگہ سے پھٹی اوڑھنی سے ڈھک کر اپنی چھاتی کے ساتھ لگا رکھی تھی۔

ششی اور اس کا انکل کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے اور ششی نے ایک بار میری طرف دیکھا تھا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا تھا۔ مجھے اس کی دماغی اذیت کا اندازہ تھا۔ لیکن کار جب ہری دوار کے لیے چلی تو مجھے لگا پھولاں پتھیرن ایک بار پھر بانجھ ہو گئی تھی۔

■■

پہلے کسے جواب دوں؟

اسی شہر میں ایک برس پہلے ایک ہفتہ رہ کر گئی تھی۔

میں ان دنوں لندن سے ایجوکیشن میں ڈپلوما لے کر لوٹی ہی تھی۔ کوئی خاص کام نہیں تھا۔ ویسے ہی پرانے سمبندھ اُجاگر کرنے کے لیے اِدھر اُدھر گھومنا چاہتی تھی۔ کام بل گیا تو پھر نکلنا مشکل ہوگا۔ یہاں میری پرانی دوست تھی اسپتال کی ڈاکٹر، رنجنا، بڑی پیاری لڑکی تھی۔ وہ جس ڈاکٹر سے شادی کرنا چاہتی تھی، اس نے ایک سسٹر سے بیاہ کر لیا تھا۔ عہد و پیمان بندھتے رہے تھے۔ لیکن جب ٹوٹے تو دیر نہ لگی اور رنجنا اس جھٹکے کو برداشت نہ کر سکی۔ وہ بڑی نازک دل و دماغ کی عورت تھی۔ بلکہ میں تو کہا کرتی تھی کہ اسے ڈاکٹر نہیں بننا چاہئے تھا۔ اسے تو میوزک کی ڈگری لینی چاہئے تھی یا کسی آرٹس اسکول سے پینٹنگز کا کوئی امتحان پاس کرنا چاہئے تھا جتنا کس دل اور دماغ والے ڈاکٹر کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہتا اور یہی حال رنجنا کا ہوا۔ وہ جو ایک پھیلاؤ سا ایک وسعت سی، ایک اُمنگ سی اس کی زندگی میں پیدا ہوئی تھی ایک دم دب گئی۔ اسکی شخصیت کا سارا پھیلاؤ ایک مرکز پر سمٹ گیا۔ اور وہ اپنی تمام وُسعتیں لے کر اپنے دل کے محفوظ آنگن میں لوٹ آئی، جس کے اردگرد ضبط کی اونچی دیوار تھی اور باہر کی ہوا کا بہاؤ رُک جاتا تھا اور دُھوپ کُھلے انداز سے داخل نہ ہو سکتی تھی اور چاند اپنی رعنائیاں کھل کر نہ لُٹا سکتا تھا۔ اس نے اپنے دل کے دروازے ہر کسی اجنبی کے لیے بند کر دیئے اور شادی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ یہ فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اپنے جذبات کی دولت کسی کے قدموں میں نہ بکھیرے گی۔

میں جب لندن سے لوٹی تو سب سے زیادہ میرا انتظار رنجنا کو ہی تھا اور میں سب سے پہلے اسی کو ملنے آئی تھی۔ وہ سب پکچر پوسٹ کارڈ جو میں اُسے وہاں سے بھیجتی رہتی تھی، اُس نے اپنا البم میں سجا رکھے تھے جس کے شروع کے حصے پر میری تصویر تھی اور آخری پہ

اس کی اپنی۔ جیسے اس کی زندگی مجھ سے شروع ہوئی تھی اور خوبصورت مناظر کو دیکھ کر اور اِدھر اُدھر گھوم کر آخر اپنے آپ پر آ کر رُک گئی تھی۔ جب میں پہونچی تھی تو وہ اُسی وقت اسپتال سے واپس آئی تھی ایک ڈیلوری کیس اٹینڈ کرنے کے بعد۔ وہ جب بھی اسپتال سے واپس آتی تھی سیدھی باتھ روم میں چلی جاتی تھی۔ نہاتی تھی، کپڑے بدلتی تھی، جب کوئی دوسرا کام کرتی تھی۔ لیکن اس شام اس نے اپنا سارا معمول بدل دیا۔ وہ میرے ساتھ لیٹ گئی، میرے کٹے ہوئے بالوں میں منھ چھپا کر انھیں چومنے لگی اور اپنے جذبات کی سموچی حرارت میرے دل میں منتقل کرنے لگی۔

میں جب بھی جانے کا پروگرام بناتی وہ ملتوی کرادیتی۔ مجھے ابھی اپنی بڑی بہن سے ملنے جالندھر جانا تھا، ماں سے ملنا تھا جو آج کل نیوز میں تھی اور میرے بھائی کے پاس رہ رہی تھی۔ اور اپنی بچی چیتنا کو دیکھنا جسے دیکھے پانچ برس ہو گئے تھے۔ کئی بار اکیلے میں، جب رنجنا اسپتال گئی ہوتی، میں سوچتی کہ میں کیسی ماں تھی جو اپنی بچی کو نہیں ملی اور اپنی ایک سہیلی کے پاس چلی آئی اور اب جانے کا نام نہ لے رہی تھی۔ سوچتی بھی اور کڑھتی بھی، لیکن جب رنجنا آجاتی تو اس کی آنکھوں میں جلتے ہوئے محبت کے چراغ مجھے اپنی روشنی میں شرابور کر دیتے اور میں سب کچھ بھول جاتی اور جانے کا پروگرام آپ سے آپ کینسل ہو جاتا۔ میں اور انجنا شہر کے سبھی ریستورانوں میں گئی تھیں۔ رنجنا کبھی کسی کے ساتھ کسی ریستوران میں نہ گئی تھی اور اکیلی جانے کا تو سوال ہی نہ اُٹھتا تھا۔

"تمہارے شہر میں دو ایک ریستوراں تو اچھے ہیں۔" میں نے کہا تھا

"پر یہ سب تمہارے آنے سے معلوم ہوا ہے۔"

"کیسے؟"

"میں تو کبھی یہاں نہیں آئی، میں شہر کی سب سڑکوں سے بھی واقف نہیں۔"

"زیادہ سڑکوں سے واقف ہونے والے اکثر بھٹک جاتے ہیں۔"

میری یہ بات سن کر وہ ہنس دی تھی اور پھر میرے پتی کے بارے میں پوچھا تھا۔

"ہاؤ از یور ہسبینڈ؟"

"فائن۔"

"تو اب تم اکیلی ہوگی ہندوستان میں؟"

"نہیں، میرے خیالات، میرے نظریئے، میری تمنائیں میرے ساتھ ہوں گی۔"

"وہ تو ہوں گی ہی، لیکن —" رنجنا خاموش ہوگئی تھی۔

میں نے مسکرا کر کہا تھا۔

"دراصل ہم سب اکیلے ہیں۔ اکیلے اور تھکے ہوئے۔ ہر لمحہ کسی کو تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ہر پل کسی کا انتظار رہتا ہے ہمیں"

"میں سمجھی نہیں تمہاری بات"۔ اُس نے کافی کی پیالی ہونٹوں سے لگاتے ہوئے میری طرف اَدھ کھلی آنکھوں سے دیکھا۔

"رنجنا کبھی کبھی ہری کے پہلو میں لیٹی ہوئی سوچا کرتی ہوں کہ یہ وہ آدمی نہیں ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں رات دن اُس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی کسی اور کا انتظار کرتی رہتی ہوں — لیکن جب دل کو ٹٹولتی ہوں تو کہیں کسی شخص کی تصویر نہیں۔ کوئی خاکہ نہیں۔ کوئی پرچھائیں نہیں۔ پھر میں سہم جاتی ہوں اور کروٹ لے کر ہری کے جسم سے سٹ جاتی ہوں اور اپنا بازو اس کے گردن کے گرد ڈال دیتی ہوں۔

جانے یہ سب کیا ہے؟" میں نے ٹھنڈی ہوتی جا رہی کافی سے ایک گھونٹ لیا۔ کڑوی کافی جس میں نہ دودھ تھا نہ کھانڈ تھی۔ پھر میرا دل چاہا کہ ایک سگریٹ سُلگاؤں۔ اور میں نے اپنے کیبن کا پردہ ٹھیک طرح سے کھینچ کر سگریٹ سُلگا لیا۔ پیکٹ میرے پرس میں پڑا تھا۔

"تم بہت سگریٹ پیتی ہو —" رنجنا بولی؟

"یہ تو پانچواں ہی سگریٹ پیا ہے صبح سے"۔ میں نے مسکرا کر سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور سارا دھواں اس کی آنکھوں میں انڈیل دیا۔ رنجنا دھوئیں کی چبھن سے آنکھیں مَلنے لگی۔

"سِلی"

میں اس کے ردِ عمل پر ہنس پڑی۔

رنجنا مجھے شہر کی سڑکوں اور کُھلے بازاروں میں بھی گھماتی رہی۔ جانے اتنا ڈھیر سارا فالتو وقت اس کے پاس کہاں سے آگیا تھا۔

"کتنے بے جان لگتے ہیں یہاں کے بازار۔ لوگ بڑے آرام سے چل رہے ہیں۔ جیسے انھیں کہیں بھی پہونچنے کی جلدی نہ ہو۔ جیسے ان کے پاس بہت سا وقت ہے، جسے وہ گذار نہیں سکتے۔ جیسے ان کے پاس کوئی کام نہیں"

"واقعی کام نہیں ہے، ہم لوگوں کے پاس"۔

"اسی لیے انھیں زندگی میں رفتار کی اہمیت کا احساس نہیں۔ کہاں ایک بیل گاڑی اور کہاں آکاش کی وسعتوں کو چیرتا ہوا ہوائی جہاز۔"

" ٹھیک ہے۔ لوگوں کو کام ملے۔ کام کا مناسب معاوضہ وصول ہو سکے تو سارا سماجی نظام بدل سکتا ہے۔ اقتصادیات سے رفتار کا بڑا تعلق ہے۔"

" مانتی ہوں لیکن رفتار ایک ذہنی عمل بھی ہے۔ ہم لوگ ذہنی طور پر تیز چلنے کے قائل نہیں۔ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانے کے قائل ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ بازار کی بھیڑ آہستہ آہستہ سرک رہی تھی۔ یہاں تو جیسے کاروں کی رفتار بھی سست تھی۔ جیسے کوئی بھی تیز چلنا نہ چاہتا تھا۔ میں اوب رہی تھی اس ماحول سے۔ جس ماحول میں پانچ برس گذار کر آئی تھی وہ کتنا مختلف تھا۔ ابھی تک اپنے آپ کو اس بدلی ہوئی فضا میں کھپا نہ سکی تھی۔ حالانکہ یہ وہی فضا تھی جس میں میں نے ہوش سنبھالا تھا، زندگی کے چوبیس برس گذارے تھے۔ آج وہی اوپرا لگ رہا تھا۔ محسوس ہو رہا تھا جیسے سارا اتساہ ہی ختم ہو گیا تھا۔ چلتے چلتے فٹ پاتھ پر لگی ایک دکان کے سامنے رک گئی۔ پٹاخوں اور پھلجڑیوں کی دکان تھی۔ میرے ذہن میں جیسے کوئی انار چھوٹ گیا۔ رنگ بکھر گئے۔ میں نے ڈھیر سارے پٹاخے، پھلجڑیاں، رنگدار ماچس اور انار خرید لیے۔ جب دکاندار سامان پیک کرنے لگا تو رنجنا نے مسکرا کر کہا۔

" لندن میں رہ کر بھی تمہارا بچپنا نہیں گیا۔"

" انسان بنیادی طور پر وہی رہتا ہے جو وہ دراصل ہے۔" میں نے جواب دیا۔ پٹاخوں کا پیکٹ رنجنا نے تھام لیا اور ہم دونوں گھر لوٹ آئیں۔ اس شام پہلی بار رنجنا کے پڑوسیوں نے، اس کے اسٹاف نے، اس کی ساتھی ڈاکٹروں نے دیکھا کہ اس کے گھر میں پٹاخے گونج رہے تھے، پھلجڑیوں کے پھول بکھر رہے تھے اور اناروں کے رنگ فضا میں گھل رہے تھے۔ وہ حیران تھے لیکن خوش تھے۔ رنجنا کے دل کے آنگن کی دیواریں نیچی ہو گئی تھیں، باہر کی ہوا بنا روک کے اندر آ رہی تھی۔ چاند کی کرنیں اپنی تمام رعنائیاں کھلے انداز سے لٹا رہی تھیں۔ ہم دونوں کھڑکی کے سامنے کھڑی تھیں اور کانوں میں پٹاخوں کی گونجیں سنسنا رہی تھیں۔

" تم تو چلی جاؤ گی لیکن میرے کواڑ ایک دوسرے سے ٹکراتے رہیں گے۔"

" کواڑ بالکل کھول دو پھر وہ آپس میں نہیں ٹکرائیں گے۔" میں نے جواب دیا۔ اتنے میں کال بیل گونجی۔

"کوئی مریض آگیا ہے، اب میری شامت آئی"۔ اس نے بستر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

لیکن مریض نہیں تھا۔ وہ پل بھر میں ہی اندر آگئی تھی۔

"تمہارا تار ہے"۔

میں نے تار کھولا۔ کانپور سے میرے بھائی کا تار آیا تھا۔ میری ماں، میری بچی اور میرا بھائی سب میرا انتظار کر رہے تھے۔

دُوسرے روز میں رنجنا کے دروازے کُھلے چھوڑ کر کانپور چلی گئی۔ اُسے تاکید کر گئی کہ اب وہ اپنے دروازے پوری طرح کُھلے رکھے۔

کچھ دیر کے بعد مجھے کام مل گیا اور میرا گھومنا پھرنا ختم ہو گیا۔ اب تو رفتار کا احساس کم ہوتا جا رہا تھا۔ ایک INERTIA کی سی کیفیت اُبھرنے لگی تھی۔ ہنگاموں سے جیسے کنارہ کشی ہونے لگی تھی۔ زندگی کالج اور گھر تک محدود ہو گئی تھی۔ ماں کو میں نے اپنے پاس ہی بُلا لیا تھا۔ ذرا چیتنا کی دیکھ بھال ہو جاتی۔ میرا گھر سے سمبندھ بنا رہتا۔ میں نے اپنی دلچسپیاں سمیٹ لی تھیں۔ زندگی ایک مخصوص ڈھرے پر آکر ٹک گئی تھی۔ اب تو باہر بھی جبھی جایا جا سکتا تھا جب چُھٹی ہو ورنہ نہیں۔

کرسمس کی چھٹیاں ہوئیں تو رنجنا نے تقاضا کیا اُسے ملنے ضرور جاؤں۔ من مچل اٹھا۔ اور میں چیتنا کو چھوڑ کر رنجنا کو ملنے چل دی۔ رنجنا اب واقعی بدل گئی تھی۔ اس کے دروازے اب پوری طرح کُھلے تھے۔ پہلے کی طرح نیم وا نہیں تھے۔ کھڑکیوں پر گرے ہوئے بھاری بھاری پردے اُٹھے ہوئے تھے۔ اس لیے باہر سے روشنی اور ہَوا کمروں میں آ رہی تھی۔ آنگن میں بے ترتیب اُگی ہوئی گھاس کی بجائے اچھا خاصا لان بنا تھا جس کے چاروں طرف پیارے سے پھُول کھل رہے تھے۔ مجھے یہ تبدیلی دیکھ کر خوشی ہوئی۔ رنجنا کی آنکھوں کے چراغ پہلے سے زیادہ روشن تھے اور اس کی باتوں میں اتساہ تھا۔

"دیکھا، میں نے دروازے بند نہیں کیے"۔

"اسی لیے تمہارے گھر میں اب روشنی اور دُھوپ زیادہ ہے"۔

"جو ریستوراں تمہیں پسند تھا، اس میں کئی بار گئی ہوں، کافی پی ہے، وہیں اُسی کیبن میں

بیٹھ کر۔"

" لیکن سگریٹ تو نہیں پی ہوگی "

" نہیں تمہارے لیے میں نے سگریٹ کے ایک درجن پیکٹ منگوا رکھے ہیں "

اس کی بات سن کر میں مسکرا دی۔

" لیکن میں تو اب سگریٹ نہیں پیتی "

" کیوں ؟ " اس نے حیرت سے پوچھا۔

" ماحول بدل گیا ہے نا، اس لیے "

" رفتار کی اہمیت بھولنے لگی ہو "

" نہیں اُسے اس کے ٹھیک پرسپکٹو میں دیکھنے لگی ہوں " میرے جواب پر وہ ہنس دی اور مجھے اپنی باہوں میں سمیٹ کر کہا۔

" یو آر مارولس "

" از اِٹ "

" یس " اور اس کے بازوؤں کی گرفت اور بھی مضبوط ہوگئی۔

اس شام رنجنا کے ہاں کچھ لوگ آنے والے تھے۔ ایک مختصر سی پارٹی تھی۔ ہم دونوں اس کی تیاری میں لگی رہیں۔ رنجنا جس نے اسپتال سے باہر کی دنیا میں کبھی دلچسپی نہ لی تھی اب بڑی ایکٹِو بن گئی تھی۔ اس نے سبھی سے میرا تعارف کرایا۔ جی بھر کر میری تعریف کی اور پھر جب سب لوگ کھانے پینے میں مصروف ہو گئے تو مجھے کہنے لگی۔

" میں تمہیں ایک آدمی سے ملوانا چاہتی تھی، لیکن کم بخت آیا ہی نہیں "

" کون ہے وہ ؟ "

" این انٹلیکچول "

" میں سمجھی نہیں "

" بہت اچھا فنکار ہے۔ بڑی پیاری کہانیاں لکھتا ہے "

" لیکن مجھے آرٹسٹوں سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں۔ نہایت بور اور سیلف سینٹرڈ آدمی ہوتے ہیں۔ ایکدم سناب " میں نے کہا۔

" یہ سبھی کمزوریاں اجے میں بھی ہیں، لیکن وہ پھر بھی اچھا آدمی ہے "

"ہوگا۔"

پارٹی ختم ہونے لگی تو اجے آدھمکا۔

"آئی ایم ویری سوری ڈاکٹر۔"

"دیٹ اِز آل رائٹ۔" رنجنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہُوا یہ کہ راستے میں —"

میں اسے دیکھ رہی تھی۔ وہی عام آرٹسٹوں جیسا بناوٹی پن، فنکار کسی بھی ملک اور کسی بھی طبقے کا ہو ایسا ہی ہوتا ہے۔ لندن میں بھی تو وہ اسی طرح بی ہیو کرتے تھے، جیسے یہ لوگ یہاں کرتے تھے۔ چاہے اپنا پُرانا پھٹا ہوا کوٹ رفو کرا تا رہا ہو، لیکن کہے گا یہی کہ ایک بہت ضروری میٹنگ تھی جسے وہ چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کی بات نہیں سُنی۔ اور بسکٹ اُٹھانے کے لیے میز کی ایک طرف سرک گئی۔

رنجنا اسے میرے قریب لا رہی تھی۔

"مسٹر اجے، بہت اچھے کہانی کار اور یہ میری صدیوں پرانی دوست کامنا، کئی برس لندن میں رہ کر آئی ہے۔"

"نام بڑا خوبصورت ہے۔" وہ بولا اور مسکرا کر ہاتھ جوڑ دیئے۔

"تھینکس۔" وہی پرانے حربے، میں سنبھل گئی۔ ان فنکاروں سے خدا بچائے۔ رنجنا اس کے لیے چائے کی پیالی بنا کر لائی اور اُس نے سگریٹ سُلگالی۔ مَیں نے دیکھا اُس کا سگریٹ لائیٹر خوبصورت تھا۔

مہمان دھیرے دھیرے جانے لگے۔ لیکن اسے جلدی نہیں تھی۔ وہ میرے ساتھ لندن میں گذارے ہوئے دنوں کے بارے میں باتیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میرا بالکل جی نہ چاہ رہا تھا۔ میرے سر میں درد ہو رہا تھا اور میں چاہتی تھی کہ سارِیڈان کی ٹکیا لے کر بستر میں پڑ جاؤں۔ اور جب رنجنا مہمانوں سے نپٹ کر آئی تو میں سر درد کا بہانہ کر کے اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اجے بھی چلا گیا۔ رنجنا میرے پاس آ گئی۔

"اجے تمہاری بڑی تعریف کر رہا تھا۔"

"ہر فنکار ہر عورت کی تعریف کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کل پھر آئے گا تم سے لندن کے بارے میں باتیں کرنے کے لیے۔"

" اور کل پھر میرے سر میں بہت سخت درد ہوگا اور میں منہ سر لپیٹے بستر میں پڑی ہوں گی "

میں نے جواب دیا۔

اور پھر موضوع بدل گیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں سو گئیں۔ پیڈسٹل لیمپ کونے میں پڑا جلتا رہا جسے میں نے کوئی دو بجے اٹھ کر بجھایا۔

اگلے روز کی شام بڑی خراب گذری۔

میں سہ پہر کے بعد ہی اپنا نائٹ گاؤن پہنے بستر میں پڑ گئی۔ سر درد کا بہانہ کر کے۔ اس خیال سے کہ اجے ضرور آئے گا اور میں اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ میں سرہانے کا ٹیبل لیمپ جلا کر " فلم فیئر " پڑھتی رہی اور پھر کچھ دیر کو اونگھ بھی گئی۔ رنجنا کے بار بار کہنے پر بھی بستر سے نہیں اٹھی، کپڑے نہیں بدلے۔ بال نہیں سنوارے۔ بس پورا عدم تعاون کیا۔ شام ہوگئی، سُورج ڈھل گیا، ہلکا سا اندھیرا بھی ہوگیا۔ لیکن اجے نہیں آیا۔

" اجے آیا نہیں " رنجنا نے کہا۔

" آئے گا ضرور اور کہے گا کہ بڑی مشکل سے وقت نکال کر آیا ہے ورنہ آدھی رات تک فارغ ہونے کی امید نہ تھی "

" تم تو ویسے ہی بیچارے کے خلاف ہوگئی ہو، حالانکہ وہ تمہاری تعریف کرتا ہے "

" میں بھی تعریف ہی کر رہی ہوں اس کی۔ فرق اتنا ہے کہ میری تعریف حقیقی ہے اور اسکی تصنع سے بھری "

مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ اگر کم بخت نے آنا ہی تھا تو آجائے اور چلا بھی جائے۔ جھنجھٹ ختم ہو۔ میں بستر میں پڑی پڑی تھک گئی تھی۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ اجے نہیں آیا اور میں نے اپنی اچھی بھلی شام کڑواہٹ میں گذار دی۔ جس کا مجھے بے حد افسوس ہوا۔

اگلے دو روز شام کو رنجنا مجھے کچھ واقفکاروں سے ملانے لے گئی جنھوں نے ہمیں چائے پر بُلا رکھا تھا۔ اس لیے دیر سے لوٹتی رہیں۔ گھر پر کوئی ملنے آیا ہو یا کوئی اپنی چِٹ چھوڑ گیا ہو اس کے بارے میں پُوچھ کر ہم بستروں میں دبک جاتیں۔ اجے کی کوئی چِٹ نہیں تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ ملنے نہیں آیا تھا۔

یہ آخری شام تھی۔

دوسرے دن مجھے واپس جانا تھا کیونکہ میری چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ رنجنا اور میں تیار ہو کر

برآمدے میں کھڑی تھیں۔

"چلو تمہیں کافی پلوا لاؤں، اُسی ریستوراں میں"۔ رنجنا نے کہا

"ہاں چلو"

اور ہم دونوں برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گیٹ کی طرف بڑھیں۔ ادھر سے اجے گیٹ کے اندر داخل ہو رہا تھا۔

"مارے گئے"۔ میں نے کہا۔

"اب چارہ بھی کیا ہے"۔ رنجنا بولی۔

اور اتنے میں اجے سگریٹ کا دھواں اڑاتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔

"آپ تو جا رہی ہیں کہیں ؟"

"ذرا کافی پینے جا رہی تھیں"۔ رنجنا نے کہا۔

"میں اُس روز نہ آسکنے کی معافی مانگنے آیا تھا"۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"نہیں کوئی بات نہیں، کہیں کوئی اینگیجمینٹ ہو گئی ہو گی"۔ میں نے طنزاً کہا۔

"نہیں میری ماں بیمار ہو گئی تھیں"۔

"افوہ، رئیلی!" میری کڑواہٹ مٹ گئی۔ ہمدردی سی جاگ اٹھی میرے من میں۔

"جی"

"مجھے اطلاع کیوں نہیں دی ؟" رنجنا نے کہا۔

"آپ کامنا جی کے ساتھ مصروف تھیں، مَیں نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا"۔

مجھے لگا کہ وہ کچھ کچھ معقول آدمی تھا۔

اور ہم نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور واپس لوٹ آئیں۔

"اب کیسی ہے طبیعت ماں جی کی ؟"

"خاصی ٹھیک ہے"۔

رنجنا کافی بنانے لگی اور پیالی میں کافی ڈال کر چمچے سے اسے پھینٹنے لگی۔ خوب جھاگ بنا رہی تھی۔

"آپ کافی بہت اچھی بناتی ہیں"۔

"کامنا سکھا گئی تھی پچھلی بار۔ مَیں تو ابھی تک شاگردی کر رہی ہوں"۔ رنجنا ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔

اجے اٹھ کر جانے لگا۔

"میں بھاگ کر سگریٹ لے آؤں۔"

"سگریٹ میرے پاس ہیں۔" رنجنا بولی

"آپ کے پاس ؟"

"میں نے کچھ پیکٹ منگوائے تھے کامنا کے لیے لیکن یہ تو اب سگریٹ پینا چھوڑ چکی ہے۔"

"آپ سگریٹ پیتی ہیں؟" اجے نے حیرت سے پوچھا۔

"اب نہیں، لندن سے واپس آکر چھوڑ دیا۔"

رنجنا نے سگریٹ کا پیکٹ اجے کے سامنے رکھ دیا۔ اجے نے سگریٹ سلگایا۔ میں نے کافی کی پیالیاں اٹھا کر اسے دیں۔ رنجنا اور میں دونوں اپنی اپنی پیالیاں لے کر کرسیوں میں بیٹھ گئیں۔ مجھے لگا جیسے اس کے بارے میں میرا پہلے والا اندازہ کچھ زیادہ ٹھیک نہیں تھا۔

ہم خاموشی سے کافی پیتے رہے اور باہر سرد ہوا کے جھونکے کھڑکیوں سے ٹکراتے رہے۔ مجھے لندن میں گذاری شامیں یاد آنے لگیں۔ میرے ذہن نے اس ٹھنڈ سے بچنے کے لیے یادوں کے الاؤ سلگا لیے جن کی ہلکی ہلکی گرمی میرے دل اور دماغ میں رچنے لگے۔ مجھے انسانی رشتوں کی نیم گرم آنچ کا احساس ہونے لگا۔ رشتوں کی گرماہٹ کا یہ احساس کبھی کبھی بہت ضروری بن جاتا ہے۔

"لندن میں تو ان دنوں بہت سردی ہوگی ؟"

"جی ہاں جما دینے والی سردی ہوتی ہے ان دنوں۔"

"لندن میں تو آپ کے بہت سے دوست ہوں گے ؟"

"پانچ برس میں دوست تو آخر بن ہی جاتے ہیں۔"

"دوست تو ایک دن میں بھی بن سکتے ہیں"۔ اجے بولا

"نہیں، ایک دن میں آپ کسی کو پسند ضرور کر سکتے ہیں، دوست نہیں بنا سکتے۔ دوست بننے کے لیے تو عمریں گذر جاتی ہیں۔" میں نے جواب دیا تھا۔ اور پھر سوچا تھا کہ میری اس لمبی چوڑی تشریح کی کیا ضرورت تھی۔

اتنے میں نرس اندر آئی۔ اسپتال میں ایک مریض کی حالت بگڑ گئی تھی۔ ڈاکٹر کی ضرورت تھی۔ رنجنا چلی گئی۔ اس کے اصول کے مطابق مریض کی تکلیف کا احساس ڈاکٹر کے لیے سب سے بڑی

سماجی مانگ تھی اور اسے ہر حالت میں پورا کرنا چاہئے تھا۔

"ڈاکٹر رنجنا آپ کی بہت پرانی دوست ہیں نا؟"

"ہم بچپن کی سہیلیاں ہیں۔"

"آپ کو بہت چاہتی ہیں وہ۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"آپ کتنے دِن اور ٹھہریں گی یہاں؟"

"کل واپس جا رہی ہوں۔"

"بس!" اُس نے بڑی حیرت سے کہا اور مجھے لگا جیسے اس کی آنکھوں میں اُداسی کی پرچھائیاں اُبھر آئی ہیں۔

"میری بچی اُداس ہو رہی ہوگی، اسے اپنی ماں کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں۔"

"آپ کے پتی؟"

"وہ ابھی لندن میں ہیں۔"

"تو آپ کیوں واپس آگئیں؟"

"ویسے ہی، وہاں اور زیادہ ٹھہرنے کو دِل نہیں کیا۔"

"آپ کے پتی کب واپس آرہے ہیں؟"

"جب ان کا دل چاہے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ کا بھی تو دوبارہ لندن جانے کا ارادہ بن سکتا ہے؟"

"نہیں میں اب نہیں جاؤں گی۔"

اس نے تپائی پر پڑے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر سُلگا لیا۔

"آپ کا یہ لائٹر بڑا خوبصورت ہے۔"

"شکریہ۔" وہ مُسکرایا

"آپ کہانیاں کیوں لکھتے ہیں، میرا مطلب ہے لیکھک کیوں لکھتے ہیں کچھ؟"

"ہم لوگ صرف اپنی تکمیل کرتے ہیں۔ اپنی اپُورنتا کو بھرنے کا پریتن ہوتا ہے لِکھنا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ لِکھنا صرف ایک تلاش ہے، ایک جُستجو، ایک سفر جو ہم جاری رکھتے ہیں کیونکہ یہ ہماری زندگی کا سوال ہوتا ہے۔"

میرا جی چاہا میں بھی تپائی پر پڑے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگالوں۔ اُس خوبصورت لائیٹر سے جو سامنے پڑا چمک رہا تھا۔ میں نے پیکٹ کو اٹھایا، پل بھر کو دیکھ کر تپائی پر رکھ دیا۔ پھر میں نے لائیٹر اٹھایا اور غیر ارادی طور پر اسے جلا دیا۔ ہلکا سا شعلہ لہرانے لگا۔ میں نے لائیٹر بند کر دیا۔

" جب تک ہماری تکمیل نہیں ہوتی ہم بھٹکتے رہتے ہیں۔ منزلیں چاہے ملیں یا نہ ملیں لیکن بھٹکنا تو بنا ہی رہتا ہے " اس نے پل بھر کو رُک کر یہ الفاظ کہے اور پھر خاموش ہوگیا۔

باہر تیز اور ٹھنڈی ہَوا کے جھونکے کھڑکیوں سے ٹکرا رہے تھے۔

جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ جس قسم کی باتیں اجے کر رہا تھا کچھ اسی قسم کے خیالات مجھے بھی پریشان کیا کرتے تھے۔ کیا میں بھی اپورن تھی ؟ کیا مجھے بھی تکمیل چاہیے تھی ؟ کیا ہری کا میری زندگی میں ہونا میری تکمیل نہیں تھی ؟ چیتنا کی محبت میں میری پورتی نہیں تھی ؟

اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا

" تو آپ جا رہے ہیں ؟ "

" جی، کل آؤں گا، آپ کو سی۔ اوف کرنے۔"

" اس تکلّف کی کیا ضرورت ہے ؟ "

" آپ کو تو نہیں لیکن مجھے شاید ہے۔"

اور یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا۔ بھرپُور نظروں سے۔ اس کی آنکھیں بھی خوبصورت تھیں۔

اور پھر وہ چلا گیا اور میں کمرے میں آکر کونے میں رکھے ہیٹر کے قریب بیٹھی جانے کیا سوچتی رہی۔ غالباً اجے ہی کے بارے میں۔

اگلی صبح وہ آ گیا۔

" میں اپنی تکمیل کرنے آیا ہوں " اُس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میری طرف اپنی کہانیوں کا تازہ مجموعہ بڑھا دیا۔ میں نے کتاب کھول کر دیکھی پہلے صفحے پر لکھا تھا۔

" کامنا کے لیے "

اور نیچے اس کا نام تھا اور تاریخ تھی۔

" بہت بہت شُکریہ " میں نے مُسکراتے ہوئے کتاب کے اوراق الٹنے شروع کر دیئے۔

" اسے پڑھیے شاید کوئی کہانی پسند آجائے۔ اور پھر مجھے اپنی رائے سے بھی مطلع کیجیے۔"

"پڑھوں گی تو ضرور ہی لیکن رائے شاید نہ دے سکوں۔"

"تو اس کے لیے مجھے ہی یاد دہانی کرانی ہوگی۔" اجے نے کہا۔ اس کی آواز میں خلوص تھا اور آنکھوں میں اپنے پن کا جذبہ۔

"آپ کی ماں جی تو اب ٹھیک ہیں نا؟"

"جی ہاں۔"

اور پھر رنجنا مجھے ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے آئی۔ لیکن اجے راستے میں ہی جُدا ہوگیا۔

"میں کسی کو باقاعدہ الوداع نہیں کہہ سکتا، مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"

وہ چلا گیا۔ لیکن اس کا یوں چلے جانا مجھے اچھا نہ لگا۔

"آخر دِکھا گیا نا اپنا سنکی پن۔" میں نے رنجنا سے کہا۔

"اس کے باوجود وہ اچھا آدمی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

جانے کیوں مجھے یہ وہم رہا کہ وہ ریلوے اسٹیشن کے کسی کونے میں کھڑا ہوگا اور مجھے تلاش کر رہا ہوگا۔ لیکن ٹرین چل دی اور وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ رنجنا کا رُومال ہلتا رہا اور گاڑی رفتار پکڑتی گئی آخر میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی اور کسی غیر کے ہاتھوں صاف وشفاف صفحے پر لکھا اپنا نام پڑھنے لگی جس کے ساتھ کوئی اور لفظ نہ تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ کتاب کا ورق نہیں تھا، ایک لق ودق صحرا تھا اور اس میں میرا نام نہیں بلکہ میں خود اکیلی کھڑی تھی اور جانے کس کا انتظار کر رہی تھی۔ جیسے میں ازل سے وہیں کھڑی تھی اور ابد تک وہیں کھڑی رہوں گی۔ کوئی میرا ہاتھ تھامنے نہ آئے گا۔ کوئی مجھے نہ سنبھالے گا۔ اور جانے کیوں مجھے ہری کی یاد شدّت سے آنے لگی۔ چھوٹے موٹے اختلافات کہاں نہیں ہوتے۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ میں اسے لندن میں اکیلا چھوڑ کر چلی آؤں۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اکیلے ہی ہندوستان آکر غلطی کی تھی۔

میں اپنی ڈاک دیکھ رہی تھی پہلا ہی خط ہری کا تھا۔

کانتا! پیار

یہ پہلی کرسمس ہے جو میں نے اکیلی گذاری ہے۔ ورنہ پچھلے برسوں کی ہر کرِسمس میں تم میرے ساتھ تھیں۔ میں کہیں باہر نہیں نکلا۔ کسی کو کرِسمس کارڈ تک نہیں بھیجا۔ کسی کو وِش تک نہیں کیا۔

تم چلی گئیں اور میں تمہیں روک نہ سکا۔ تم رُک جاتیں تو اچھا ہی ہوتا میرا یہاں اکیلے دم گھٹنے لگا ہے۔ یا خود آجاؤ یا مجھے اپنے پاس بُلالو۔

چیتنا تو سیانی ہوگئی ہوگی اب۔ اس کا فوٹو بھیج دو اور اپنا بھی ایک انیلارجمینٹ۔ اُس پوز والا جس میں تم میرا سگریٹ سُلگا رہی ہو۔ نگیٹو تمہارے ہی پاس ہے۔

بے حد پیار کے ساتھ

تمہارا

ہری

میرا دل بھر آیا۔ بہت سی کڑواہٹیں بہ گئیں۔ من صاف ہونے لگا۔ میں نے اُسی وقت اس کا جواب دینے کے لیے پیڈ کھولا۔

پیارے ہری!

بس اِتنا ہی لکھ کر یہ خیال آیا کہ وہ نگیٹو تلاش کرلوں تاکہ کل اس کا انیلارجمنٹ کرانے کے لیے دیدوں۔ خط پھر فرصت میں لکھوں گی۔ ذرا سوچ کر۔ اور میں نے نگیٹو کی تلاش میں سارے ٹرنک خالی کرڈالے اور آخر تھک ہار کر پلنگ پر گر پڑی۔ لگتا تھا نگیٹو کہیں کھو گیا تھا۔ افسوس ہوا۔ سوچا کالج سے واپس آکر دوبارہ تلاش کروں گی اور پھر کچھ لمحے چیتنا کو اپنے ساتھ لگائے اس کے بالوں کو سہلاتی رہی اور پھر سو گئی۔

اگلے روز کالج گئی۔

پیریڈ لے کر آرہی تھی کہ پوسٹ مین برآمدے میں مل گیا۔ میرے لیے ایک ایکسپریس لیٹر تھا۔ لفافہ لے کر کھولا۔ تحریر پہچاننے میں وقت لگا۔ خط اجے کا تھا۔ لکھا تھا۔

کامنا!

یاد کروا رہا ہوں کہ تم نے مجھے کچھ لکھنا تھا۔

اجے

اور مجھے اجے کے الفاظ یاد آگئے۔ جو اس نے سڑک کے موڑ پر کہے تھے۔

"مجھے باقاعدہ الوداع کہتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے۔" اور پھر بنا پلٹ کر دیکھے وہ غائب ہوگیا تھا۔ میں نے اس کی کہانیاں سفر ہی میں پڑھ ڈالی تھیں۔ سوچا تھا فرصت میں بیٹھ کر ان

کے بارے میں لکھوں گی۔ لیکن لکھوں گی رنجنا کو وہی' اُسے میری رائے بتادے گی۔ لیکن ہندوستان آکر رفتار کی اہمیت ختم ہوگئی تھی۔ وہی ڈھل مِل یقین والا حال۔ کام کرنے کو تو جیسے اب من ہی نہ کرتا تھا۔ میں نے رنجنا کو بھی خط نہیں لکھا تھا۔

اس خط نے مجھے اجے کے بارے میں پھر سے سوچنے پر اُکسایا۔ دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی' جس کے ساتھ میں نے سات برس گذارے تھے۔ لیکن پھر بھی دل و دماغ سے اسے پوری طرح اپنا نہ بنا سکی تھی ۹ ایک اپورنتا کا احساس سدا ہی رہا۔ لیکن یہ بات عجیب تھی۔ اُس کے پہلو میں لیٹے ہوئے بھی مجھے کسی کی تلاش رہتی تھی۔ اگرچہ کوئی بھی واضح تصویر میرے سامنے نہیں تھی اور اسی لیے میں ڈر کر اپنا بازو فوراً ہری کی گردن میں ڈال دیتی تھی تاکہ مجھے تحفظ کا احساس رہے۔ اور پھر ایک دن میں اس سے جھگڑا کرکے چلی آئی۔ اور اب وہ مجھے واپس بُلا رہا تھا۔ جیسے ایک بار آکر جانا آسان ہو۔ جیسے جس طرح تم پہلے جی چکے ہو اسی طرح دوبارہ بھی جیا جاسکتا ہو۔ یا مرا ہی جاسکتا ہو۔ اور ادھر اجے ہے جسے پہلی بار ملی ہوں۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ دوست تو ایکدن ہی میں بن سکتا ہے کوئی۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ عمریں گذر جاتی ہیں لیکن تم دوست نہیں بن سکتے۔ البتہ ایکدوسرے کو پسند ضرور کرنے لگتے ہو۔ اجے مجھے اچھا لگتا ہے۔ اس نے مجھسے کوئی مانگ نہیں کی۔ صرف مجھے میرا وعدہ یاد دلایا ہے۔ میں نے پیڈ سامنے کھینچ لیا۔ خالی صفحے پر، اوپر والے حصّے کے عین درمیان "پیارے ہری"! لکھا تھا۔ میں نے اس پر لکیر پھیر دی۔ صفحہ پھاڑ کر ہاتھ سے مروڑ دیا اور پھر فرش پر پھینک دیا۔ دوسرا صفحہ۔ صاف، خالی اور سپاٹ میرے سامنے تھا۔ صفحے کے عین درمیان میرے قلم نے لکھ ڈالا۔

اجے ــــــ!

اور اب ایک نیا ورق میرے سامنے تھا۔ زندگی کی ایک نئی راہ چمک رہی تھی۔ اُفق کی طرف کُھلتا ہوا ایک دریچہ تھا جس میں سے تازہ ہوا آنے لگی تھی۔ میں اُٹھ کر بند کھڑکی کے قریب چلی گئی۔ پٹ کھولے۔ سرد ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ باہر اندھیرا تھا اور سڑکوں پر لگے بجلی کے کھمبوں کے لیمپ اپنی روشنی لُٹا رہے تھے۔ آسمان پر تارے تھے، بڑے پیارے اور نکھرے ہوئے۔ چاند ابھی نہیں نکلا تھا یا نکل کر ڈوب گیا تھا۔ نہیں ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی تھی کہ چاند طلوع ہو کر ڈوب بھی گیا ہو۔ چاند ابھی نکلے گا۔ روشنی ابھی پھیلے گی،

راہیں ابھی جگمگائیں گی۔ میں کھڑکی بند کر کے پھر صوفے میں بیٹھ گئی۔ ٹھنڈ لگنے لگی تھی۔ ہیٹر کا سوئچ اون کیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔

”جب تک ہماری تکمیل نہیں ہوتی ہم بھٹکتے رہتے ہیں۔“

ارے یہ کیا لکھنے لگی تھی پیڈ پر میں ! یہ تو میرے الفاظ نہیں تھے۔ یہ الفاظ تو خود اجے کے تھے جو اس نے کچھ روز پہلے مجھے کہے تھے۔ اس کے الفاظ نہیں لکھنے چاہئیں۔ اپنے پاس لکھنے کو کچھ ہے تو لکھ ورنہ پیڈ بند کر دے۔ میں نے پیڈ بند کر دیا۔ کیونکہ میرے پاس لکھنے کو کچھ نہیں تھا۔ پین پر کیپ چڑھا دی اور کرسی کی پُشت سے پیٹھ ٹیک کر اور آنکھیں بند کر کے اُدھ لیٹی سی ہو گئی۔ کہیں کوئی مجھ سے پُوچھ رہا تھا، جانے کہاں سے ؟ دل کے کسی کونے سے، روح کی کسی گہرائی سے پُوچھ رہا تھا کہ ان دو خطوں میں سے پہلے کس کا جواب دوں ؟

اسی پل بند آنکھوں ہی سے مجھے احساس ہوا کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھُلا تھا۔ شاید ماں اندر آئی تھی، یہ دیکھنے کو کہ میں کیا کر رہی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں اور زور سے بند کر لیں۔ مجھے لگا کہ چینتا کرسی کے ساتھ کھڑی تھی۔ اور اس کا ننھا سا نرم ہاتھ میرے کندھے پر ٹِکا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور میری آنکھوں کے کونوں میں آنسو اُبھر آئے۔

ہارے ہوئے آدمی

کال بیل کی آواز پر جب میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک خوبصورت لڑکی جس کی عُمر کوئی پچیس برس کے قریب ہوگی کھڑی تھی۔ اُس نے بڑے ہی اعتماد بھرے انداز سے نمستے کی۔
"کسے ملنا ہے آپ کو؟"
"آپ ہی سے۔"
"اندر آجائیے۔"
"یہیں ٹھیک ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں رمیش کی بیوی ہوں۔" اُس نے دروازے کے باہر کھڑے کھڑے کہا۔
"کون رمیش؟"
"جو میرا خاوند ہے۔"
"یہ تو میں سمجھ گیا لیکن یہ ہے کون شخص" میں نے پوچھا۔
"وہ جو سامنے کے کوارٹروں میں کپڑے پریس کرتا ہے۔" اس نے پہلے سے زیادہ اعتماد کے ساتھ میری طرف دیکھا۔
"مگر آپ رہتی کہاں ہیں؟ میں نے اس سے پہلے کبھی آپ کو نہیں دیکھا۔"
"اس سے پہلے تو شاید میرے خاوند نے کبھی مجھے نہیں دیکھا۔ وہ آج شام کو میرے ساتھ دہلی جا رہا ہے اور پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔"
"مگر کیوں؟"
"اس لیے کہ وہ میرا خاوند ہے اور مجھے اس کی ضرورت ہے۔"

"تو میں کیا کر سکتا ہوں اس میں۔"

"اس کا حساب کر دیں میں سبھی کوٹھیوں سے اس کا اکاؤنٹ صاف کر رہی ہوں۔ کیونکہ وہ خود نہیں آنا چاہتا تھا۔ وہ ایک دم بھوندو ہے۔"

"تو آپ ماں جی سے مل لیجئے ان کو پریس والے کا حساب معلوم ہوگا۔"

"شاید آپ کو معلوم نہیں میرا خاوند پریس والا نہیں، چنڈی گڑھ میں ایک بڑے دفتر میں اسسٹنٹ ہے۔ اچھا میں ماں جی سے مل لیتی ہوں۔" وہ مسکرائی اور پھر اپنی ساڑھی کے پلو کو سنبھالتی ہوئی کوٹھی کے پچھواڑے میں چلی گئی جہاں ماں دھوپ میں بیٹھی میری قمیضوں میں بٹن ٹانک رہی تھی۔

میں اندر کمرے میں آگیا اور پلنگ پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا۔ اس فتنہ گر عورت کے بارے میں اور اس کے خاوند کے متعلق بھی۔

رمیش پچھلے چار برس سے سامنے کے چھوٹے ٹائپ کے کوارٹروں کے ایک کوارٹر کے برآمدے میں لکڑی کی چھوٹی میز بچھائے دن بھر ارد گرد کی کوٹھیوں اور کوارٹروں سے اکٹھے کئے ہوئے کپڑے پریس کرتا رہتا تھا۔ اسے اس برآمدے کے استعمال کے لیے کوارٹر میں رہنے والے ایک ہیڈ کلرک کے دس افراد پر مشتمل کنبے کے کپڑے پریس کرنے ہوتے تھے۔ اور اس کی ایک بڑی ہی پیاری سی لڑکی کو سائیکل پر بٹھا کر صبح اسکول چھوڑنے جانا ہوتا تھا۔ واپس وہ بس سے آجایا کرتی تھی۔ رمیش کے بارے میں مجھے کبھی کبھار ماں سے بات کرتے ہوئے جو واقفیت حاصل ہوئی وہ یہ تھی کہ رمیش پٹیالہ کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ جہاں اس کی بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن رہتی تھی۔ اس کا باپ مر چکا تھا۔ اور گاؤں کے کچے مکان اور زمین کے چھوٹے سے زرخیز ٹکڑے کے لیے اپنے چاچا سے اس کا مقدمہ چل رہا تھا۔ دن رات پریس کی میز کے سامنے کھڑے رہ کر اور گرم کوئلوں کی تپش سے جل کر جتنی رقم وہ بچا سکتا تھا اپنے مختصر سے کنبے اور مقدمے پر خرچ کرتا تھا۔ رمیش نہایت ہی کم گو تھا اور ہمیشہ ہی بڑے ادب سے پیش آتا تھا۔ کہیں راستے میں اس سے ملاقات ہو جاتی تو وہ سائیکل سے اتر جاتا اور بڑی مخلص مسکراہٹ سے سلام کرتا۔ اس سے زیادہ مجھے اس کے بارے میں واقفیت نہیں تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کی اتنی خوبصورت بیوی تھی اور وہ دہلی میں رہتی تھی۔ میں نے پچھلے چار برسوں میں پہلی بار اسے دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے پلنگ پر پڑے پڑے ہی کھڑکی سے دیکھا وہ کافرہ بڑے اعتماد بھرے قدموں سے پچھواڑے سے نکل کر گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی اور پھر وہ چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں باہر گیا۔ ماں اب بھی میری قمیضوں میں بٹن ٹانک رہی تھی۔

"کب تک بٹن ٹانکتی رہو گی میری قمیضوں میں؟"

"جب تک یہ ٹوٹتے رہیں گے۔"

"کب تک ٹوٹتے رہیں گے یہ بٹن؟"

"جب تک تم اپنی چیزوں کی سنبھال نہیں کرو گے۔"

"اور میں کب تک سنبھال نہیں کروں گا؟"

"جب تک تمہیں عقل نہیں آئے گی۔"

"یہ ہوئی نہ بات۔" میں نے کہا اور پھر میری ماں مسکرا دی۔ میری ماں کی مسکراہٹ بڑی روشن اور پوتر اور پیاری ہے۔ میری ماں جوانی کے دنوں میں بڑی خوبصورت تھی۔ میں نے اُس کی تصویر کا ایک اینلارجمینٹ اپنے سونے والے کمرے میں لگا رکھا ہے۔ میری بات سن کر ماں نے عینک اتار دی اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"وہ کپڑے پریس کرنے والا رمیش چنڈی گڑھ چھوڑ کر جا رہا ہے۔"

"اچھا ہوا کم بخت قمیضوں کے بٹن بہت توڑتا تھا۔"

ماں نے میرے جواب کی طرف توجہ نہیں دی بولی۔

"اس کی گھر والی حساب کرنے آئی تھی اب اُسے دہلی لے جا رہی ہے۔ وہاں وہ کسی اسپتال میں نرس ہے۔ اس کے باپ اور بھائی کا اپنا کاروبار ہے۔ بیچ میں اُن کا آپس میں کوئی جھگڑا ہو گیا تھا۔ لیکن اب صلح ہو گئی ہے۔ وہ اسے منانے آئی تھی اب وہیں اسے نوکر کروا دیگی۔"

ماں کتنی جذباتی ہو رہی تھی یہ سب کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بڑا بُرا لگ رہا ہے رمیش کا جانا' بہت اچھا لڑکا تھا۔"

پھر اس نے اپنی سفید ساڑھی کے آنچل سے اپنی نم ناک آنکھیں سُکھا ڈالیں۔

"تمہیں معلوم تھا کہ رمیش شادی شدہ ہے؟"

"اُس نے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ وہ تو جب کبھی بات کرتا اپنی بوڑھی ماں اور جوان بہن' اور زمین کے مقدمے ہی کی بات کرتا۔ اپنی گھر والی کی بات تو اس نے کبھی کی ہی نہیں۔"

"کوئی گھپلے بازی ہوگی ؟"

"بھگوان جانے۔"

"جو باتیں انسان جانتا ہے وہ بھگوان بھی نہیں جانتا۔ وہ بیچارہ تو بڑے شریف اور بھلے آدمی کی طرح آنکھ نیچی کیے پڑا رہتا ہے۔"

"بھگوان سے نہ جانے تمہیں کیوں اتنی چڑ ہے۔"

"مجھے سبھی بھلے لوگوں سے چڑ ہے۔ انہی کے کارن تو اتنی خوبصورت عورتوں کے خاوند رات دن دوسروں کے کپڑے پریس کرتے ہیں۔"

"اچھا بابا میں ہاری۔ جب اُس نے کبھی مجھ سے اپنی گھر والی کی بات نہیں کی تو میں کیا کروں۔"

"تم اپنی عینک مجھے دو کہ اندر رکھ دوں اور تھوڑی دیر آرام کر لو۔"

میں ماں کی عینک اور ڈھیر ساری قمیضیں جو چارپائی پر پڑی تھیں اُٹھا کر اندر لے گیا اور ماں کو تکیہ دے کر اُسے لٹا دیا۔ اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس نے آرام کیا یا یوں ہی پڑی رہی۔ رمیش کی کافرادا بیوی واقعی اسے ساتھ لے گئی کیونکہ اس کے بعد وہ نظر نہیں آیا۔

دو دن کے بعد ہیڈ کلرک کے کوارٹر کے باہر اُس میز پر اور اُسی پریس سے جس سے رمیش پریس کیا کرتا تھا ایک اور آدمی نے کپڑے پریس کرنے شروع کر دیئے۔ لیکن میں نے ہیڈ کلرک کی اس پیاری سی لڑکی کو اس نئے پریس کرنے والے کے ساتھ اسکول جاتے ہوئے نہیں دیکھا اب شاید وہ بس ہی سے اسکول جاتی تھی۔

یہ نیا آدمی جسے رمیش اپنا سامان بیچ گیا تھا۔ یوپی کے ضلع بستی کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اور ٹھیٹھ پوربی زبان بولتا تھا۔ وہ کئی سال تک بمبئی کے ماہم ایریا میں کپڑے پریس کرتا رہا تھا۔ لیکن وہاں اس کا کسی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ اور اس نے اسے جان سے مار دینے کی دھمکی دی تھی اور وہ بے چارہ اس دھمکی سے ڈر کر بمبئی چھوڑ آیا تھا۔ اس کا نام ماتا دین تھا اور وہ بمبئی چھوڑنے کے بعد چھ سات مہینے اِدھر اُدھر دھکے کھاتا رہا تھا۔ اور اب پچھلے ایک مہینے سے چنڈی گڑھ آگیا تھا یہاں اُس کے گاؤں سے نزدیک ایک گاؤں کے کچھ آدمی رکشا چلاتے تھے۔ آیا تو تھا وہ رکشا چلانے لیکن اسے یہ کام پسند نہیں آیا اور پھر اس کی ملاقات اچانک رمیش سے ہو گئی جو اپنا سامان اُسی دن بیچ کر دہلی چلا جانا چاہتا تھا۔ ماتا دین کے پاس رقم نہیں تھی۔ وہ رقم اُس کے

دوستوں نے آپس میں اکٹھی کر کے اُسے دے دی اور ماتا دین رمیش کے اس اڈے کا مالک بن گیا، جہاں وہ چار سال تک مردوں، عورتوں اور لڑکیوں کے کپڑے پریس کرتا رہا تھا اور اُس نے کبھی کسی کپڑے کو زیادہ سینک نہیں لگنے دیا تھا۔

کچھ روز تو ماں رمیش کو یاد کرتی رہی لیکن پھر ماتا دین نے اپنے پُوربی لہجے اور دھرم کرم کی باتیں کر کے ماں کو اپنا سپورٹر بنا لیا اور دیکھا دیکھی سب گھروں نے ماتا دین ہی کو کپڑے پریس کرنے کے لیے دینے شروع کر دیئے اور اب ماتا دین اپنے ہاتھوں پر پریس کئے ہوئے کپڑے پھیلائے گھر گھر بانٹتا پھرتا اور جب موقع ملتا اپنی ہتھیلی پر تھوڑا سا چونا اور زردہ تمبا کو مسلتا اور پھر اسے پھانک جاتا۔ یہ سلسلہ کوئی دو ماہ تک چلتا رہا۔

اور پھر ایک دن میں جب دفتر جانے کے لیے تیار ہو کر برآمدے میں آیا تو رمیش کھڑا تھا۔

"ارے تم"!

"نمستے"

"کہو کب آئے"؟

"کل شام آیا تھا"

"مزے میں ہو"

میرے اس سوال پر وہ پھپک کر رو پڑا۔

"ارے کیا ہوا بھائی"؟

"کچھ نہیں"

"ماں رمیش آیا ہے، اِسے چائے وائے پلاؤ۔ میں دفتر جا رہا ہوں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے"

میں دفتر چلا گیا اور دن بھر اتنا مصروف رہا کہ یہ بھی بھول گیا کہ میں صبح رمیش سے مِلا تھا اور وہ میرے ایک سیدھے سادے سوال پر رو پڑا تھا۔

اُس شام میرے کچھ ملنے والے آ گئے اور میں انھیں میں اُلجھا رہا۔ کہیں رات کو جا کر جب میں سونے سے پہلے حسب معمول کتاب لیے بستر پر لیٹا تھا تو ماں آ کر میری پائنتی پر بیٹھ گئی۔

"رمیش کے ساتھ تو بہت ظلم ہوا بیٹا"

میں نے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے کروٹ لی "کیا ہوا رمیش کو"؟

"اس کی بیوی بڑی مکار اور آوارہ قسم کی عورت ہے۔ وہ پتہ نہیں کہاں کہاں جھک

مارتی رہی اور اپنے ماں باپ سے یہ کہتی رہی کہ وہ ہر مہینے رمیش کو ملنے چنڈی گڑھ آتی تھی اور گھر کے لوگ اس پر اعتبار کرتے رہے۔"

"میں نے کہا تھا ناکہ اس میں گھپلا بازی ہے۔"

" اور جب اس کے ہاں لڑکا ہوا تو وہ رمیش ہی کا لڑکا بتایا گیا۔"

" حالانکہ اسے کچھ بھی معلوم نہیں"

" وہ تو کہتا ہے کہ میں نے پچھلے دو سال سے اپنی بیوی کی شکل بھی نہیں دیکھی۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

" لڑکے کے نام کرن سنسکار کی رسم تھی۔ گھر والوں نے رمیش کو بُلانے کے لیے کہا تو اس کی بیوی نے جواب دیا کہ وہ چنڈی گڑھ میں جاکر اسے ساتھ لے آئے گی ورنہ وہ نہیں آئے گا۔"

"کیوں؟" میں ہمہ تن گوش تھا۔

" اس چالاک عورت نے جانے کس طرح سے جال پھیلایا کہ رمیش بیچارہ اس میں پھنس گیا اور اپنا سب کچھ بیچ باچ کر اس کے ساتھ دہلی چلا گیا۔ وہاں جاکر اسے صحیح حالات معلوم ہوئے تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ وہاں اس کی بیوی اور اس کے گھر والوں نے سب سے یہی کہہ رکھا تھا کہ رمیش چنڈی گڑھ میں کسی دفتر میں اسسٹنٹ تھا اور مشکل سے ایک دن کے لیے آیا تھا۔"

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک سگریٹ سُلگایا اور پھر ماں کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کہہ رہی تھی "جب رمیش نے لڑکے کا باپ ہونے سے انکار کیا اور بتایا کہ اس کی بیوی آج تک ایک بار بھی اس سے ملنے چنڈی گڑھ نہیں آئی تھی تو اس کے دونوں ہٹے کٹے سالوں نے اس کی مشکیں کس دیں اور اسے خوب پیٹا اور اس سے کہا اگر اس نے یہ بات کسی سے کہی اور لڑکے کے نام کرن سنسکار کی رسم میں کوئی اڑچن ڈالی تو وہ اُسے جان سے مار ڈالیں گے۔"

" اور پھر لڑکے کا نام رکھ دیا گیا اور یہ ثابت کر دیا گیا کہ رمیش اس کا باپ تھا۔ کیونکہ اس کی جان خطرہ میں تھی اور وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔" میں نے ٹوکا۔

" یہ سب میں نہیں جانتی۔" ماں نے کہا۔

" لیکن میں جانتا ہوں اس حرام زادی کو اپنے ناجائز بچے کے لیے باپ کی ضرورت تھی اور رمیش کو اپنی جان پیاری تھی۔ یہ ایک طرح کی سودا بازی تھی اس نے اپنے حرامی بچے کے لیے باپ حاصل کر لیا اور رمیش نے اپنی جان بچالی اور اپنی جان کو بچاتا ہوا دہلی سے بھاگا اور یہاں

پہونچ گیا۔ سودا کامیاب رہا۔" میں نے غصہ سے کہا۔ اور سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔
" کتنے نر لج لوگ ہیں دُنیا میں" ماں بولی۔
" لیکن سماج کا سارا ڈھانچہ انہی کے ہاتھوں میں ہے۔ ان کی وجہ سے جانے کتنے بچے کن کن آنگنوں میں کھیل رہے ہیں۔ اور کتنی مائیں اپنے سینوں میں حقیقی باپوں کے نام کی چتائیں سُلگائے خاموش جل رہی ہیں۔"
"رمیش یہیں رہنا چاہتا ہے اس کی مدد کرو بیٹا۔"
یہاں سے تو وہ اپنا اڈہ اٹھا چکا ہے۔ اُجڑا ہوا اڈہ۔ کبھی دوبارہ بسا بھی ہے۔ یہ ماتا دین بھی شاید اسی طرح اڈہ اکھاڑ کر آیا ہے۔ کون جان سکتا ہے کسی کے بارے میں۔"
" لیکن اس کے لیے کچھ تو کرو۔"
" وہ تو ایک دفتر میں اسسٹنٹ ہے ہی اور کیا چاہیئے اُسے؟"
" یہ سب تو جھوٹ ہے۔ اس کی بیوی نے ویسے ہی بات پھیلا رکھی تھی۔"
" تو سچ کیا ہے؟"
" مجھے معلوم نہیں۔ یہ سچ جھوٹ کا چکر، تمہیں چلائے پھرتے ہو" ماں بولی۔
" سچ یہ ہے کہ رمیش ایک حرامی بچے کا قانونی طور پر باپ ہے اور اسکول کے رجسٹر میں اسی کا نام بطور باپ لکھا جائے گا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ اس کی بیوی اور اس کے گھر والے سبھی اس سازش میں شریک ہیں۔"
" لیکن اس میں بے چارے رمیش کا کیا قصور ہے۔"
" اس کا قصور یہ ہے کہ وہ ایک شریف، ایمان دار اور غیور انسان ہے اور شرافت ایمان داری اور غیرت سے زندہ رہنا چاہتا ہے۔"
ماں نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پائنتی سے اٹھی اور چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ یہی تو ایک سوال ہے جو پھانسی کی ڈوری کا پھندہ بن کر جانے کتنے ہی لوگوں کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ اور اس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔
اس سوال کا جواب کوئی بھی نہیں دے سکتا۔
جن کے پاس اس سوال کا جواب ہے ان کی زبانیں گُنگ ہیں۔ جب تک ان کی زبان کُھلے گی یہ سوال ایک بوڑھے برگد کے پیڑ کی طرح بے ترتیبی سے پھیل چکا ہوگا اور اس کی

جڑوں سے ہزاروں سوال کونپلیں بن کر پھوٹتے رہیں گے اور دھرتی کا رس چوستے رہیں گے۔
یہی بات سوچتے سوچتے میں دیر تک جاگتا رہا اور جب سویا تو بجلی بھی نہ بجھا سکا۔
جانے رات کے کس پہر میں ماں نے سوئچ آف کیا ہوگا۔
اگلی شام دفتر سے واپس آکر باہر لان میں ماں کے ساتھ چائے پی رہا تھا کہ رمیش اور ماتا دین دونوں آ گئے۔ ان دونوں نے مجھے اور ماں کو نمستے کی اور ہمارے قریب ہی لان پر بیٹھ گئے۔
"کہو کیسے ہو رمیش؟"
"آپ کی مہربانی ہے سر" وہ اپنی گفتگو میں 'سر' کا اکثر استعمال کیا کرتا تھا۔
"اور تم ماتا دین"
"آپ کی مہربانی ہے جناب"
"تمہارا کام جم گیا ہوگا اب تو؟" میں نے پوچھا۔
ماں اتنی دیر میں اٹھ کر دونوں کے لیے چائے بنا لائی تھی۔ دونوں نے اپنے اپنے گلاس گھاس پر جما دیئے تھے۔
"میرا کام تو جم گیا صاحب لیکن رمیش کا بگڑ گیا۔"
"کیسے؟"
"اس نے اپنا اڈّا بیچ دیا۔"
"اور تم نے خرید لیا۔"
"جی صاحب۔"
"یہی میں بھی اس کو کہہ رہا ہوں" رمیش اتنی دیر کے بعد اب بولا تھا۔
"کیوں ماتا دین؟"
"یہ اب کیسے ہو سکتا ہے صاحب؟"
"ہو کیوں نہیں سکتا؟ اب تمہاری جگہ رمیش کپڑے پریس کرے گا اور اپنی اجرت لے گا۔"
رمیش نے بڑی عقیدت مندانہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔
"ارے تم لوگ چائے پیو" ماں نے دونوں کو مخاطب کیا۔

دونوں نے اپنے اپنے گلاس ہونٹوں سے لگائیے۔

"رمیش کی گھروالی آوارہ ہے اور میری گھروالی کو میرا بھائی بھگا لے گیا ہے۔ ہم دونوں کا جھگڑا ایک سا ہے۔" ماتا دین نے کہا۔

"تو پھر کیا سوچا ہے تم لوگوں نے اڈے کے بارے میں؟" میں نے سوال کیا۔

"اسی کے لیے تو میں ماتا دین کو آپ کے پاس لے کر آیا ہوں۔ آپ اِسے سمجھائیں" رمیش نے بڑی عاجزی سے مجھے مخاطب کیا۔

"بھائی یہ تمہارا آپسی معاملہ ہے میں اس میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"لیکن سر آپ ہمیں کوئی راستہ تو سُجھا سکتے ہیں۔" رمیش نے کہا۔

"آپ جو فیصلہ کریں گے ہم دونوں کو منظور ہوگا۔" ماتا دین نے تائید میں کہا۔

"اگر میں یہ کہوں کہ تم دونوں یہ اڈہ چھوڑ دو اور چنڈی گڑھ سے بھاگ جاؤ۔"

ہم تو صاحب چلے جائیں گے لیکن آپ کو جو صبح شام اپنی پتلونوں کی کریزیں اور قمیضوں کے کالر ٹھیک کرانے ہوتے ہیں وہ کون کرے گا؟" ماتا دین نے سوال کیا۔

"یہ خود کرلیا کریں گے" ماں نے مُسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"تو پھر کیا کیا جائے۔ صبح شام تو کالر اور کریزیں مجھ سے کبھی درست نہیں ہوں گی۔ لیکن رمیش تو ٹھیک آدمی نہیں ہے۔ یہ قمیضوں کے بٹن بہت توڑتا ہے۔"

"اور یہ صاحب"

"تم میرے پاجامے ہمیشہ ہی غلط پریس کرتے ہو۔"

میں نے سگریٹ سُلگایا اور دونوں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ رمیش اور ماتا دین دونوں دو ہارے ہوئے آدمیوں کی طرح میری طرف پُر امید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"تو پھر یہ بیچارے کریں کیا؟" ماں نے ان کی طرفداری کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا ایک حل ہوسکتا ہے۔ آئندہ سے قمیضیں تو ماتا دین پریس کیا کرے اور پاجامے رمیش۔

"اسی اڈے پر؟" ماں بولی۔

"اسی پریس سے اور اسی میز پر لیکن مختلف اوقات پر۔ ایک پریس کرے گا تو دوسرا کوٹھیوں سے کپڑے اکٹھے کرے گا، ایک پریس کئے ہوئے کپڑے تقسیم کرے گا تو دوسرا

رقم اکٹھی کرے گا اور پھر آدھی آدھی رقم آپس میں بانٹ لیں گے۔"

"یہ آپ نے ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔" رمیش نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میں یہاں سے اب کہیں نہیں جانا چاہتا۔"

"ہم دونوں اکیلے ہیں۔ جتنا کمائیں گے اسی میں گزارہ کریں گے۔ نہ اب مجھے کچھ اپنے گھر بھیجنا ہے نہ رمیش کو۔" ماتا دین نے جواب دیا۔

"لیکن رمیش کی ماں اور بہن بھی تو گاؤں میں رہتی ہیں اور اس کی زمین کا بھی تو جھگڑا چل رہا ہے۔" ماں نے انٹرویو کیا۔

رمیش نے سوال بھرے انداز میں ماتا دین کی طرف دیکھا۔

"ہم دونوں کے گزارے کے بعد جو کچھ بچے گا وہ ہم ہر مہینے رمیش کی ماں کو بھیج دیا کریں گے۔" ماتا دین بولا

"اور وہ مقدمہ؟"

"اب اُسے وکیل کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کچہری میں اب میں وکالت کیا کروں گا اس کی۔"

ماتا دین کا جواب سُن کر میں زور سے ہنسا، میری ہنسی میں ماں کی ہنسی بھی شامل ہو گئی۔ اور دونوں ہارے ہوئے آدمیوں کے ہونٹوں پر ایک معصوم اور بے لوث مسکراہٹ پھیل گئی۔

دِل کے دروازے مضبوط نہیں

آڑو کا یہ پیڑ چار برس میں کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ اس کا تنا بھی پہلے سے موٹا ہو گیا ہے۔ کئی نئی شاخیں بھی پھوٹ آئی ہیں۔ پھل تو اس میں بہت ہی کم لگتا ہے جو لگتا ہے وہ بھی پکنے سے پہلے گر جاتا ہے یا پرندے کچے پھلوں کو ہی ٹھونگیں مار مار کر خراب کر ڈالتے ہیں۔ لیکن ہر سال جاڑے کے شروع میں اس کی شاخیں پھولوں سے لد جاتی ہیں۔ سفید سفید پھول جس میں ہلکے گلابی ڈورے پھیلے ہوتے ہیں بڑے خوبصورت لگتے ہیں۔ ہمارے لان کے ایک کونے میں لگا ہوا یہ پیڑ میرے لیے ایک خاص جاذبیت رکھتا ہے۔ بہار کے دنوں میں تو یہ ایک دلہن کی طرح سجا ہوتا ہے اور ذرا سے گدگدانے پر اس کے پھول لرزنے لگتے ہیں اور سفید پنکھڑیاں ٹوٹ کر برف کے گالوں کی طرح دھرتی پر گرنے لگتی ہیں، لیکن یہ بہار کی بات ہے۔ اب تو دسمبر کے آخری دن ہیں اور اس کے پتے پیلے ہو گئے ہیں اور ہر لمحہ شاخوں سے ٹوٹ کر نیچے گھاس پر گرتے رہتے ہیں۔ آج کرسمس ایو ہے اور سورج ڈھل رہا ہے اور اس کی آخری کرنیں آڑو کے پیلے پتوں سے کھیل رہی ہیں۔ پتے اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ کرنوں کا بوجھ بھی برداشت نہیں کر سکتے اور ایک ایک کر کے نیچے گر رہے ہیں۔ میں آرام سے کرسی پر بیٹھی اپنے پاؤں پیڑ کے تنے پر جمائے کچھ سوچ رہی ہوں۔ میری جھولی میں ادھ کھلی کتاب پڑی ہے اور میں شاخوں سے ٹوٹتے ہوئے ان پتوں کو دیکھ رہی ہوں۔ کچھ ایک میرے شانوں، بالوں اور ٹانگوں پر بھی گرے ہیں۔

مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میرے دل کے دروازوں پر کوئی دھیرے دھیرے دستک دے رہا ہے، اس اُمید پر کہ یہ دروازے کھل جائیں گے۔ شاید وہ نہیں جانتا کہ میں نے پچھلے چار سالوں میں ہر شام اپنے دل کے دروازوں میں ایک آہنی کیل گاڑی ہے اور رات

کے سناٹے میں اس پر ہتھوڑے لگائے ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی کیل ٹیڑھی بھی ہو گئی ہو اور اب میرے دروازوں میں ہزار سے اوپر کیلیں گڑی ہیں، اب یہ دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے ہیں۔ کوئی لاکھ دستک دیتا رہے یہ کبھی نہیں کھل سکتے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی ٹیڑھی ہوئی کیل سے دستک دینے والے کے ہاتھ زخمی ہو جائیں اور خون بہہ نکلے' اور یہ خزاں رسیدہ پتے بند دروازوں سے ٹکرا کر میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اور کوئی نہ بھی جانتا ہو لیکن یہ زرد پتے جو شاخوں سے ٹوٹ کر میرے ارد گرد گر رہے ہیں' جانتے ہیں کہ میرے دل کے دروازے ٹوٹ تو سکتے ہیں لیکن کھل نہیں سکتے۔

آج کرسمس ایو ہے۔

کمروں اور برآمدوں میں رنگ برنگے' بیلون لٹک رہے ہیں۔ رنگ دار کاغذوں کی پھول دار جھالریں جھول رہی ہیں' ڈرائنگ روم کے پردے بدلے گئے ہیں۔ صوفوں پر سفید دُھلے ہوئے غلاف چڑھا دیئے گئے ہیں' ڈائننگ روم میں کینڈل سٹینڈز پر بڑی بڑی شفاف موم بتیاں لگا دی گئی ہیں۔ کھانا کینڈل لائٹ میں ہو گا۔ خالی گلاس ٹرے میں رکھے چمک رہے ہیں اور وسکی بوتلوں میں بند انگڑائیاں لے رہی ہے۔ دن ڈھلے ہی ڈیڈی اور ممی کے دوست آ جائیں گے۔ آدھی رات تک ہنگامہ رہے گا۔ لیکن میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اسی پیڑ کے نیچے بیٹھی رہوں اور زرد پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر مجھ پر گرتے رہیں میں رات کی اوس میں بھٹکتی رہوں اور ماضی کے ہتھوڑے سے حسرتوں کے کیل اپنے دل کے دروازوں پر گاڑتی رہوں اور کراہتی رہوں اور پھر رات کے پچھلے پہر ایک صلیب تیار کروں اور اسے اپنے کندھے پر اٹھائے گرتی پڑتی کانٹے بھرے راستے پر چل پڑوں اور اپنے جسم پر شکستوں کے کوڑے کھاتی اپنی صلیب کو سنبھالے ڈگ بھرتی چلوں اور پھر ایک اونچی جگہ پر خود ہی اس صلیب کو زمین میں گاڑ دوں اور اس کے ساتھ لگ جاؤں اور کوئی بہت بڑے بڑے کیل میری ہتھیلیوں' سر اور پاؤں میں ٹھونک کر مجھے اس صلیب پر لٹکا دے اور میرے جسم سے بہتا ہوا خون روشنی کا الاؤ بن کر دہک اٹھے اور مشرق کی پہاڑیوں کے اوپر سے نمودار ہو جائے اور میری آنکھیں ہمیشہ کے لیے روشنی کے احساس سے محروم ہو جائیں۔

لیکن میں جانتی ہوں کہ ایسا نہیں ہو گا۔

میں نے ہر برس ایسا سوچا ہے۔

ہر برس اپنے لیے ایک صلیب تیار کی ہے اور اسے اپنے کندھوں پر اٹھایا ہے اور اس سے لٹکی ہوں لیکن روشنی کا احساس مٹنے کے بجائے اور بھی شدید ہوا ہے۔

اس برس بھی یہی ہوگا۔

آڑو کے اس پیڑ نے مجھے بھی دلہن کے روپ میں دیکھا ہے۔ ٹھیک ان ہی دنوں جب اس پر ٹوٹ کر بہار آئی تھی اور وہ خود ایک دلہن بن کر سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ لان کے چاروں طرف بجلی کے بلب روشن تھے۔ اور بجلی کی اس تیز روشنی میں یہ پیڑ کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔ بارات آنے میں ابھی دیر تھی۔ میں سجی سجائی کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ وہ شام سے ہی کہیں غائب تھا' بارات کے انتظام میں لگ رہا تھا۔ کئی دفعہ پوچھا لیکن اس کا کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ ایک بار آیا تھا' میرا پیغام بھی اسے مل گیا تھا۔ دو منٹ میں آنے کو کہہ کر پھر جانے کہاں کھو گیا تھا اور اب تک نہیں آیا تھا۔ میں ایک کونے میں بیٹھی سہیلیوں اور رشتہ دار لڑکیوں سے گھری سوچ رہی تھی کہ وہ ایک دم اس قدر بے نیاز کیوں ہو گیا تھا۔ اتنی بھی مصروفیت کیا' درجنوں کام کرنے والے تھے' اس سے زیادہ ذمہ دار قسم کے لوگ۔ اُسے ہی ایسا کیا کام تھا کہ لمحہ بھر کو کمرے کے اندر جھانک بھی نہ سکتا تھا۔

اور اسی لمحہ وہ داخل ہوا۔

"معاف کرنا نشی' مجھے آنے میں دیر ہو گئی' کیا بات ہے؟" وہ گھٹنوں کے بل میرے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے بال کیسے روکھے تھے اور آنکھیں کتنی گہری تھیں۔

"میرا ایک کام کرو گے۔"

"کہو۔"

"ذرا نزدیک ہو جاؤ۔"

اور اس نے اپنا چہرہ میرے بالکل قریب کر دیا اور میرا ریشمی دوپٹہ اس کے گال سے مس ہونے لگا اور میرے ہونٹ اس کے کان کی لوؤں کو چھونے لگے۔

"مجھے آڑو کے پیڑ تک لے چلو' پچھلے دروازے سے۔"

"پاگل ہو تم تو' اٹھو۔" وہ ہنسا اور پھر اس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے اٹھایا اور میری کلائیوں میں پڑی سُرخ سُرخ چوڑیاں اور سفید سفید کوڑیوں کا سُرخ دھاگے سے بندھا کلیرا اور چاندی کی چھوٹی چھوٹی کٹوریاں بج اٹھیں اور میرے مہندی رچے پاؤں سے لپٹی پائلوں

کا سنگیت گونج اُٹھا۔ میں ان کھنکتی ہوئی پائلوں کی آواز ساتھ لیے اس کا بازو پکڑے کوٹھی کے پچھلے دروازے سے نکل کر آڑو کے پیڑ کے پاس پہنچ گئی۔ اس کے سفید سفید پھولوں نے جیسے ایک بار قہقہے لگا کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ میرا ہاتھ ابھی تک اس کے بازو پر ٹکا ہوا تھا۔ پیڑ کے نیچے پہنچ کر اس نے تنے کو زور سے ہلایا اور سینکڑوں پھول مجھ پر برس پڑے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل اُٹھی۔

"بس زندگی بھر ایسے ہی مسکراتے رہنا۔" اس نے کہا۔

پھر میں نے اپنی مہندی رنگی انگلیوں سے پیڑ کے تنے کو سہلایا اور اسے نمسکار کر کے واپس ہو لی۔

"دیکھو میرے ساتھ رہنا، ایسا نہ ہو کہ پھر کہیں غائب ہو جاؤ اور میں ڈھونڈتی پھروں۔"

"تم سچ مچ پاگل ہو۔" اُس نے جواب دیا۔

اور پھر باجے کا شور ہوا اور بارات گیٹ پر آ گئی۔ اس نے مجھے چھوڑا نہیں تھا وہ میرے ساتھ تھا، جب جے مالا ڈالنے کو میرے ہاتھ اُٹھے وہ جب بھی میرے ساتھ تھا، جب شادی کی بے مطلب سی رسمیں ادا ہو رہی تھیں وہ جب بھی میرے ساتھ تھا۔ اور جب کنیا دان کا سمے آیا وہ جب بھی میرے پیچھے بیٹھا تھا، اور میں نے سُنا تھا براتیوں میں سے کسی نے کہا تھا۔ "لڑکیاں بھی شہ بالا رکھتی ہیں، یہ تو نہیں دیکھا ہے۔"

ایک زوردار قہقہہ گونجا تھا اور میں غصے سے جل اُٹھی تھی۔ ایک سنسنی سی میرے سارے جسم میں پھیل گئی تھی۔

"شادی کے لیے اتاؤلا ہوں، کوئی لڑکی نظر میں ہو تو میرا نام نوٹ کر لیجئے۔"

یہ اس نے جواب دیا تھا۔ وار زوردار تھا۔ لڑکیاں زور سے ہنسی تھیں اور اُدھر سے کوئی جواب نہ آیا تھا۔ مجھے کچھ سنتوش ہوا۔

اور پھر پھیروں کی رسم بھی پوری ہو گئی۔ پھول اور بتاشے ہون کنڈ میں ڈالے گئے اور آخری پھیرے کے بعد میری زندگی کا ایک نیا سفر شروع ہو گیا۔

جہیز کا سامان پیک ہو رہا تھا۔ میری سہیلیوں کے تحفے، ممی اور ڈیڈی کے دوستوں کے پریذنٹس ڈھیروں کی تعداد میں تھے۔

"تم مجھے یہ آئرن پریس ہی دے سکتے اور کچھ نہیں ملا میرے لیے؟" میں اُس سے

جھگڑ رہی تھی اور وہ مسکرا رہا تھا۔

"یہ انگلش پریس ہے، دیسی نہیں جو ہفتوں ہی میں ناکارہ ہو جائے۔ اس میں ٹمپریچر کنٹرول ہو سکتا ہے۔"

"جانتی ہوں، میں نے پہلے بھی دیکھ رکھی ہے۔"

"نشی، پریس تمہیں اس لیے دے رہا ہوں کہ تمہیں کریز کا ہمیشہ خیال رہے۔ ٹوٹنے لگے تو اسے فوراً ہی ٹھیک کر لو۔ ایک بار کریز ٹوٹ جائے تو پھر پہلی سی نہیں رہتی۔ یہی حال زندگی کا ہے، اس کے وقار کو قائم رکھو، اس کی دیکھ بھال کرو، اسے سنبھالو، اسے کبھی نہ ٹوٹنے دو۔ وقار ٹوٹ جائے تو زندگی میں کچھ نہیں رہتا۔"

اس کی آواز میں خلوص کی گرمی تھی۔

پریس تو اور لوگوں نے بھی دیئے تھے لیکن اس جذبہ سے نہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کریز کبھی نہیں ٹوٹے گی، وعدہ کرتی ہوں۔"

اس نے میرا مہندی سے سرخ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسے دوسرے ہاتھ سے سہلایا اور ایک بار اپنے سینے سے لگا کر کہا۔

"پھر کبھی ملاقات ہوئی تو پوچھوں گا۔"

"میرے آنے تک جانا مت، میں پرسوں واپس آ جاؤں گی۔"

"تم پرسوں نہیں آؤ گی میں جانتا ہوں۔"

"دنیا کی کوئی طاقت بھی مجھے آنے سے نہیں روک سکے گی۔"

"تم خود ہی رک جاؤ گی نشی۔" وہ مسکرایا تھا۔

اتنے میں میری سسرال کے لوگ آ گئے اور میں اندر چلی گئی۔

اور اس کے بعد میری ڈولی اٹھی اور میں نے ہاتھ بھر لمبے گھونگھٹ سے دیکھا وہ ایک طرف کھڑا رومال سے آنکھیں پونچھ رہا تھا۔

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا، وہ ہمیشہ ہی ٹھیک کہتا تھا۔ میں ہی اپنے آپ کو ٹھیک سے نہیں سمجھ سکی تھی۔ میرے اندازے سدا ہی غلط ہوتے تھے۔ میں اس روز نہیں آ سکی جس روز آنے کا میں نے وعدہ کیا تھا۔ میں وعدہ کرتے وقت بھول گئی تھی کہ واپس آنا میری

مرضی سے نہیں، ان لوگوں کی مرضی سے ہوگا جو مجھے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے اور انہوں نے ایک ہفتہ تک واپس نہ آنے دیا۔

اسی بات پر میرا اور میرے خاوند کا جھگڑا ہوگیا۔

سات دن کے بعد تار سے اطلاع دیکر جب میں اور میرا خاوند پہنچے تو ہم دونوں میں اختلافات کی شروعات ہو چکی تھی۔ میرے واپس آنے تک وہ چلا گیا تھا اور کسی سے کچھ نہ کہہ گیا تھا۔ اس نے کوئی شکایت نہ کی تھی، کوئی گلہ نہ کیا تھا۔

میں نے رما سے پوچھا۔

"کنول کب گیا تھا؟"

"جس روز اسے جانا تھا اس سے دو روز بعد" رما نے بتایا تھا۔

"مجھے کوستا رہا ہوگا؟"

"نہیں، وہ تو بہت خوش تھا۔ جانے سے پہلے مجھے اور رُوپی کو پکچر لے گیا تھا۔ آئس کریم کھلائی تھی، رات کو دیر تک چٹکلے سنا سنا کر ہنساتا رہا تھا۔ ڈیڈی ممی بھی بہت دیر تک ہنستے رہے تھے۔ دوسرے دن صبح ہم سب کی تصویریں کھینچی تھیں اور پھر جاتی دفعہ گیٹ کوٹھی احتیاط سے بند کر کے گیا تھا۔ میں کھولنے لگی تو بولا اب گیٹ نہ کھولو میں پھر رک جاؤں گا۔ اس گیٹ کو اب نشی ہی کھولے گی۔"

رما کی بات مجھ سے آگے نہیں سُنی گئی۔ میں پچھلے دروازے سے نکل کر آڑو کے پیڑ کے نیچے آگئی۔ شاخوں سے ٹوٹ کر گرے ہوئے پھولوں کی سیج بچھ رہی تھی۔ میں وہاں کھڑی دیر تک روتی رہی۔ بغیر جانے کہ میں کیوں رو رہی ہوں۔ مجھے اُس کے اس طرح چلے جانے پر دکھ تھا، یا اپنے ٹھیک سمے پر واپس نہ آسکنے کا افسوس تھا۔ بات صاف نہیں تھی لیکن دل میں کہیں درد کی رمق ضرور تھی۔

چار ہفتے پہلے اسی پیڑ کے نیچے میں نے ممی سے کہا تھا۔

"دراصل میں شادی کرنا چاہتی ہی نہیں۔ مجھے شادی سے نفرت ہے۔"

"لیکن اب تم چھوٹی تھوڑی ہو، پچیس برس کی ہو چکی ہو۔ اچھی خاصی سروس ہے۔ اب تمہیں اور دیر نہیں کرنی چاہئے۔"

"میں تم لوگوں پر بوجھ نہیں ہوں۔ خود کماتی ہوں۔

"پچھلے تین برسوں سے ہم تمہاری ضد مانتے رہے ہیں۔ کئی لڑکے دیکھے تم نے نامنظور کر دیئے۔ ہم نے آگے بات نہیں چلائی۔ تمہارا بیاہ ہو جائے تو پھر رما کی بات سوچیں۔ وہ بھی بڑی ہو گئی ہے۔"

"تو پہلے رما کا بیاہ کر ڈالو۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہارے ڈیڈی نے بہت پوچھ تاچھ کے بعد ایک لڑکا پسند کیا ہے، تم چاہو تو اسے خود بھی دیکھ لو۔"

"پہلے کیا کم دیکھ چکی ہوں، مجھے نہیں دیکھنا لڑکا وڑکا۔ میری چھٹی کل ختم ہو رہی ہے۔ میں واپس جا رہی ہوں۔"

"نہیں واپس نہیں جانا ہے تمہیں۔ تمہارے ڈیڈی نے کنول کو بھی تار دے رکھا ہے۔ وہ بھی آرہا ہے آج۔"

"وہ کیا کرے گا آکر؟ اسے بیچ میں کیوں گھسیٹتے رہتے ہو۔ شادی مجھے کرنی ہے یا کنول کو؟" میں غصے سے بولی تھی۔

اس شام کنول آ گیا تھا۔

ہم سے سرسری سی دعا سلام کے بعد وہ اور ڈیڈی اور ممی آپس میں باتیں کرتے رہے تھے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ قہقہے لگاتا ہوا ہمارے ٹولے میں شامل ہو گیا تھا اور میں اور رما اور رُوپی سب کچھ بھول گئے تھے۔ میں نے تار سے تین روز کی چھٹی بڑھوالی، رما نے کالج اپلی کیشن بھیجدی اور رُوپی کی ہیڈ مسٹرس کو ٹیلی فون سے اس کی بیماری کی اطلاع کر دی۔ آدھی رات تک رمی چلتی رہی۔ کنول نے دس روپے ہارے، روپی نے دو روپے جیتے اور باقی میرے حصے میں آئے۔ اگلے روز پکچر کا پروگرام طے ہوا۔

اگلی صبح لان میں گھومتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا تھا۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

میرا دل دھڑک اُٹھا۔ جانے کیا کہنا چاہتا تھا وہ۔ کوئی غلط بات نہ کہہ دے۔

"سوچ کے کہنا۔"

وہ مسکرا دیا۔

"زیادہ سوچنے والے آدمی کبھی اپنی بات صاف طور سے نہیں کہہ سکتے۔"

میرا دل پھر دھڑک اٹھا۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔ قدم مضبوطی سے زمین پر جما دیئے جیسے مجھ پر کوئی وار ہونے والا ہو۔

"تم کسی میں انٹرسٹیڈ ہو؟"

میں نے اس مختصر سوال پر اس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا اور کہا۔

"نہیں۔"

"اگر تمہاری نگاہ میں کوئی شخص ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں ابھی تمہارے ڈیڈی سے بات کر لوں گا۔ جو کچھ تم چاہو گی وہی ہوگا، یقین رکھو۔"

"میں کچھ نہیں چاہتی۔" میں نے جواب دیا۔

"جانتی ہو تمہارے گھر والے تمہارے لیے ایک لڑکا دیکھ چکے ہیں اور وہ فیصلہ کرنا چاہتے ہیں؟"

"مجھے شادی نہیں کرنی۔"

"کیوں؟" اس نے بالکل غیر جذباتی انداز میں پوچھا۔ جیسے کوئی دکان دار کسی چیز کا سودا کر رہا ہو۔

"بس نہیں۔"

اس نے ڈریسنگ گاؤن کی جیب سے سگرٹ کا پیکٹ نکالا، ایک سگرٹ سلگایا اور اس کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

"ان بیکار کے کمپلیکسز سے کیوں سفر (SUFFER) کرتی ہو؟ یا تو تم بتاؤ کہ تم کہاں شادی کرنا چاہتی ہو یا پھر جہاں ہم کہیں وہاں کر لو۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لان میں ٹہلتے ٹہلتے اس سے آگے نکل گئی۔ ہم دونوں میں فاصلہ بڑھ گیا۔ اور پھر میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کنول دوپہر کو کہیں چلا گیا۔

کچھ سامان اس کا یہیں پڑا تھا۔ اندازہ تھا کہ واپس آئے گا۔

اس شام میں نے اپنے دل کے دروازے بار بار کھولے، اندر جھانکا، لیکن لگتا تھا جیسے میرا دل اب ایک ایسا کمرہ بن گیا تھا جس میں رکھی چیزیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ کہیں کوئی ترتیب نہیں تھی۔ میز پر کتابیں کھلی پڑی تھیں، ریک پر خط بکھرے پڑے تھے، پلنگ

پر ساڑیاں روندی جارہی تھیں۔ ایسے میں اگر کھڑکی کھل گئی اور ہوا کا تیز جھونکا آگیا تو ایک بھی چیز نہیں بچے گی، سب کچھ اُڑ جائے گا' سب کچھ۔
ابھی کچھ مہینے پہلے یہی حالت کنول کے کمرے کی دیکھ کر آئی تھی۔
میں اور ممی اور رما اُسے ملنے گئی تھیں۔ میرا ایم۔اے کا امتحان کا سینٹر پنجاب میں بنا تھا۔ میں امتحان دینے گئی تھی اور ممی اور رما میرا ساتھ دینے۔ اُس کے پاس تین کمروں کا ایک فلیٹ تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں سمیٹ کر باقی دونوں کمرے ہمارے حوالے کر دیئے۔
"اچھا خاصا کباڑ خانہ ہے تمہارا گھر"۔ میں نے اسے چھیڑا تھا۔
"اس طرح چیزوں کو سیکنڈ ہینڈ بیچنے میں آسانی رہتی ہے"۔ اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔
میں پڑھتی خاک تھی۔ وہ ممی اور رما کو گھمانے لے جاتا کہ میں پڑھ سکوں اور میں اس بات پر کُڑھتی رہتی تھی کہ وہ مجھے ساتھ کیوں نہیں لے جاتا تھا۔ میں اپنے دونوں کمرے چھوڑ کر اس کے کمرے میں آجاتی اور اس کے بستر پر پڑی کتابوں کے صفحے اُلٹتی پلٹتی رہتی۔ جانے وہ کیا کچھ استعمال کرتا تھا کہ اُس کے کمرے میں ہلکی ہلکی خوشبو بسی رہتی تھی۔ وہ چہرے پر کریم بھی نہیں لگاتا تھا لیکن دیکھنے میں وہ بہت ملائم محسوس ہوتا تھا۔
وہ صبح نہا کر نکلتا تو میں فوراً باتھ رُوم میں گُھس جاتی۔ دیواروں پر صابن کے تازہ جھاگ اُڑتے ہوتے۔ گیلا ٹوتھ برش اور بینا کا کی ٹیوب کھلی ہوتی، جس میں سے گلابی رنگ کی ڈینٹل کریم دھیرے دھیرے نکل رہی ہوتی اور وہ تولیہ اپنے گرد لپیٹے ربڑ کی چپل پہنے باتھ روم سے نکل کر اپنے کمرے میں جاتے ہوئے گیلے پاؤں کے نشان فرش پر چھوڑتا جاتا اور مجھے محسوس ہوتا جیسے یہ پاؤں کے نشان میرے دل کے آنگن میں اُبھر رہے ہیں اور اس نے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا ہے۔ میں سوپ کیس صاف کرتی' ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب پر ڈھکن لگاتی اور باتھ رُوم میں پھیلی خوشبو کی لپٹوں کو اپنی سانسوں میں سموتی رہتی۔ پھر باتھ رُوم کا دروازہ دھیرے سے بند کر دیتی کہ لوبان کی یہ خوشبوئیں کہیں باہر نہ نکل جائیں۔ اور اس کے کمرے پہ دستک دیتی۔
"مے آئی کم اِن؟"
"پلیز نِشی"۔
اور وہ اپنے بالوں میں کنگھی کر رہا ہوتا یا قمیض پہن رہا ہوتا یا ٹائی کی ناٹ دُرست

کر رہا ہوتا۔

"تمہارا تولیہ لے جاؤں؟"

"ٹھہرو میں صاف تولیہ نکال دیتا ہوں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔" اور میں اس کا گیلا تولیہ اٹھا کر باتھ روم میں بھاگ آتی اور اس کے صابن کے جھاگ میں اور جھاگ گھلا دیتی، جلتے ہوئے لوبان میں کچھ اور لوبان ڈال دیتی اور اپنے جسم کے ایک ایک انگ کو اس کے گیلے تولیے سے رگڑتی رہتی جب تک کہ رما باہر سے چیختی نہیں۔

"باتھ روم میں کیا کرتی رہتی ہو اتنی دیر؟"

میں چونک پڑتی، کپڑے پہن کر جلدی سے باہر نکلتی اور لگتا کہ خوشبوؤں کا ایک قافلہ میرے پیچھے چلا آرہا ہے اور میرے پاؤں کے گیلے نشان باتھ روم سے میرے کمرے تک پھیلے ہوئے میرا تعاقب کرتے رہتے اور رما کنول سے کہتی۔

تمہارا باتھ روم تو عطر گھر ہے، اتنی خوشبو، اتنی خوشبو کہ آدمی بے ہوش ہو جائے۔"

اور وہ ہنس دیتا اور کہتا۔

"میرے علاوہ یہاں کوئی بے ہوش نہیں ہو سکتا۔"

وہ تو بے ہوش نہیں ہوا لیکن میرے دل و دماغ پر جانے کون کون سی خوشبوئیں منڈلاتی رہیں اور جب میں امتحان دے کر واپس آنے لگی تو اس نے ہم سب کو ایک بہت بڑھیا پارٹی دی اور پھر ٹرین میں ہماری سیٹیں ریزرو کرائیں اور پھر ہمیں اسٹیشن پر چھوڑنے آیا۔

"تم کب آرہے ہو ہمیں ملنے؟" رما نے پوچھا تھا۔

"اتنے دن ملتے ہی تو رہے ہیں۔" اس نے جواب دیا تھا۔

"اپنے ساتھ وہ نسخے ضرور لے آنا جن کی خوشبو سے تمہارا گھر مہکتا رہتا ہے۔" میں نے کہا تھا۔

"وہ تو اب جا رہے ہیں۔" وہ مسکرایا تھا۔ "گھر تو رہنے والوں کی سانسوں، ان کی باتوں ان کے قہقہوں سے مہکتا ہے۔ کبھی عطر کی خوشبو سے بھی مہکا ہے؟"

وہ مسکرایا ضرور تھا لیکن اس کی مسکراہٹ میں ایک ہلکے سے درد کی پرچھائیں بھی تھی، جسے میں نے محسوس کیا تھا اور چاہا تھا کہ وہ ہمیں ایک آدھ روز کے لیے اور روک لے۔

لیکن اس نے رُکنے کی کوئی بات نہیں کی بلکہ جب گارڈ نے سبز جھنڈی ہلائی تو میری پیٹھ پہ ہاتھ رکھ کر مجھے کمپارٹمنٹ کے اندر دھکیل دیا۔ ٹرین چلی تو میں اور رما دونوں سر کھڑکی سے باہر نکالے رومال ہلاتی رہیں۔ لیکن اس نے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا پلیٹ فارم کا مختصر فاصلہ تیزی سے طے کرتا جاتا تھا۔ میرے ذہن میں خوشبو میں بسی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔

اس سے اگلے روز وہ واپس آگیا۔

آتے ہی میری طلبی ہوئی۔

"میں نے لڑکا دیکھ لیا ہے۔ بنارس یونیورسٹی سے اُس نے انجینیرنگ کی ہے۔ اُس سے پہلے وہ گورو کل میں پڑھتا رہا ہے۔ صحت بہت اچھی ہے۔ بھلا لڑکا ہے۔" اُس نے کہا تھا۔ میں نظریں جھکائے سنتی رہی تھی۔ لیکن ایک دم بے نیاز سی۔

"سُن رہی ہو؟" اس نے میری بے توجہی پر کھیجتے ہوئے پوچھا۔

میں نے ایک بار آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر نظر نیچی کر لی۔

"میں تمہاری طرف سے ممی اور ڈیڈی کو ہاں کہہ دوں؟" اُس نے پھر پوچھا

میں پھر خاموش رہی، جیسے میری خاموشی سے ہی مشکل حل ہو جائے گی۔ لبوں پر جیسے کسی نے گرم لاکھ کی مہریں لگا دی تھیں۔ ایک بار یہ بھی تو نہ کہہ سکی کہ مجھے شادی نہیں کرنا ہے۔ وہ سب لوگ بیکار میں پریشان ہو رہے تھے۔

کاش میں کبھی کچھ کہہ سکوں، کاش میری سوچ کے تانے بانے ایک بے جان تصویر بن کے ہی نہ رہ جایا کریں، اُس کے ہونٹوں سے کوئی آواز بھی نکلے۔ میری آواز گنگ تھی۔ میری چھٹی یہیں سے بڑھوالی گئی۔ اس نے بھی چھٹی لے لی۔ ڈیڈی ممی نے بیاہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ شادی کے کارڈ چھپ گئے، پوسٹ بھی ہو گئے۔ سبھی مہمان پہونچ گئے۔ ڈھولک پہ گیت بھی گائے گئے۔ رما کی سہیلی منورما کی آواز تو کوندے کی طرح لپکتی تھی۔

دلیا بال کے نیرے اُتے رکھنی آں
گلی بُھل نہ جائے ماہی میرا

لیکن میں ایک دم خاموش تھی۔ میں نے جیسے اپنے آپ کو تحت الشعور کی گہرائیوں میں ڈبو دیا تھا اور آنکھوں پہ پٹی باندھ لی تھی اور کانوں میں روئی کے گالے ٹھونس دیئے تھے۔ اب چاہے آندھی آئے، اولے گریں، بجلی کڑکے، مجھے کسی سے سروکار نہ تھا۔ کوئی لاکھ چراغ

جلائے میری گلی میں تو سدا اندھیرا ہی رہے گا۔

کُھلی چھت پر کھڑے، چاندنی رات کی دسعتوں کو گھورتے ہوئے اُس نے ایک بار پھر پوچھا۔

"یوں سمٹ کیوں گئی ہو تم ؟"

"پھیلنے کے لیے وسعتیں جو بہت چھوڑی ہیں تم نے۔"

"سبھی لڑکیاں شادی کرتی ہیں۔ تم کوئی غیر معمولی کام تو نہیں کر رہی ہو۔"

"یہی افسوس ہے کہ میں کوئی بھی ایسا کام نہیں کر سکتی جو غیر معمولی ہو۔ شادی سے کچھ گھنٹے پہلے میں کہیں بھاگ جاؤں، ایسا کرنا چاہتی ہوں یہ ایک غیر معمولی قدم ہوگا۔ لیکن یہ قدم نہیں اُٹھا سکوں گی۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ میرے میں کچھ کر سکنے کی صلاحیت ہی نہیں۔"

میں رو پڑی تھی اور اس نے میری سسکیوں کو دباتے ہوئے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا۔ اور سمجھا رہا تھا۔

"وہ لڑکا بہت اچھا ہے، تم شادی کے بعد ضرور خوش رہو گی۔"

کاش وہ اس کے علاوہ کچھ اور کہتا، کچھ اور، جس سے میرے دُکھے ہوئے من کو شانتی ملتی۔ لیکن اس نے کچھ نہیں کہا اور میں سسکتی رہی اور اس کے بالوں سے اُڑتی ہوئی پیاری سی خوشبو میرے ذہن میں منڈلاتی رہی۔

اور پھر بیاہ کی تاریخ آگئی۔

سائبان اور قناتیں لگ رہی تھیں، پنڈال سج رہا تھا۔ گیٹ بن رہے تھے، کاغذ کی جھنڈیاں باندھی جا رہی تھیں۔ گھر بھر میں ایک ہل چل مچ رہی تھیں۔

اور پھر بارات آ بھی گئی۔

وہ بارات کے آنے سے لے کر مجھے ڈولی میں بٹھانے تک میرے ساتھ رہا۔ مجھے سہارا دیتا رہا۔ مجھے سمجھاتا رہا۔ مجھے دعائیں دیتا رہا اور جب میں ڈولی میں بیٹھ گئی تو ایک طرف کھڑا رومال سے اپنی گیلی آنکھیں پونچھتا رہا۔

میں سسرال پہونچ گئی اور میرا دھیان اس کی طرف رہا۔ ایک دن ہی کی تو بات تھی، پھر اس سے جا ملوں گی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

میرے سسر بہت اچھے تھے، کٹّر آریہ سماجی۔ ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ میری

ساس بڑی نیک عورت تھی، بے چاری نے سرخ سالو اوڑھے میری ہزار بلائیں لیں۔ میری نند سُشما روپی کی ہم عمر تو مجھے دیکھ کر پاگل ہی ہوگئی۔

"کتنی پیاری ہے میری بھابی، دیکھو!" وہ اپنی سہیلیوں کو میرا گھونگھٹ اٹھا اٹھا کر دکھا رہی تھی۔ اور مجھے اس پر پیار آرہا تھا۔ اس نے شاید زندگی میں بہت ہی کم خوشی کے موقع دیکھے تھے۔ اسی لیے خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی۔ کمروں میں مہارشی دیانند کی تصویریں تھیں، الماریوں میں دھرم پُستکیں سجی تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر شُدھ کھدر کے پردے تھے۔ میرے سُسر کُھردرے تخت پر سوتے تھے۔ میرا خاوند بھی کئی برسوں کے بعد اب پلنگ پر سونا شروع کرے گا۔ یہ سب باتیں مجھے سُشما نے بتائی تھیں۔

"تمہارے بھیا سگرٹ پیتے ہیں؟"

"رام رام، انہیں سگرٹ کے نام سے بھی بیر ہے۔"

"چائے کتنی بار پیتے ہیں؟"

"ایک بار بھی نہیں۔"

"بیڈ۔ٹی بھی نہیں؟"

"ہمارے ہاں اس کا رواج نہیں، میں کبھی چُھپ کر چائے پیتی ہوں۔"

"مجھے پلایا کرو گی؟"

"ہاں چوری سے۔" سُشما نے کہا تھا۔ وہ میرے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھی۔

"تمہارے بھیا ناول تو پڑھتے ہوں گے؟"

"نہیں، وہ تو بس ستیارتھ پرکاش پڑھتے ہیں۔"

"کون سا تیل لگاتے ہیں بالوں میں؟"

"کچی گھانی کا خالص سرسوں کا تیل۔ جو کھدر بھنڈار سے ملتا ہے۔"

"صابن کون سا استعمال کرتے ہیں؟"

"وہ صابن استعمال کرتے ہی نہیں۔ شیو بھی بغیر صابن ہی کے بناتے ہیں۔"

"سوتے کتنے بجے ہو تم لوگ؟"

"ہم سب نو بجے سے پہلے سو جاتے ہیں۔"

"اور جاگتے کس وقت ہو؟"

"صبح چار بجے کے بعد کوئی نہیں سوتا۔"

میں یہ سوچ رہی تھی کہ ابھی کچھ اور پوچھنا باقی تھا یا سب کچھ پوچھ لیا تھا کہ میری ساس نے اُسے پکارا اور وہ "بھابی ابھی آئی" کہہ کر چلی گئی اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ اور طشتری میں رکھی مٹھائی تھی۔

میں تو دودھ نہیں پیتی ششما" نہ مٹھائی ہی کھاتی ہوں۔"

"بھیا نے بھیجا ہے دودھ" واپس لے جاؤں گی تو وہ ناراض ہوں گے۔"

"تو تم پی لو۔"

"اچھا میں انتظام کرتی ہوں۔"

وہ یہ کہہ کر چلی گئی۔ دودھ شاید اس نے باہر اُنڈیل دیا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دیوار کے ساتھ پیٹھ ٹیک دی۔ گھونگھٹ کھینچ کر اور لمبا کر لیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے سامنے کھڑا رو رہا ہے اور اپنے کیمبرک کے سفید دُھلے ہوئے رومال میں اپنے آنسو جذب کرتا جا رہا ہے۔ مجھے اس پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ اُس نے جان بوجھ کر مجھے ایسے ماحول میں پھینکا تھا جس میں کبھی مطمئن نہ ہو سکتی تھی۔ روتا رہے عمر بھر۔ میرے ساتھ اس نے کون سی بھلائی کی تھی۔ اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں پھپھک کر رو پڑی۔

رات میں نے اپنے خاوند سرونش پانڈے کو دیکھا۔ دوہرے جسم کا سانولے رنگ کا نوجوان، گٹھا ہوا جسم، سر کے چھوٹے چھوٹے بال، جو کپڑے صاف کرنے والے برش کے بالوں کی طرح کھڑے تھے۔ خالص کھدر کی پوشاک پہنے گورکل کا ودیارتھی لگ رہا تھا۔ مجھے لگا وہ ابھی گائتری منتر کا اُچارن کرنے لگے گا اور ہری اوم تت ست سے کمرے کی دیواریں گونجنے لگیں گی۔

اور پھر صبح تک میری ناک میں خالص سرسوں کے تیل کی بُو اور بغیر صابن کے استعمال سے جسم سے نکلے ہوئے پسینے کی باس گھستی رہی اور ایک بار جب اس نے میرے کمزور جسم کو اپنے چوڑے چکلے سینے سے لگا کر بھینچا اور ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھے تو تیز سی بُو کا ایک بھبھکا میرے نتھنوں میں آن گھسا اور مجھے اُبکائی آنے لگی۔ وہ گھبرا گیا۔

"طبیعت خراب ہے کچھ؟" اُس نے پوچھا۔

میں خاموش رہی اور کپڑے دُرست کرتی ہوئی کروٹ بدل کر پلنگ کی پٹی کے ساتھ

لگ گئی۔ تھوڑی دیر میں خراٹوں کی اونچی اونچی آواز سے کمرہ گونجنے لگا اور اس گونج میں میری ہلکی ہلکی سسکیاں ڈوبتی گئیں۔

شاستر مریادا کے انوسار میں سات دن اس قلعے میں قید رہی اور جب واپس اپنے گھر پہونچی تو کنول جا چکا تھا۔ میں رما کی بات سن کر باہر لان میں آگئی تھی آڑو کے درخت کے نیچے، اور روتی رہی جی کھول کر۔ لگتا تھا میں نے زندگی میں جو کچھ کرنا تھا کر لیا تھا۔ اب تو صرف پرائیسچت کرنا باقی تھا۔ اس کے لیے ساری عمر پڑی تھی۔ پرائیسچت کے لیے بھی شاستر مریادا کی ضرورت ہو گی کیا؟ پچھتاوا تو ایک نجی معاملہ ہے۔ کوئی کسی طرح پچھتائے، اپنے آپ کو کسی طرح بھی کچلے، اس سے کسی کو کیا۔ اپنے لیے ہر ایک کو صلیب خود ہی بنانی پڑتی ہے اور خود ہی کروسی فائی ہونا پڑتا ہے۔ اس کے لیے کوئی قانون نہیں، کوئی نپا تلا طریقہ نہیں۔

اپنی صلیب اپنے کندھے پر اٹھاؤ اور جب چلتے چلتے تھک جاؤ تو اس کے ساتھ لٹک جاؤ۔

رما آئی تھی۔

"جیجا جی چائے پر انتظار کر رہے ہیں۔"

"مجھے وہاں جانا نہیں بہنی، تم یہیں لے آؤ۔"

پھر ممی آئی تھی۔

"بیٹی وہاں تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔"

"میں وہاں نہیں جاؤں گی، مجھے دِق مت کرو۔"

ممی چلی گئی۔ وہ میری عادت کو جانتی تھی۔

پھر رما چائے لے کر باہر آڑو کے درخت کے نیچے آگئی۔ ہم دونوں گھاس پر بیٹھ کر چائے پیتی رہیں۔ آج سات روز کے بعد چائے پینے کو ملی تھی۔ سسرال میں تو پوری پر وِبندھن تھی۔ سُشما چوری چھپے ایک پیالی لے آتی تھی ہر روز، ورنہ مہاشے ہرونش تو چائے پینے والوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔

رات کو میں رما کے کمرے میں سوئی اور ہرونش پانڈے الگ کمرے میں پڑے جاگتے رہے اور پھر خراٹوں سے چھت کے پنکھے کے خول میں گھونسلے میں دبکی چڑیا کو ڈراتے رہے۔

پھر صبح ہوئی۔

شام بھی ہو گئی۔ پکچر کا پروگرام بنا۔ میں جانے کو تیار نہیں ہوئی۔ پروگرام کینسل ہو گیا۔

ایک صبح اور ہوئی۔

شام کو ڈیڈی کے ایک دوست نے ہم سب کو چائے پر بُلایا تھا۔ میں سر پکڑ کر لیٹی رہی، نہیں گئی۔

ایک اور صبح ہوئی۔

ہر ونش پانڈے نے واپس جانے کی تیاری کرنا چاہی۔ مجھے بُلایا گیا۔ ان تین دنوں میں میرا اس سے سامنا ہی نہیں ہوا تھا۔

"چلنے کا کیا پروگرام ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"میں ابھی نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟"

"یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔"

"بیاہ کے بعد ذاتی مسئلے ختم ہو جاتے ہیں۔ اب تم نشا مار کنڈے نہیں، نشا پانڈے ہو۔"

"میں نہ مار کنڈے ہوں نہ پانڈے، صرف نشا ہوں۔ اور اب دونوں قسم کے بندھنوں سے آزاد ہوں۔"

"تو میں تمہارے پیرنٹس سے بات کرتا ہوں۔"

"کر لیجئے۔"

اس نے ڈیڈی ممی سے بات کی۔ انہوں نے مجھے سمجھایا لیکن جب جانے کی بات اُٹھتی تو خالص سرسوں کے تیل کی بُو اور گندے پسینے کی باس سے میرا دماغ پھٹنے لگتا۔ میں نے سسرال جانے سے صاف انکار کر دیا۔ ہاں صرف ششما کا خیال آتا رہا جو بہت پیاری اور اچھی لڑکی تھی لیکن غلط ماحول میں گھُٹ کر جان دے رہی تھی۔ کاش میں اُس کے لیے کچھ کر سکتی! چاہتی تھی اُسے ایک خط لکھوں گی اور اس سے نہ آنے کی معافی مانگوں گی۔ اسے کہوں گی کہ وہ کچھ دنوں کے لیے یہاں آجائے۔ لیکن وہ خط بھی کہاں لکھ سکی تھی۔

ہر ونش پانڈے شام کو چلا گیا اپنا چھوٹا سا اٹیچی کیس لیکر۔ میں اُسے اسٹیشن تک چھوڑنے بھی نہیں گئی۔ ڈیڈی، ممی، رما اور رُوبی سبھی کار میں بیٹھ کر اسے چھوڑنے گئے۔ لیکن میں کوٹھی کے گیٹ تک بھی نہیں گئی۔ بند کھڑکی کے شیشوں سے دیکھتی رہی اور کار جب گیٹ سے

باہر نکل گئی تو اپنے نڈھال جسم کو پلنگ پر گرا دیا۔ کھڑکی کے باہر دس روز پہلے کی لگی رنگ برنگی جھنڈیوں کے کچھ ٹکڑے ابھی تک پھڑ پھڑا رہے تھے، جیسے بند کواڑوں پر دستک دے رہے ہوں۔

آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ میں ایک بار واپس آ کر پھر کبھی اپنی سسرال نہیں گئی۔ میرے ڈیڈی اور میرے سسر پانڈے جی میں خط و کتابت ہوتی رہی۔ ایک بار وہ خود بھی آئے۔ مجھے بڑے پیار سے سمجھایا۔ یہ بھی بتایا کہ سُشما میرے بغیر رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ مجھے اپنے رویہ پر افسوس بھی ہوا لیکن میں اپنا فیصلہ نہ بدل سکی۔ میرا خاوند بیرونش پانڈے بھی ایک بار مجھے لینے آیا لیکن میں وہاں نہیں تھی، ملازمت کے سلسلے میں کسی اور جگہ تھی۔ وہ میرے ڈیڈی کے منع کرنے پر بھی وہیں آ پہونچا۔ میں اب تو بھول بھی گئی تھی کہ میں شادی شدہ لڑکی تھی۔ میں نے مانگ میں سیندور بھرنا اور بندی لگانا چھوڑ دیا تھا۔ پہلے جیسے سادہ کپڑے پہننے شروع کر دیئے تھے۔ ایک بھی زیور میرے جسم پر نہیں تھا۔ وہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ میں نے اپنے آفس ہی میں اسے چائے کی پیالی پلائی۔ اُسے اپنے گھر بھی نہیں لے گئی اور وہیں سے رُخصت کر دیا۔ جانے سے پہلے اس نے کہا۔

"تمہاری یہ ضد ٹھیک نہیں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"دونوں گھروں کی عزت کا سوال ہے، لوگ ہم سے بھی طرح طرح کے سوال کرتے ہیں، کیا جواب دیں؟"

"آپ جو جی میں آئے کہیں، میرے کریکٹر پر تہمت لگا دیں، اگر اس سے اطمینان ہو سکتا ہو۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ بولا۔

"تو جو ہو سکتا ہے کیجیے، میں وہاں نہیں جا سکتی۔"

"اب تو جہاں میری پوسٹنگ ہوئی ہے وہاں جانا ہے۔"

"میں آپ کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی۔"

"اس کا انجام کیا ہوگا، جانتی ہو؟"

"آہستہ آہستہ جان جاؤں گی۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ آخری بس ہے، مس ہو گئی تو آپ کو تکلیف ہوگی۔" اور اس نے جن نظروں سے مجھے دیکھا اس میں گورو کُل کے سارے

ضبط اور بے بسی کی آگ تھی۔ مجھے لگا میں بھسم ہو جاؤں گی۔

اس کے بعد کوئی بات نہیں ہوئی۔

وہ واپس چلا گیا۔

اور پھر اس نے سیپریشن کے لیے درخواست دے دی۔ میں نے بھی ہاں کر دی اور دو برس کی بیاہی ہوئی نِشا مارکنڈے آخر بندھن مُکت ہو گئی۔

پچھلے برس رما نے ایم اے کر لیا اور اپنی مرضی سے شادی کر لی۔ گھر میں کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ رما اور اس کا خاوند ایک ہی کالج میں پڑھاتے ہیں اور خوش ہیں۔

رُوپی نے اب بی اے داخلہ لیا ہے۔

میں اب ملازمت چھوڑ کر گھر آ گئی ہوں۔ یوں تو سب ٹھیک ہے لیکن ڈیڈی کو چنتا ہے کہ میرا کیا ہو گا۔ میرا کوئی بھائی نہیں جو میری دیکھ بھال کر سکے گا۔ ڈیڈی ہارٹ کے مریض ہیں۔ ممی ویسے ہی بیمار رہتی ہیں۔ اس چنتا کو مٹانے کے لیے وہ گھر میں دوستوں کو جمع کئے رکھتے ہیں، پارٹیاں ہوتی ہیں۔ ہنگامے رہتے ہیں اور مجھے اس تمام شور و غل سے کوفت ہوتی ہے۔ لیکن کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میری کون سُنے گا! مجھے اپنی بات منوانے کا کوئی حق بھی نہیں۔ میں نے ہی کب ان کی کوئی بات مانی ہے۔

پچھلے کچھ دنوں سے منوج بھاردواج کا آنا جانا بڑھ گیا ہے۔ منوج بھاردواج یہاں کا ایک کھاتا پیتا ڈنٹسٹ ہے۔ کوئی چھ ماہ ہوتے اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اُس کی ایک چھوٹی سی بچی ہے۔ بہت ہی پیاری۔ ممی ایک بار اسے ساتھ لے آئی تھی۔ اب کبھی آٹھویں دسویں روز وہ آ جاتی ہے بلکہ دیر ہو جائے تو اکثر ہمارے ہاں ہی رُک جاتی ہے۔ رات کو میرے ہی ساتھ سو بھی جاتی ہے۔ مجھے اس کی تقدیر پر بڑا ترس آتا ہے، بے چاری اتنی چھوٹی عمر میں ماں کے پیار سے محروم ہو گئی ہے۔ مسٹر بھاردواج کسی نہ کسی بہانے کچھ لے آتا ہے۔ ممی انکار کرتے ہوئے بھی لوٹا نہیں سکتی۔

ممی ایک روز کہہ رہی تھی۔

"یہ بھاردواج بے چارہ کتنا اچھا آدمی ہے، لیکن کتنا دُکھی ہے۔"

"ہاں دُکھ اچھے آدمیوں کا زیور ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہاری بڑی تعریف کرتا ہے۔"

"اس کی مہربانی ہے، ورنہ آجکل کے زمانے میں کون کسی کی تعریف کرتا ہے۔"
"وہ پہلا آدمی ہے جس نے کھل کر حمایت کی ہے تمہارے فیصلے کی۔ اس کا کہنا ہے کہ ان حالات میں سیپریشن ہو ہی جانی چاہیئے تھی۔"
"کن حالات میں؟"
"تمہارے والے میں۔"
"کیا حالات ہیں میرے، وہ کیسے جانتا ہے؟"
"ایک بار ویسے ہی ذکر آگیا تھا،" ممی بولیں۔
"ہر کسی سے یہ قصہ چھیڑ کر تم میرے لئے ہمدردیاں اکٹھی کرتی پھرتی ہو۔"
"نہیں، یہ بات نہیں ہے بیٹی۔"
"تم لوگ اگر مجھ سے تنگ ہو تو میں دوبارہ سروس کر سکتی ہوں۔" میں نے غصہ سے کہا۔
"بھاردواج نے باتوں ہی باتوں میں بتایا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔"
"لیکن میں اُسے پسند نہیں کرتی۔ اُسے کہہ دو وہ ہمارے گھر نہ آیا کرے اور نہ ہی اپنی بیٹی کو بھیجا کرے، یہ کوئی یتیم خانہ نہیں ہے۔" میں کڑک اٹھی۔
اور پھر ایک دن رما کا خط آیا۔ اس نے لکھا تھا کہ مسٹر بھاردواج کے ساتھ میری شادی کی بات پکی ہونے والی تھی۔
اور اُسی دن بھاردواج بھی گیا۔ ممی ڈیڈی گھر پر نہیں تھے۔ رُوپی لان میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔
"آئیے انکل،" اس نے کہا۔
"تمہاری دیدی کہاں ہیں؟" بھاردواج نے پوچھا۔
"دیدی تو گھر پر ہی ہیں لیکن ممی ڈیڈی باہر گئے ہیں۔"
"ذرا بُلوا دو دیدی کو۔"
"دیدی کوئی تم سے ملنے آئے ہیں۔" رُوپی نے لان ہی سے چلانا شروع کیا۔
میں آواز سن کر باہر آئی تو منوج بھاردواج کھڑا تھا۔
"نمستے۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔
"نمستے۔" میں نے جواب دیا۔ "گھر پر کوئی بھی نہیں۔"
"جن سے مجھے ملنا ہے وہ گھر ہی پر ہیں۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" میرے ماتھے پر شکنیں تن گئی تھیں۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"کہئے۔"

"ہم کہیں بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے؟"

"آپ یہیں بات کر لیجئے۔" میں نے کہا۔

منوج بھاردواج نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں دیا اور منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میں لفافہ لے کر اندر چلی گئی اور وہ لوٹ گیا۔ مختصر سے خط میں اس نے پروپوز کیا تھا۔ مجھے بے چارے پہ ترس آ گیا۔ کہاں مرنے جا رہا تھا۔

میں نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔

چند روز ہوئے مجھے رُوپی نے بتایا کہ ڈیڈی نے بھاردواج انکل سے میری شادی طے کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور رما کو فوراً آنے کے لیے لکھا تھا۔

میں پچھلے کئی روز سے پریشان ہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

رات بہت دیر تک اپنے پُرانے خط نکال کر پڑھتی رہی۔ کنول کا خط نکل آیا۔ اُس نے یہ خط مجھے جب لکھا تھا جب اُسے میری سیپریشن کے معاملہ کا علم ہوا تھا۔

نشی!

جس ڈھنگ سے تم مسرت اور سکون تلاش کر رہی ہو تمہیں نہیں مل سکتا۔ تم نے ہر روِش سے علیحدگی اختیار کر لی کیونکہ تمہارے نظریے غلط ہیں۔ تمہاری پرکھ کا انداز ٹھیک نہیں۔ اب کیا کرو گی تم! تم نے اپنے اس عمل سے ڈیڈی ممی کو کتنا بڑا صدمہ پہونچایا ہے۔

میں اپنے آپ کو بھی قصوروار سمجھتا ہوں کہ میں نے تم پر دوسروں کے فیصلے ٹھونسنے میں ان کی مدد کی۔ میرے قصور کی سزا تو مجھے کیا دو گی تم؟ اپنے آپ پر ضرور ظلم کر رہی ہو۔ مجھے خوشی ہوگی اگر میں کبھی تمہارے کسی کام آسکوں تو!

تمہارا

کنول

میں نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اُس نے بھی اس کے بعد کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ غالباً وہ اب بھی اُسی تین کمروں کے فلیٹ میں رہ رہا ہوگا۔ اُس کے کمرے میں

اب بھی لوبان سلگتا ہوگا، اس کے باتھ رُوم میں اب بھی عطر گھلتے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے اُس نے شادی کر لی ہو۔ لیکن اگر وہ شادی کرتا تو ہمیں بلانا ضرور ممّی ڈیڈی سے مشورہ ضرور کرتا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کوئی لڑکی پسند آگئی ہو اور شادی کر لی ہو۔ اس میں کسی سے مشورہ کرنے کی کیا بات تھی۔ میں آدھی رات کے بعد تک اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ جانے مجھے کیوں لگا کوئی میرے دل کے بند دروازوں کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ دروازے جن میں بڑی بڑی کیلیں ٹھکی ہوئی تھیں، دروازے جو بے حد مضبوط تھے۔

اور آج کرسمس ایو ہے!

صبح میں نے سوچا تھا کہ اسے کرسمس کارڈ بھیجدوں۔ پھر خیال آیا کہ رُوپی کو بازار بھیجوں اچھے سے کارڈ خرید لائے گی۔ میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ پوسٹ مین دو لفافے دے گیا۔ ایک میں منوج بھاردواج کا بھیجا ہوا بڑا قیمتی اور خوبصورت کارڈ تھا اور دوسرے میں ہاتھ سے لکھا ہوا ایک معمولی سا کاغذ، جس پر صرف ایک سطر تھی۔ 'تم سلامت رہو'۔

اور نیچے کنول کا نام تھا۔

وہ ایک بار پھر جیت گیا تھا۔ وہ ہمیشہ ہی جیت جاتا تھا۔ میں ابھی فیصلے پر سوچ وچار ہی کر رہی تھی اور اس نے فیصلہ کر بھی ڈالا تھا۔ میں ابھی سوچ کے تانے بانے ہی بُنتی تھی کہ وہ تصویر بھی مکمل کر لیتا تھا۔

میں نے اُسی لمحہ اُسے ایک ارجنٹ ٹیلی گرام دے دیا۔

اگر وہ وقت سے نہیں آیا تو یہ سب لوگ مل کر مجھے کروسی فائی کر ڈالیں گے۔ صلیب تو میری پہلے ہی سے تیار ہے۔ لیکن میں دوسروں کے ہاتھوں سے فنا ہونا نہیں چاہتی۔ میں اپنی بنائی ہوئی صلیب پر خود لٹکنا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنے سینے پر کراس کا نشان بناتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور دعا مانگی "خداوندا اپنی بھیڑوں کی حفاظت کر"۔

اندھیرا ہونے لگا ہے۔

کار کا ہارن ہوا ہے۔ منوج بھاردواج آگیا ہے۔ میں لان سے اٹھ کر اندر آگئی ہوں۔ بند کھڑکی کے شیشوں سے دیکھا ہے، اس کی لڑکی بالکل گڑیا سی بھاگ کر برآمدے کی طرف آرہی ہے۔

"ممی ڈیڈ ہیپی کرسمس ٹو یو"۔

ممی نے اسے گود میں اٹھا کر چوم لیا ہے۔ کتنی پیاری بچی ہے، اور کیسی مہذب

کانوینٹ میں پڑھنے جاتی ہے۔ اور اب کار کا دروازہ بند کر کے منوج سجاردواج اِدھر آرہا ہے۔ بڑھیا کپڑے کا اچھا سِلا ہوا سُوٹ، میچ کرتی ہوئی، ٹائی، چمکتے ہوئے جُوتے، بہت ہی اچھا لگ رہا ہے اِس سمے، بھلا آدمی ہے بے چارہ۔ زخم خوردہ ہے شاید۔ اِسی لیے مجھے اچھا لگتا ہے۔ کاش وہ اپنی اچھائی غلط آدمیوں پر قربان نہ کرے! وہ مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا اور میں یہاں کمرے میں سر درد کا بہانہ کیے پڑی ہوں اور ساریڈون کی ٹکیا ڈھنڈوا رہی ہوں۔

رما اور اس کا پروفیسر خاوند بھی آگئے ہیں۔ یہ ان کی پہلی کرسمس ہے جو وہ یہاں منانے آئے ہیں۔ رما کا انتخاب ٹھیک ہے۔ مجھے پسند آیا ہے۔ وہ سب میرے کمرے میں جمع ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھے لمحہ بھر بھی اکیلا نہ چھوڑیں۔ مجھے اکیلے پن سے ڈر لگتا ہے۔ اکیلی دیکھ کر کوئی بھی تو آسکتا ہے۔

نوکر نے معمول کے مطابق میرے کمرے کے آتش دان میں لکڑیاں سُلگا دی ہیں۔

ممی کے بلانے پر ہم سب کچھ لمحوں کے لیے ڈرائنگ رُوم میں گئے۔ بہت سے مہمان جمع ہو رہے ہیں۔ سبھی اپنے اپنے گلاس سنبھالے کرسمس ایو منا رہے ہیں۔ میں نے بھی اپنے گلاس میں پورٹ ڈال لی ہے۔ رما نے بھی اپنا گلاس اٹھا لیا ہے۔ اٹھا تو پروفیسر نے بھی لیا ہے لیکن بیچارہ شرما رہا ہے۔

ہیپی کرسمس ٹُو دی نیو کمرز!

سب نے اپنے اپنے گلاس ہونٹوں سے لگا لیے ہیں۔ میں نے بھی اور رما نے بھی لیکن پروفیسر ابھی تک جھجھک رہا ہے۔ میں اُسے ساتھ لیے واپس اپنے کمرے میں آگئی ہوں۔

رما، پروفیسر، رُوبی سب نے میرے گلاس سے ایک ایک سِپ لیا ہے اور ہم آتشدان کے پاس بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ آتشدان میں لکڑیاں سُلگ رہی ہیں۔ باہر تیز ہوا چل رہی ہے۔ آڑو کے پیڑ کے خزاں رسیدہ کمزور پتے شاخوں سے جدا ہو کر نیچے گر رہے ہوں گے۔ پروفیسر نے سگرٹ سُلگا کر دیا سلائی آتشدان میں پھینک دی ہے۔

ہم سب اپنے اپنے گلاس سنبھالے خاموش ہیں اور جانے کیا کچھ سوچ رہے ہیں۔

اچانک ایک ہنگامہ ہوا۔ رُوبی بھاگ کر باہر گئی ہے۔

وہ شاید آگیا ہے، وہی جس کو میں نے تار دیا تھا۔ وہی جس کی شخصیت سے خُوشبو کی لپٹیں نکلتی رہتی ہیں، ارے وہی کنول!

"میٹ مائی سن کنول" ! ڈیڈی مہمانوں سے کنول کا تعارف کرا رہے ہیں۔ وہ جب دو تین پیگ لے لیں تو جذباتی ہو جاتے ہیں اُن میں خلوص اور محبت کے سوتے اُبل پڑتے ہیں۔

"ہیپی کرسمس ٹو ہم"۔ یہ منوج بھاردواج کی آواز ہے۔

گلاس ٹکرائے ہیں اور ایک گھونٹ پینے کے بعد وہ ممی کے پاؤں چھو رہا ہے۔

"بہت اچھے سمے آئے ہو کنول"۔ ممی کہہ رہی ہیں۔

رُوپی یہ سب دیکھ کر میرے کمرے میں آ کر بتا رہی ہے اور اس کی سانس پھول رہی ہے۔ اور اب کنول ہاتھ میں وسکی کا گلاس لیے میرے کمرے میں آ گیا ہے اور میں نے آگے بڑھ کر اُسے چُوم لیا ہے۔ سب کے سامنے۔ رُوپی، رما، پروفیسر کے سامنے اور اس کے گلاس سے ایک لمبا گھونٹ بھرا ہے۔

"مائی سینٹا کلاز ہیز کم"۔

اور ایک زور کا قہقہہ گونجا ہے اور ہم سب نے اپنے اپنے گلاس ختم کر ڈالے ہیں۔ رُوپی نے نوکر سے دوبارہ گلاس بھر دینے کو کہا ہے۔

کھانے کے بعد سب لوگ جا رہے ہیں۔

میں اس کے ساتھ کھڑی سب کو بائی بائی کہہ رہی ہوں۔ میں نے منوج بھاردواج کی بچی کے گالوں کو بڑے پیار سے چُوما ہے اور بھاردواج کی نشیلی آنکھوں کو مُسکرا کر دیکھا ہے اور آنے کے لیے شکریہ ادا کیا ہے۔

دھیرے دھیرے سارے مہمان چلے گئے ہیں۔ ڈیڈی اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں، اُنکی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ممی انہیں سنبھال رہی ہیں۔ رما اور پروفیسر بھی سونے چلے گئے ہیں۔ رُوپی نے کنول کا بستر بھی لگوا دیا ہے۔ میں اب اپنے کمرے میں آ گئی ہوں، دروازہ اندر سے بند کر لیا ہے۔ بجلی بجھا دی ہے، بستر پر لیٹ گئی ہوں۔ سر میں سرور کی ہلکی ہلکی لہریں رقص کر رہی ہیں۔ باہر تیز ہوا کے جھونکے کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرا رہے ہیں۔ لگتا ہے آج کی رات آڑو کے پیڑ کے تمام پتے گر جائیں گے۔ کسی شاخ پر ایک بھی زرد پتہ نہ رہ سکے گا۔ اور وہ تمام گرتے ہوئے پتے میرے دل کے بند دروازوں پر دستک دے رہے ہیں۔ جیسے انہیں توڑ ڈالنا چاہتے ہوں۔ میں اپنے دل کے دروازوں میں ٹھونکی ہوئی کیلوں کو ایک ایک کر کے نکال رہی ہوں۔ صبح تک تمام کیلیں نکل جائیں گی اور دل کے دروازے ایک بار

پھر کھل جائیں گے اور مشرق کے جھروکے سے اُبھرتا ہوا سورج میرے احساس کی وادیوں کو اپنی سُنہری کرنوں سے نہلا دے گا۔

دل کے دروازے اتنے مضبوط نہیں کہ کبھی کھل ہی نہ سکیں!

⁂

میری محبُوبہ

بہت برس پہلے کی بات ہے۔
جب وہ اچانک میری زندگی میں داخل ہوگئی تھی۔
میں اُن دنوں اپنے آپ کو بہت ہی غیر محفوظ سچوایشن میں پا رہا تھا۔
کوئی بھی ہتھیار نہیں رہا تھا میرے پاس۔ ایکدم تنہا ہوگیا تھا میں۔ یہاں تک کہ آئی ڈینٹٹی بھی چھن گئی تھی مجھ سے۔ میری شریکِ حیات اچانک مجھے چھوڑ گئی تھی۔ یہ ایک ایسا المناک حادثہ تھا جس کے لیے میں ذہنی طور پر ہرگز تیار نہیں تھا۔ ایکدم مفلُوج ہو کر رہ گیا تھا۔ اس صدمے کو برداشت کرنے میں بہت مدت لگ گئی۔ اور جب میں اپنا، اپنے ماحول کا، اور اپنی زندگی کا گہرائی سے تجزیہ کر چکا تو اپنا پہلا ناول "سیندُور کی راکھ" صرف چار دن میں لکھ ڈالا۔ یہ ایک طرح سے آٹو بایوگرافیکل ناول تھا جس کا ہیرو میں خود تھا اور ہیروئن میری شریکِ حیات، شیلا تھی۔ یہ ناول دراصل میرا اپنا کیتھارسِس تھا جو اُس سمے بہت ضروری تھا۔ اس ناول نے جہاں مجھے شہرت دی وہاں مجھے اپنے آپ کو سمجھنے اور اپنے لیے ایک راستہ تعین کرنے میں میری مدد بھی کی۔ پر مجھے لگا کہ میں بے سہارا بھی بہت ہوگیا تھا۔ بالکل کمزور، خزاں رسیدہ پتے کی طرح، جسے ہوا کا ایک ہی تیز جھونکا ٹہنی سے الگ کر سکتا ہے۔

ایسی حالت اور بھی بہت سے لوگوں کی ہوجاتی ہے جب انھیں اچانک ہی کوئی بہت بڑا حادثہ پیش آجائے۔ جو لوگ زیادہ سینسی ٹیو ہوتے ہیں وہ زیادہ نڈھال ہوجاتے ہیں۔ اُن کے دل و دماغ کی عمارتیں ڈھ جاتی ہیں اور وہ اپنے ہی مکان کے ملبے کے نیچے دب کر سسکتے اور کراہتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی انھیں کھنڈروں کے اس ملبے سے نکال سلے اور اُن کے زخموں کا علاج کرے تو وہ بچ جاتے ہیں ورنہ اپنی ہی دیواروں کے نیچے دب کر دم توڑ دیتے ہیں۔

جو مر جاتے ہیں اُن کا تو معلوم نہیں کیا ہوتا ہے لیکن جو بچ جاتے ہیں ان کی رُوحیں اپنے بچانے والوں کے احسان کے بوجھ تلے دبی رہتی ہیں۔ احسان کا یہ بوجھ کتنی دیر میں اُترتا ہے

یہ بالکل ذاتی معاملہ ہے۔

یہ بوجھ پَل بھر میں بھی اُتر سکتا ہے۔

نہ اُترے تو زندگی بھر نہیں اُترتا۔

میری رُوح پر بھی اُس زمانے میں احسان کا ایک بہت بھاری بوجھ آپڑا تھا۔ مجھے بھی کسی نے ملبے کے ڈھیر سے نکال کر اور اپنے نازک ملایم ہاتھوں سے میری چوٹوں کو سہلا کر اور اپنے کالے سیاہ بالوں کی گھنی چھاؤں دے کر اور اپنی زندگی بخش مسکراہٹوں کا اُجالا پھیلا کر ایک بار پھر زندہ کر ڈالا تھا۔

اور یہ سب اتنی تیزی سے ہُوا تھا کہ اس کے بارے میں نہ میں کچھ سمجھ ہی سکا تھا نہ سوچ ہی سکا تھا۔ وہ کہاں سے آئی تھی؟ اس کا وطن کونسا تھا؟ اس کی روایات کیا تھیں؟ اُس کا حسب نسب کیا تھا؟ کچھ بھی تو معلوم نہیں تھا مجھے۔

مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ اس نے بنا کوئی عہد و پیمان باندھے بغیر مجھ سے پُوچھے میرے گھر میں میرے ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا۔

میں تھا کہ ایکدم خاموش تھا۔

اور وہ تھی کہ لب تک نہ ہلاتی تھی۔

صرف مسکراہٹیں بکھیرتی تھی اور گیسوؤں میں رچی خوشبوئیں لُٹاتی تھی۔

میں نے اُسے جب بھی دیکھا جاگتے ہوئے ہی پایا۔

وہ سوتی کب تھی، مجھے معلوم نہیں۔ وہ رات بھر تو میرا ماتھا سہلاتی رہتی تھی۔

آنکھ بھی کہاں جھپکتی تھی وہ!

بہت مجبور کر کے وہ صبح سویرے مجھے کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر کُھلی ہوا میں گھومنے کو ضرور بھیج دیتی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ جن لوگوں کے دماغوں پر کسی قسم کا بوجھ ہو اُنھیں کُھلی ہوا اور ہلکی سی دُھوپ میں ضرور گھومنا چاہئے۔

ایک دن میں نے ضد کی کہ وہ بھی میرے ساتھ چلے تو اُس نے کہا۔

" اگر میں نے ایک بار تمہارے گھر سے باہر قدم رکھا تو پھر واپس نہیں آؤں گی "

" کیوں ؟ "

" تمہارے ساتھ رہنے کی میری یہی ایک شرط ہے "

" مگر کیوں ہے یہ شرط ؟ "

" بس ہے، مجھے سڑکوں سے، بازاروں سے، اور بھیڑ سے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے تنہائی پسند ہے۔ اور وہ لوگ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ جو ایکدم تنہا ہوں اور بے سہارا ہوں اور ـــ

" اپاہج ہوں " میں نے ٹوک دیا۔

" ہاں ـــ " یہ کہہ کر وہ اتنی زور سے ہنسی تھی کہ میں کانپ گیا تھا۔ پھر اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا اور میں اپنے گھر کے بند دروازے کی دہلیز پر بیٹھا دیر تک روتا رہا تھا۔ کھلی ہوا اور ہلکی دھوپ میں گھومنے نہیں گیا تھا۔ ایکدم اپاہج جو تھا میں۔

کچھ دیر کے بعد جب اس نے دروازہ کھولا تو مجھے دہلیز پر بیٹھے دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔

" ارے تم! "

" یہیں بیٹھے رہے ہو سارا وقت ؟ "

" ہاں "

" گھومنے نہیں گئے "

" نہیں "

" کیوں ؟ "

" اس لیے کہ میں اپاہج ہوں "

" اپاہج نہیں آلکسی ہو۔ کچھ کرنا دھرنا نہیں چاہتے "

وہ ایک بار پھر ہنسی۔ اور جھک کر مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ شاید ابھی ابھی نہا کر آئی تھی۔ اس کے کھلے بال کندھوں پر بکھرے تھے۔ اُس کا بدن کتنا تازہ لگ رہا تھا۔

اور پھر وہ مجھے گھر کے اندر لے آئی اور اپنا تازہ دھلا ٹھنڈا بدن میرے تپتے ہوئے جسم کے ساتھ لگا دیا اور کھلے بال میرے گرم چہرے پر بکھرا دیئے اور پھر اپنے دوج کے چاند

کی طرح مہین ہونٹ میرے ماتھے پر رکھتے ہوئے بولی ۔

" ڈرو مت ۔ اب میں کہیں نہیں جاؤں گی ۔ تمہارے ہی گھر میں رہوں گی ۔"

اس کی بات سُن کر میں نے اپنے ہاتھ اس کے گیسوؤں میں الجھا دیئے اور پھر جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی ۔

مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مجھے صبح صبح گھر سے باہر اس لیئے بھیجتی تھی کہ میری غیر حاضری میں وہ نہا دھو کر ایکدم نکھر جائے اور میں جب لوٹوں تو اُس کی آنکھیں، اُس کے ہونٹ، اور اس کی تمام شخصیت بڑی اُتسکتا سے میرے انتظار میں ہوں ۔

اب تو عادی ہو گیا ہوں اس کے ساتھ رہنے کا ۔

ڈھیروں برس بھی تو گذر گئے ہیں ۔

اب میری رُوح پر اُس کے احسان کا بوجھ بھی نہیں ۔ اپنی مسکراہٹوں سے اُس نے لمحہ لمحہ وہ سارا بوجھ اتار ڈالا ہے ۔ اب وہ مجھے صبح سویرے گھر سے باہر جانے کو بھی نہیں کہتی ۔ اُسے معلوم ہے میں بہت آلکسی ہوں ۔ وہ میری موجودگی میں ہی تیار ہوتی رہتی ہے ۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں آنکھیں بند کیے بستر پر پڑا ہوتا ہوں اور وہ اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ دیتی ہے ۔ میں آنکھیں کھول دیتا ہوں اور وہ کہتی ہے ۔

" کوئی تازہ شعر نہیں سُناؤ گے ؟"

" اپنی کسی نئی کہانی کی کوئی پنکتی نہیں بولو گے ؟"

" اپنے نئے ناول کا عنوان نہیں بتاؤ گے ؟"

" کسی نئے پیار کا ذکر نہیں کرو گے ؟"

میں اُس کے سارے سوال خاموشی سے سُنتا ہوں اور پھر اپنی ہتھیلیوں میں اس کا چہرہ لے کر اُس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوں اور کہتا ہوں ۔

" تمہاری اِن نرمل گہری آنکھوں میں ہی میرے تازہ شعر کے مصرعے گھُلے ہیں، نئی کہانی کی پنکتی انکِت ہے، نئے ناول کا شیر شک درج ہے اور میری تمام محبّتوں کی داستانیں رقم ہیں ۔"

" سچ کہہ رہے ہو ؟"

" ہاں ۔ میں جھُوٹ بول ہی نہیں سکتا ۔ جھُوٹ بولنے کے لیے بہت شکتی چاہیئے ۔"

" جھُوٹ بولنے کے لیے بھی شکتی کی ضرورت ہوتی ہے کیا ؟"

"میں ایسا ہی سوچتا ہوں۔ سینسیٹو لوگ جھوٹ نہیں بول سکتے۔
اسی لیے سولیوں پر لٹکتے ہیں۔"

"سچ بولنا سولی پر لٹکنا ہے کیا؟"

"ہاں۔ اگر سچ بولنا پھولوں کی سیج پر سونا ہو تو سب لوگ سچ ہی بولیں۔ جھوٹ ایکدم مرجائے۔ لیکن جھوٹ مرے گا نہیں۔ بڑا سخت جان ہے ظالم۔"

"ظالم تو تم بھی بہت ہو۔"

"لیکن جھوٹا نہیں ہوں۔"

"اسی لیے تو تمہیں پیار کرتی ہوں۔"

"سچ کہہ رہی ہو؟"

"ہاں۔ جھوٹ میں بھی نہیں بول سکتی۔"

میں اس بات کا گواہ ہوں کہ میری محبوبہ جو اتنے برسوں سے میرے ساتھ رہ رہی ہے اور جس نے آج تک میرے اور اپنے سمبندھوں کو ڈی فائن نہیں کیا ہے۔ ایکدم سچی اور نڈر ہے۔ ایک دن میں نے اس سے کہا۔

"کیا یہ ٹھیک نہیں ہوگا کہ ہم اپنے ریلیشن شپ کو ڈی فائن کر لیں؟"

"نہیں۔ مجھے یہ منظور نہیں۔"

"کوئی وجہ تو بتاؤ۔ آخر تمہیں یہ کیوں منظور نہیں؟"

"مرد دماغ سے پیار کرتا ہے۔ عورت دل سے کرتی ہے۔ مرد چاہتا ہے کہ وہ عورت کو کسی رشتے کی رسی میں باندھ لے اور جب اور جس طرح چاہے اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا پھرے بازاروں میں، کلبوں میں، ہوٹلوں میں۔ مداری کی طرح نچاتا رہے اسے۔"

"یہ غلط ہے؟" میں نے اعتراض کیا۔

"غلط ہے تو اور سنو۔ مرد کے لیے عورت صرف نمائش کی چیز ہے۔ اسے زیورات اور قیمتی کپڑے پہناؤ۔ اسے موتیوں سے سجاؤ، اس کے انگوں کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کرو۔ اس کی مدد سے اپنے پروڈکس کی سیل بڑھاؤ۔ اپنے لیے پروفیشنل فیورز حاصل کرو۔ پھر اسے ایکدم سے بے سہارا اکیلا چھوڑ دو۔"

"یہ تمہارا بھرم ہے" میں نے بڑی تلخی سے کہا۔

" مرد جب ہارنے لگتا ہے تو اپنی آواز میں کڑواہٹ اور تلخی بھر لیتا ہے۔ عورت کو ڈرانے کے لیے وہ سبھی قسم کے حربے استعمال کرتا ہے۔ تم بھی اب ہار رہے ہو اور تمہاری آواز میں بھی غصّہ بھر رہا ہے اس وقت "۔

" نہیں تم پر مجھے کبھی غصّہ نہیں آتا "۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

" غصّہ نہیں تو پھر ترس آتا ہو گا۔ غصّہ اور ترس، یہی تو دو ہتھیار ہیں مرد کے پاس۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ کون سا ہتھیار کب استعمال کرنا چاہیے "۔

"لیکن مجھے تو یہ سب معلوم نہیں"۔

" اسی لیے تو میں اتنے برسوں سے تمہارے ساتھ رہ رہی ہوں "۔

" تو میرا اور تمہارا رِی لیشن شِپ کبھی ڈِی فائن نہیں ہو گا "۔

" ہرگز نہیں۔ جس دن تم نے اس شرط کو توڑنے کی کوشش کی میں اسی دن تمہارا گھر چھوڑ دوں گی "۔

" کہاں جاؤ گی مجھے چھوڑ کر ؟ "

" سمجھدار عورت اس سوال کا جواب کبھی نہیں دیتی، مائی مین "۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اور میری بات کو ٹال گئی۔ خوبصورت عورتیں بات کو بڑی خوبصورتی سے ٹال جاتی ہیں۔

اب میں نے بھی اس موضوع پر بات کرنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ میرے ساتھ کہیں نہیں جاتی۔ میں ساتھ جانے کی ضد کروں تو ناراض ہو جاتی ہے۔ اسی لیے میں بازاروں میں اکیلا گھومتا ہوں۔ فنکشنز میں اکیلا جاتا ہوں۔ پارٹیوں میں بھی میرے ساتھ کوئی نہیں ہوتا۔ سفر بھی اکیلے کرتا ہوں۔ کوئی بھیڑ مجھے قبول نہیں کرتی۔ کوئی ہجوم مجھے نہیں پہچانتا۔ اپنی محبوبہ کی طرح میں بھی بھیڑ کا آدمی نہیں ہوں۔ میں اپنے آپ کو جتنا محفوظ اور پُرسکون اور سُکھی اپنے گھر میں محسوس کرتا ہوں اور کہیں بھی نہیں کرتا۔ میں اپنے گھر میں بادشاہ ہوں۔ گھر سے باہر ایک فقیر۔ ایک ایسا فقیر جو کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔ اُس کے پاس کوئی کشکول نہیں۔ وہ تو بس تماشائے اہلِ کرم دیکھتا ہے۔ کرم کی آرزو نہیں رکھتا۔

ابھی کچھ ہی عرصے پہلے کی بات ہے۔

اُس سال کے مارچ مہینے کی چھ تاریخ تھی۔

راشٹرپتی مجھے "غالب ایوارڈ" دینے والے تھے۔

ایوارڈ کی خبر بھی سب سے پہلے مجھے اُسی نے سُنائی تھی۔

دوستوں کے تار اور خط بھی اُسی نے پڑھ کر سُنائے تھے۔ کمروں کے فرشوں پر الپنا کے رنگ سجائے تھے۔

گھر کے ہر کونے میں تازہ پھول جمع کرتی رہی تھی۔ اور ماحول کو اپنی پیاری اور سنگیت بھری آواز سے نکھار رہی تھی۔

لیکن جب میں نے دلّی چلنے کو کہا تو پل بھر میں اُکھڑ گئی۔

"ایوارڈ تمھیں ملنا ہے، مجھے تو نہیں "۔

"لیکن ملا تو تمہاری وجہ سے ہی ہے۔ تم ساتھ ہوگی تو مجھے بہت اچھا لگے گا"۔

"میری نمائش کروگے ایوارڈ کے ساتھ ؟"

"ایوارڈ کی قدر بڑھ جائے گی تمہاری وجہ سے"۔

"تو میں چل پڑتی ہوں تمہارے ساتھ۔ لیکن پھر واپس نہیں آؤں گی تمہارے گھر —— سوچ لو"۔

بس میں ہار گیا۔ وہ میرے ساتھ نہیں گئی۔ میں اکیلا ہی گیا دِلّی۔ اور ایوارڈ لے کر واپس آگیا۔ اُس ڈنر میں بھی شریک نہیں ہوا جو ایوارڈ پانے والوں کے اعزاز میں دیا جانا تھا۔ آدھی رات کو گھر پہونچا تو وہ سارے گھر کے دروازے کھولے میرا انتظار کر رہی تھی۔ گھر کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور میرا ماتھا چُومنے لگی۔ اور پھر مجھے لگا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

"تم رو رہی ہو ؟"

"ارے نہیں"۔ یہ کہہ کر وہ مُسکرائی اور میری قمیض کے بازو سے ہی اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ میرے پاؤں چُھو رہی تھی۔

وہ جو میری محبوبہ ہے اور برسوں سے میرے ساتھ رہ رہی ہے اور جس کی شرط یہ ہے کہ ہم اپنے سمبندھوں کو کوئی نام نہ دیں۔

اُس نے آج بھی میرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا۔ میں نے بہت منّت کی ہے۔ وہ نہیں مانی۔ کہنے لگی۔

"میں تمہارا جشن اپنے گھر میں مناؤں گی۔ تمہارے واپس آنے تک سب تیاری کر رکھوں گی۔ اصلی جشن تو تب ہوگا جب تم لوٹو گے۔"

"میرے اس جشن میں تو اپنے دوست ہی ہوں گے۔ تمہیں بہت سوں کے تو نام بھی نہیں معلوم۔ ساتھ چلو گی تو ٹھیک رہے گا۔ سب خوش ہوں گے۔

"جب لوگ تمہارے گلے میں ہار ڈالیں گے تو مجھے لگے گا کہ وہ سب میرا حق چھین رہے ہیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے میرا حق چھنواؤ گے؟"

"نہیں۔"

"تو اکیلے ہی جاؤ گے۔ جلدی جاؤ دیر سے جاؤ گے تو تمہارے دوست بُرا مانیں گے۔ اپنے دوستوں کی عزت کرو تاکہ تمہاری عزت اور بڑھے۔ جو آدمی اپنے دوستوں کی عزّت نہیں کرتا وہ کبھی بڑا آدمی نہیں بن سکتا۔"

یہ کہہ کر وہ بہت کُھل کر مسکرائی اور جب تک میں رکشا میں نہیں بیٹھ گیا وہ باہر کھڑی ویو کرتی رہی۔

گھر سے باہر نکلنے لگا تو اس نے کہا تھا۔

"اگر کچھ دوست تمہارے ساتھ آنا چاہیں تو اُنھیں ضرور ساتھ لے آنا۔ میں جشن کا پُورا انتظام رکھوں گی۔"

میں نے ہال میں داخل ہونے سے پہلے چار رکشا والوں کو ایڈوانس کرایہ دے دیا ہے۔ اور ساتھ میں ٹِپ بھی دے دی ہے۔ ہوسکتا ہے میرے کچھ مہربان دوست جشن کے بعد میرے گھر چلنے کو تیار ہو جائیں کہ میری محبوبہ آج اُن کے ساتھ میرا جشن گھر میں بھی منانا چاہتی ہے۔ اور یہ بات میرے گھر میں پہلی بار ہو رہی ہے۔ جس پر مجھے حیرت بھی ہے اور بے حد خوشی بھی!۔ میری محبوبہ آج واقعی بہت خوش ہے۔

ہر کہانی کا ایک کلائمکس ہوتا ہے۔

کوئی کہانی بِنا کلائمکس کے نہیں ہوتی۔

اس کہانی کا بھی ایک کلائمکس ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ آپ سب میری محبُوبہ کا نام جاننا چاہتے ہیں۔

اُس نے مجھے ہمیشہ تاکید کی ہے کہ میں کسی کو کبھی اس کا نام نہ بتاؤں۔ چاہے وہ کتنا ہی عزیز دوست ہو۔ لیکن آج چونکہ وہ بہت خوش ہے اور بڑی مہربان ہے اس لیے میں اُس کا نام بتادینے کا رِسک لے رہا ہوں۔

میری محبُوبہ کا نام ہے

پریرنا !!

جن لوگوں کو میری کہانی پسند آئی اُن کا شُکریہ

جنھیں پسند تو آئی لیکن زیادہ سمجھ نہیں آئی۔ اُنھیں ایک مشورہ دے رہا ہوں۔

اِس وِشیہ میں ادھک جانکاری پراپت کرنے کے لیے

کرپیہ اپنی پتنیوں سے سمپرک ستھاپِت کریں۔ !!

آتم کتھا

"ارے اندھا ہے تو۔ سیدھا رسوئی گھر میں گھسا آتا ہے"۔ اونچی ذات کے ایک فوجی سپاہی نے آنکھوں میں ذات پات کی نفرت کی تُند آگ لہراتے ہوئے کہا۔

"ذات کے بھرشٹ ہو جانے کا اتنا خیال ہے تو وہ کارتوس کیوں استعمال کرتے ہو، برہمن دیوتا؟"

نیچی ذات کے دوسرے سپاہی نے طنزاً جواب دیا۔

"کونسے کارتوس؟"

"وہی جو استعمال کرنے سے پہلے تمہیں زبان سے چکنے کرنے پڑتے ہیں"۔

"کیا بُرائی ہے اُن میں؟" اونچی ذات کے سپاہی کا ماتھا سلوٹوں سے ٹکڑ گیا تھا۔

"اُن میں گائے اور سُور کی چربی ہے مہاراج"۔

"ہیں!!" اُس کی آنکھوں میں لپکے ہوئے شعلے آگ کا طوفان بن گئے۔

اُسی شام فوجی چھاونی میں تین انگریز افسر قتل کر دیئے گئے۔ اور دوسری صبح تمام فوج کے سامنے اونچی ذات کے اُس سپاہی کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ خون کی کچھ بُوندیں خاک پر گریں اور مئی کی دھوپ سے جُھلسی ہوئی خاک انھیں جذب کر گئی۔

یہ تھا میرا جنم۔

خون کی چند بوندیں، نفرت کی آگ، سامراجی دباؤ۔

۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ چھاونی میں کچھ اور سپاہیوں نے چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا اور انھیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ دوسرے دن تمام ہندوستانی فوج نے جیل پر حملہ کیا، اپنے ساتھیوں کو چھڑایا اور انگریز افسروں کو قتل کر دیا۔ خاندانِ مغلیہ کی عظیم

عمارت کا جواب ڈھ گئی تھی ۔ ایک شکستہ ستون ابھی تک دہلی میں موجود تھا۔ جنتا نے پھر اس ستون کو سہارا دے کر کھڑا کرنا چاہا اور اُس کی مرضی کے خلاف اس پر نئی چھت کا بوجھ ڈال دیا۔ ایک بوڑھے، شکستہ دل اور کمزور انسان کی گود میں مجھے لِٹا دیا گیا۔ اُس کی تھپکیوں میں پیار تھا، ہمدردی تھی، لیکن زندگی کی حرارت نہ تھی ۔ اُس لمس میں برقی رَو دَوڑا دینے والی طاقت موجود نہ تھی ۔ اُس میں ایک کپکپی تھی جو خوف اور ضعف کی ترجمان تھی ۔

دہلی کے تخت پر ایک بار پھر ایک ہندوستانی شہنشاہ جلوہ افروز ہوا۔ لیکن جانے کیوں اس کی آنکھوں میں تمکنت اور جلال نہ تھا، ایک گہری افسردگی اور یاس کی جھلک تھی ۔

لکشمی بائی کو جھانسی کے تخت کے لیے متبنٰے بنانے کی اجازت نہ دی گئی ۔ وہ عورت تھی، ماں تھی، اُس کے اندر تخلیق کا جذبہ تھا۔ اُس نے مجھے بہادر شاہ کی گود سے لے کر اپنی گود میں ڈال لیا ۔ اُسے ایک بچّے کی ضرورت تھی ۔ اُس نے جب پیار سے میرا مُنہ چوما تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے مجھے بے پناہ قوتِ پرواز بخش دی تھی ۔ جب اُس نے مجھے اپنے صحت مند اور جوان سینے سے چمٹایا تو میرے اندر جیسے ایک طوفان سا جاگ اٹھا اور میں نے محسوس کیا کہ مجھے آگے بڑھنے کے لیے ارتقاء کی مختلف منزلوں سے گذرنا پڑے گا ۔ میں ایک ہی جست لگا کر ہمالہ کی چوٹیوں کو چھُولوں گا۔

کتنا فرق تھا بہادر شاہ کی شفقت اور لکشمی بائی کے پیار میں !

میں سامراج کی کوکھ سے پیدا ہوئی اور ہندو اور مسلمان دو بھائیوں نے مل کر میری پرورش کا جتن کیا۔ خون کی بوندیں طوفان بنیں ، نفرت کی آگ نے شعلے اُگلے اور پھر سامراجی دباؤ حرکت میں آیا ۔ تیمور اور نادر شاہ کے ظلموں کی روایات کو گہنا دیا گیا ۔ وہ تیس دن جن میں دہلی کو لوٹا گیا اور بچّے ، جوان اور بوڑھے کا امتیاز کیے بغیر قتلِ عام کیا گیا ۔ تیمور اور نادر شاہ کے مظالم پر چھا گئے ۔ صرف ایک شئے اُبھرتی ہوئی نظر آئی ۔ سات سمندر پار رہنے والا بدیشی ، جو یہاں تجارت کرنے آیا تھا ، جس نے اپنے تجربہ کے بعد ہر فرد ، ہر قوم اور ہر ملک کی ایک قیمت مقرر کر دی تھی ۔ اُس نے یہ قیمت ادا کر کے جسے چاہا خرید لیا ۔ وہ بِکی ہوئی قوم کو دیکھ کر غرور اور تکبّر سے مُسکرا دیا ۔

وہ مُسکراتا رہا اور دہلی میں ، کانپور میں ، لکھنؤ میں ، ہندو کا خون ہندو اور مسلمان کا خون مسلمان بہاتا رہا ۔

اور ایک صبح جب ایک جانباز مجھے کاندھے پر اُٹھاکر گوالیار کے قلعہ سے باہر لے آیا تو میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ مردانہ لباس میں چوڑیاں پہنے مری پڑی تھی لکشمی بائی، جھانسی کی رانی، میری ماں، رات وہ مجھے قلعے کے اندر سُلاکر خود دشمن سے لڑنے چلی آئی تھی۔ مجھے اب بھی یاد ہے اُس کا وہ آخری پیار۔ اُس میں کتنی محبت، کتنی جلن اور کتنی سختی تھی! اور اب وہ میرے سامنے مری پڑی تھی۔ مجھے پرواز، عزم، اور زندگی دینے والی ہستی خود ان سے محروم ہو چکی تھی۔

دوسرے روز میں نے سُنا کہ اس بُوڑھے، ہمدرد مغل بادشاہ کو جس نے سب سے پہلے مجھے محبت اور پیار سے چوما تھا۔ ہندوستان سے دُور، سمندر پار قید کی حبس اور گھُٹن میں سڑنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ شاید اُسے شروع ہی سے اپنے اس انجام کا احساس تھا۔ جبھی تو فتح کے روز بھی اُس کی آنکھوں میں افسردگی اور یاس کی جھلک تھی۔

۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک دنیا کی مہذّب قومیں حیوانوں کی طرح آپس میں لڑیں۔ اقتدار اور تجارتی منڈیوں کے حصُول کے لیے تمام ملکوں نے مِل کر انسانیت کو خون کے سمندر میں دھکیل دیا۔ سُرخ کھال والا وہ بیوپاری اب ایک معمولی دکاندار سے ایک جابر حاکم بن چکا تھا۔ ہندوستان اب مُغلوں، مرہٹوں اور سکھوں کا نہیں تھا۔ بہادر شاہ، تانتیا ٹوپے اور لکشمی بائی کو سب بھُول چکے تھے۔ ان کے نام لیوا اب بدیشی قوموں کے علمبردار تھے۔ حاکم کو میدانِ جنگ میں توپوں کے سامنے کھڑا کرنے کے لیے سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ وہ اپنی دھرتی کے پیارے بیٹوں کو یوں مروانا نہ چاہتا تھا۔ اُس کی نظرِ انتخاب ہندوستان پر پڑی۔ اُس نے پنجاب کے زرخیز میدانوں میں ہَل چلاتے ہوئے کسانوں کو ٹٹولا، اُس نے پڑھے لکھے بے روزگار نوجوانوں کی طرف بھی نگاہ دوڑائی اور پل بھر میں دو لاکھ سے زیادہ سپوت سب سے پہلے آگ میں کودنے کو صف آرا ہو گئے۔ اُن کی ماں انھیں اس حالت میں دیکھ کر رو پڑی۔ اپنے گرد لپٹی زنجیریں اسے زیادہ مضبوط لگنے لگیں۔ اُس نے انھیں کپُوت کہہ کر دل کو تسکین دے لی اور اِن کپُوتوں نے سُرخ کھال والے حاکم کو ہارنے سے بچا لیا۔ انھوں نے اپنا خون اپنے ملک کے لیے نہیں غیر ممالک کی سرزمین پر غیر ملک کے لیے بہایا اور اُسے موت کے اندھے غار سے باہر کھینچ لیا۔

میری بڑھوتی اجنبیوں کو پسند نہ آ رہی تھی۔ وہ یہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ لکشمی بائی کی گود لی ہوئی لڑکی پروان چڑھے اور ایک دن سارے ہندوستان کی دعویدار بن جائے۔ انھوں نے میری عمر کے دھارے میں بند باندھنے چاہے اور تمام اُن لوگوں کو جو میرا بھلا چاہتے تھے باغی

قرار دے دیا۔ انھوں نے سُلگتے ہوئے ہونٹوں کو آگ میں سُرخ کی ہوئی سوئیوں سے سی دیا۔ میرے سرپرستوں نے اُن کی اس حرکت کو میری ترقی کے لیے غیر موزوں اور اپنے لیے شرمناک سمجھا۔ انھوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی جو پانچ دریاؤں کی سرزمین میں گونجی اور اسے دبانے اور کچلنے کا کام سنگینوں، بندوقوں اور توپوں کے حوالے کر دیا گیا۔ دبانے سے یہ آگ اور بھڑکی اور پانچ دریاؤں کے گیت سننے والے ہندو اور مسلمان، سونا اُگلنے والے کھیتوں کے رکھوالے ایک بے آسرا بچی کو بچانے کے لیے چار دیواری سے گھرے ایک میدان میں اکٹھے ہو گئے۔

جلیانوالہ باغ میں ہزاروں لوگ جمع تھے۔ وہ سب میری خاطر جان دینے آئے تھے میں نے اپنی توتلی زبان میں اُن سے کہا: "تم چلے جاؤ، اپنے بچّوں کو سنبھالو، اپنی بیویوں کے سہاگ بچاؤ۔ اپنی جوان فصلوں کی دیکھ بھال کرو، ایک بے آسرا بچّی کی خاطر خود کو کیوں خطرے میں ڈال رہے ہو—؟" لیکن وہ نہ مانے۔ انھوں نے میرے چہرے سے میرے خوف کا اندازہ کر لیا اور مجھے چُوم کر منچ پر اونچا کھڑا کر دیا۔ میں نے آس پاس کے مکانوں کی چھتوں پر کھڑی عورتوں کو سینوں سے اپنے بچوں کو چمٹائے ہوئے دیکھا اور ان کے دلوں کی دھڑکن کو محسوس کیا۔ کتنی تیز تھی اُن کی دھڑکن! مجھے وہ رات یاد آ گئی جب لکشمی بائی پیار سے چُوم کر مجھے قلعے کے اندر سُلا گئی تھی۔ میں نے پھر اُن سے کہا۔

"تمہارے بچّے تمھیں بُلا رہے ہیں، تمہاری بیویاں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں، میرے لیے نہ مرو۔"

"ہم تمہاری رکھشا کے لیے ملک کے لاکھوں بچّوں کا خون دے سکتے ہیں، ہزاروں عورتوں کا سہاگ لُٹا سکتے ہیں، سینکڑوں بہنوں سے ان کے بھائی چھنوا سکتے ہیں۔ تم ہماری بچی ہو، بہن ہو۔" وہ گرجے۔

اور پھر مشین گنوں کے دہانے کُھل گئے۔

مجھے گود میں لیے ایک نوجوان ابھی تک مضبوطی سے وہیں کھڑا تھا۔

میں پھر چیخی "لوگو چلے جاؤ"۔

اور کچھ لوگ سامنے کی دیوار کو پھاندنے لگے، موت سے ٹکرانے لگے، زندگی کی خون آلود حدوں میں داخل ہونے لگے۔ گولیاں برس رہی تھیں۔

لوگوں نے میری توتلی زبان کو نہ سمجھا۔ ہندو مسلمان دونوں نے میری بات ٹال دی۔ پنجاب

کے باسی بھرے ہوئے تھے۔ جیسے ابھی ابھی وہ کسی میدانِ جنگ میں جا رہے ہوں۔ مگر بیشتر لوگ شانت اور گمبھیر تھے۔ ایک طویل عبارت پر بحث ہو رہی تھی۔ مجھے اس کا مطلب واضح طور پر تو سمجھ نہ آرہا تھا لیکن میں اتنا ضرور محسوس کر رہی تھی کہ سُرخ کھال والے حاکم کو زوردار آواز میں ہندوستان سے نکل جانے کو کہا جا رہا تھا۔ بات کچھ اس طرح سے تھی۔

یورپ نے ایک بار پھر انسانیت کی لاش کو گِدھوں کی طرح نوچنا شروع کر دیا تھا۔ ہر بدیشی قوم دوسری قوم پر کاری ضرب لگانے کی کوشش میں تھی۔ پچھلی جنگ میں کچلا ہوا جرمنی اب بپھر گیا تھا۔ اب وہ تمام یورپ کو نگلنا چاہتا تھا۔ کھلونے اور پُرزے بنانے والا جاپان اپنے پڑوسی ملک چین کو تباہ کر کے ہندوستان پر قابض ہونے کا خواہش مند تھا۔ سنگاپور اور برما کو لتاڑ کر اب ہندوستان کے کواڑ توڑنے کی سوچ میں تھا وہ اور پردیس گئے ہوئے ہندوستانی پناہ لینے کے لیے پھر اپنی ماں کے پھٹے آنچل کی طرف دوڑ رہے تھے اور ان کی ماں اپنا آنچل ان سب پر ڈال کر انہیں تسلی دے رہی تھی۔ اور آنچل کے شگافوں میں سے آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرتے ہوئے بم برسانے والے ہوائی جہاز نظر آتے تھے اور ماں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ انگریز اس ملک کے نوجوانوں کو ایک بار پھر جرمنی اور جاپان کی توپوں کے سامنے دیوار کی شکل میں کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن دیوار مکمل ہونے میں نہ آتی تھی۔ کچھ اینٹیں اسے دستیاب بھی ہو گئی تھیں لیکن دیوار نہ بن سکی تھی، کیونکہ وطن پرستوں کا ایک گروہ اس پر مسلسل ضربیں لگا رہا تھا، اسے ڈھا رہا تھا اور اپنے ہاتھ پاؤں زخمی کر رہا تھا۔ انھوں نے غلاموں کی حیثیت سے جنگ میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا ہم غلاموں کی حیثیت سے انسانیت کو بچانے کے لیے لڑنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ غلام کی قربانی مذہبی اصولوں کے مطابق بھی لاحاصل ہے۔ تم ہمیں اس جنگ میں ایک آزاد ملک کی طرح حصہ لینے دو پھر دیکھنا کہ ہم صرف اپنے ہی ملک کی نہیں تمام دنیا کی حفاظت کر سکتے ہیں، مرتی ہوئی انسانیت کو بچا سکتے ہیں، تہذیب کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو کنارے پر لگا سکتے ہیں لیکن وہ نہ مانا۔ اُس نے ایسی باتیں کرنے والوں کی زبانیں کاٹ دیں، اس طرح کی باتیں سوچنے والوں کے دماغ سلب کر دیئے، اُس نے انسانیت کا مستقبل تاریک کر دیا۔ اور آج ایسے ہی شکستہ انسان اور امن پسند شخصیتیں ایک جگہ جمع ہو کر میرے مستقبل کا فیصلہ کرنے والی تھیں۔ وہ ہر قیمت پر مجھے بچانا چاہتی تھیں۔ اس طویل عبارت کا آخری حصہ پڑھایا جا رہا تھا۔ سب کی آنکھیں مجھ پر جمی تھیں

" محب الوطنوں کا یہ گروہ جنتا کو سامراجی سرکار سے ٹکر لینے سے اب باز نہیں رکھ سکتا جو اُسے خود اپنے اور انسانیت کے مفاد کے لیے کچھ بھی کرنے سے روکتی ہے۔ ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ جنتا اپنی آزادی کے لیے اجتماعی جدوجہد شروع کر دے "

اور میں حیرت بھری نظروں سے پڑھنے والے کو گھور رہی تھی۔ آج جانے کس طرح میرے بوڑھے سرپرست کے ہنستے ہوئے چہرے پر سنجیدگی اور کٹھورتا کے نقش اُبھر رہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ پتھر کا ایک بُت تھا جس نے ایکدم احساس کی قوت کھو دی تھی، جس نے میرے طفلانہ جذبات کو ایک لمحہ میں نظر انداز کر دیا تھا۔ میں نے اس خیال کے مدِنظر اس کے ننگے جسم کو چھُوا۔ دو آنکھیں میرے معصوم چہرے پر جم گئیں اور پتھر کا بنا ہوا چہرہ پھُول کی طرح کھِل اٹھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور پھر اچانک ہی لرزتے ہوئے ہاتھوں نے مجھے گلے سے لگالیا۔

دوسری صبح میرے سرپرستوں کو مجھ سے چھین لیا گیا۔ میں نے ان کے دامنوں سے چمٹنے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے شگفتہ چہروں سے ملائمت کے ساتھ، اپنے دامن چھڑا لیے اور خود انجانی جگہوں پر چلے گئے۔ میں دیر تک ایک سنسان جگہ پر کھڑی روتی رہی۔ مجھے اپنی بدقسمتی کا خیال آرہا تھا۔ میں شروع ہی سے ایسی مصیبتیں دیکھتی آرہی تھی جس شخص نے بھی مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھا، پُچکارا، میری حالت پر ترس کھایا۔ وہی حادثات کی چٹان سے ٹکرا گیا۔ اور میں سوچ رہی تھی اپنے بوڑھے سرپرست کے متعلق، جسے میں نے ناحق اپنی توتلی زبان سے موہت کر کے آخری عمر میں مصیبت میں ڈال دیا تھا۔

میں سوچ میں غرق تھی اور لوگوں کا ایک گروہ ترنگا اٹھائے زور زور سے نعرے لگاتا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس میں طوفان کا سا جوش اور جوالا مُکھی کی سی گرمی تھی۔ میں گھبرا گئی۔ جھنڈا اٹھانے والی ایک نوجوان عورت تھی۔ اس نے مجھے اس سنسان جگہ سے اُٹھا کر چھاتی سے لگالیا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے اپنی ماں یاد آگئی۔ اس کے چہرے پر گہرے عزم کی چھاپ اور آواز میں تاثیر تھی۔ وہ سب سے آگے تھی اور ہجوم نعرے لگاتا اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ سب اس لیے ناراض تھے کہ انگریز حاکم نے میرے سرپرستوں کو مجھ سے ایسے وقت میں چھین لیا تھا۔ جب میں بے بس تھی۔ جب مجھے بچانے والا کوئی نہیں تھا جب ہندوستان کے دروازے پر اجنبی فوجیں کھڑی تھیں اور اُن کی خون آلود نگاہیں مجھ پر جمی تھیں اور اُن نگاہوں میں اُس خون کی سرخی تھی جو اُن کی تلواروں نے اب تک بہایا تھا۔ لوگ اس غصّے کی ترجمانی کر رہے

تھے۔ جو شاید چلّا چلّا کر اور دُھوپ میں گُھوم کر سرد پڑ جاتا، تھک جاتا، مرجاتا۔ اچانک ہمارے سامنے ایک دیوار سی اُبھری، رینگی اور پھر ایکدم تیزی سے ہماری طرف بڑھی۔ میں ڈر گئی۔

"جھنڈے کو نیچا کر دو" آواز میں بموں کی گونج اور تلواروں کی جھنکار تھی۔

"ہرگز نہیں"! میں نے ہجوم کی گونج دار اور چٹان کی طرح مضبوط آواز خلا میں اُبھرتی محسوس کی۔

"اس بچے کو نیچے پٹک دو اور تم آگے بڑھ جاؤ" میں نے یہ سُنا اور عورت کے کاندھے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میرا دل خوف سے ڈرنے لگا اور عورت کا ہاتھ میرے گرد مضبوطی سے جم گیا۔ فضا خاموش تھی۔ ہجوم چٹان کی طرح جما تھا۔

جواب کا انتظار کیا جا رہا تھا۔

ایک جواب اُبھرا۔

"یہ بچّی میرے جیتے جی سینے سے الگ نہیں کی جاسکتی"

میں نے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں ڈال دیئے۔ ہجوم میں ایک ہلکا سا ارتعاش رینگا۔ سامنے کی دیوار تیزی سے آگے بڑھی۔

"تو تمہیں مار کر اسے سینے سے الگ کیا جائے گا" سُرخ کھال والا ایک آدمی آگے آیا۔ اور پیشتر اس کے کہ میں اس عورت سے کچھ کہتی، اُسے اپنی جان خطرے میں ڈالنے سے روکتی۔ گولی کی آواز گونجی اور عورت میرے سمیت سڑک پر آگری۔ ہجوم آگے بڑھا، دیوار آگے سرکی۔ دونوں آپس میں ٹکرا گئے اور مجھے جلیانوالہ باغ کا قتلِ عام یاد آگیا۔

میں نے اس مُردہ عورت کا منہ چُوم لیا۔ اس کے ہاتھ میں وطن کا جھنڈا ابھی تک مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور اس کے سینے سے خون اُبل رہا تھا، اُس کی کلائیوں میں پڑی چُوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ شاید ایک بار پھر لکشمی بائی میری حفاظت کو آئی تھی۔

اور پھر فاقہ کش کسان جن کی میراث تھی محنت اور بُھوک بُھوکا پیٹ لیکن تیکھا عزم لیے سامنے آگئے۔ انھوں نے ڈاک گھروں کو پھونک دیا، ریلوے اسٹیشنوں میں آگ لگادی، ریل کی پٹریاں اُکھیڑ ڈالیں۔ کیونکہ یہ سب چیزیں انھیں اس بدیسی کی یاد دلاتی تھیں جو ایک عرصہ سے انھیں کچل رہا تھا۔ جو اُن کی مرضی کے خلاف ان پر حکومت کر رہا تھا۔ اور پھر سر پہ کفن باندھے بُھوکے باہمت لوگوں نے ایکدم مجھے اپنے کاندھوں پر اُٹھالیا اور مُلک کے ایک کونے سے

دوسرے کونے تک گھومے اور خون سے لتھڑا ہوا وہ جھنڈا۔ جو مُردہ عورت کے ہاتھ میں تھا ہر جگہ لہرایا۔ اُن پر ہوائی جہازوں سے بم پھینکے گئے، اشک آور گیس چھوڑی گئی، انھیں گولیوں سے چھیدا گیا۔ اُن کے ننگے جسموں پر کوڑے لگائے گئے لیکن سرفروشی کا اُمڈا ہوا جذبہ پھر بھی ختم نہ ہوا۔

بہادر شاہ کی رُوح میں کچوکے دینے والا دھڑکا ایک بار پھر لوٹ آیا۔ اُس نے اپنے ہم وطنوں کی جو خامیاں دیکھی تھیں اُن کا بدیسی حاکم نے ایک بار پھر فائدہ اٹھایا۔ جہاں بدیسی سپاہیوں نے ہندوستانیوں کا خون بہایا وہاں ہندوستانیوں نے بھی اپنے بھائیوں کو کچلنے میں اُن کی مدد کی اور جب آزادی کی یہ جنگ فتح کے میناروں کو چھُو رہی تھی، جب غریب کسانوں مِل مجوروں اور بھوکے ہڑتالیوں نے خون سے لتھڑا ہوا ترنگا لال قلعہ کی دیواروں تک اونچا اُٹھا دیا تھا تو اُنہی کے بھائیوں نے آگے بڑھ کر نہایت سفاکی سے اُن کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔

وہ اس آخری حملے میں شامل نہ ہوئے جو فیصلہ کن ثابت ہونے والا تھا۔

گھروں کو جلا گیا، لاکھوں روپیہ جرمانہ کیا گیا اور بے دردی سے اتنی بڑی رقم کی وصولی کی گئی۔

کسانوں اور مزدوروں کا خواب ٹُوٹ گیا۔

تشدّد کا دیو ننگا ناچنے لگا۔

انگریز کی حکومت مستحکم طور پر قائم ہو گئی۔

اور لال قلعہ کی دیواریں نراش ہو گئیں۔

میں ایک بار پھر بے یار و مددگار بیواؤں کی چیخوں، یتیموں کی سسکیوں اور زخمیوں کی کراہوں میں دب گئی اور یہ بوجھ بڑھتا ہی گیا۔

جاپانی طیارے چٹا گانگ اور کلکتہ پر بم برساتے رہے اور بنگال کے کھیتوں میں قحط پرورش پاتا رہا۔ دوشیزاؤں کی عصمت لُٹتی رہی اور گلیوں اور بازاروں میں لاشوں کو گدھ نوچتے رہے۔

میں نے ماتاؤں کو اپنی بچیاں مٹھی بھر چاولوں کے عوض بیچتے ہوئے دیکھا۔ میں نے دوشیزاؤں کو ایک لقمے کی خاطر عصمت لٹاتے دیکھا۔ میں نے مردہ عورتوں کی چھاتیوں کے ساتھ چمٹے بھوک سے نڈھال بچّوں کو دیکھا اور میری نگاہیں ناچ گھروں میں ناچتے بے شرم ہندوستانیوں پر بھی پڑیں۔ میں نے گھوڑ دوڑوں میں تالیاں بجانے والے ہندوؤں اور مسلمانوں پر بھی نظر

دوڑائی۔

میں نے اپنی آنکھیں دُکھ اور شرم سے جُھکا لیں۔ انسانیت سے افسردہ ہوکر اپنا سر نیچا کرلیا۔ دیوتاؤں نے مایوس ہوکر اپنی آنکھیں میچ لیں۔

سڑتی ہوئی انسانی لاشوں کے بڑے انبار پر کھڑا پردیسی، سات سمندر پار رہنے والے اپنے ہم وطنوں کو جانے کس زبان میں ہنس ہنس کر اشارے کر رہا تھا۔

اب میں سیانی ہوگئی تھی۔ کئی روز سے میرے بھائی میرے بیاہ کی فکر میں تھے۔ ایک ہندوستانی بچی جوان ہوکر اپنے گھر میں نہیں رہ سکتی۔ وہی آنگن جو اس کے نغموں اور قہقہوں سے گونجتا ہے۔ آخر اس کے لیے جہنم کا الاؤ بن جاتا ہے۔ وہی دیواریں جن پر وہ چنبیلی کی بیل کی طرح چڑھتی ہے، آخر اُسے کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔ اُس کے گھر والے ہر لمحہ اُسے گھر سے نکالنے کے منصوبے باندھتے رہتے ہیں۔ اور جب تک وہ نکل نہیں جاتی اُن کی بھویں تنی رہتی ہیں۔ ان کی آنکھیں شعلے اُگلتی رہتی ہیں —— بہت سوچ بچار کے بعد ۵ اراگست ۱۹۴۷ء میرے بیاہ کی تاریخ مقرر کی گئی۔ اس کے لیے شاندار منڈپ بنایا گیا۔ دونوں بھائی اپنی بساط سے بڑھ کر اس کے لیے تیاری کرنے لگے۔ ہر بھائی اپنی بہن کے لیے زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا چاہتا تھا۔ بیاہ کی تاریخ آگئی۔

میرے ہاتھوں میں مہندی لگائی گئی۔ میری مانگ میں سیندور بھرا گیا، میری کلائیوں میں ہیرے کی چوڑیاں پہنائی گئیں، میرے جسم پر ریشمی ساڑھی لپیٹی گئی۔ دُور دُور سے سہیلیاں میری شادی میں آئی تھیں۔ اب تک تو میری ایک بھی سہیلی نہ تھی۔ اب جانے اتنی سہیلیاں کہاں سے آئی تھیں اور وہ سب غائبانہ طور پر مجھے بچپن سے ہی جانتی تھیں۔ میں اُن کی باتوں پر حیران تھی مگر وہ سب خوش تھیں، میں بھی خوش تھی۔ اور جب ایک بار میں نے اپنی شکل آئینے میں دیکھی تو شرما کر رہ گئی۔ سب نے میرا رُوپ دیکھا اور انگلیاں دانتوں میں داب لیں۔

اور میں نے کونے میں سے ابھرتی ہوئی ایک نحیف سی آواز سُنی۔

"کہیں نظر نہ لگا دینا میری لاڈلی کو۔"

اور میری سبھی سہیلیاں آپس میں کھسر پھسر کرنے لگیں۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکی، میں نے

سمجھنے کی زیادہ کوشش بھی نہ کی۔ میری توجہ صرف اپنی ذات کی طرف تھی۔ ایک یتیم لڑکی جو در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد ایکدم ایک شہزادی میں بدل گئی تھی۔ میں اب اپنے ماضی اور مستقبل دونوں سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ صرف چوندھیانے دینے والا حال میرے سامنے تھا۔

میں نے ایک بار پھر آئینے کی طرف دیکھا اور میرے جسم میں ایک برقی رَو سی دوڑ گئی۔ گیت گائے جا رہے تھے۔ نغمے گونج رہے تھے۔ منڈپ سجا ہوا تھا اور دونوں بھائی نہایت انہماک سے الگ الگ کمروں میں ایک دوسرے سے سبقت لینے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اچانک ایک شور سا اُبھرا۔ کونے میں بیٹھی ہوئی بُڑھیا ذرا آگے سرک آئی۔

دونوں بھائی آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ میں نے اکثر انھیں اس طرح جھگڑتے دیکھا تھا۔ لیکن آج اُن کے تیور ہی اور تھے۔ آج اُن کی زبان میں اتنی تلخی جانے کہاں سے آ گئی تھی۔ میں اپنے آپ کو کوسنے لگی۔ میں پیدا ہی کیوں ہوئی، مجھے آخری مغل بادشاہ نے لرزتے ہونٹوں سے کیوں چوما، مجھے ایک بے اولاد مرہٹہ عورت نے کیوں اپنا متبنٰی بنایا۔ اُس بوڑھے سنیاسی نے کیوں مجھے اپنی کُٹیا میں جگہ دی۔ مجھے پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مار ڈالا گیا۔ مجھے کیوں جوان ہونے دیا اور پھر بیاہ کی تیاریاں کیوں کی گئیں۔ عورتیں، بغیر بیاہ کے بھی تو زندہ رہ سکتی ہیں شادی زندگی کی اتنی ضروری شے تو نہیں کہ نظر انداز نہ ہو سکتی ہو۔ میں نے چاہا کہ بلند آواز میں کہوں۔

"میں شادی نہیں کروں گی، تم اُن سے کہہ دو ہماری بہن نہیں مانتی۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ تم آپس میں اس طرح لڑو۔ میں تمام عمر کنواری رہ سکتی ہوں۔ ہمارے ملک میں ایسی روایات بھی تو ہیں"۔

"تُو کیوں بیچ میں بول کر تمام جھگڑے کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہے۔ خاموش رہ"۔

میں خاموش رہی اور خوف زدہ آنکھوں سے انھیں جھگڑتے ہوئے دیکھتی رہی اور کونے میں بیٹھی بُڑھیا اور آگے سرک آئی۔

"بٹوارہ ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔ روز روز کا جھگڑا مٹے" چھوٹا بھائی کہہ رہا تھا۔

"بہن کی شادی ہو جائے پھر الگ ہو جانا۔ اس وقت یہ بات شوبھا نہیں دیتی، لوگ کیا کہیں گے"۔ بڑے بھائی نے کہا۔

"لوگ اندھے نہیں ہیں۔ بیاہ میں خرچ ہو تو سب کچھ میرا اور نام تمہارا ہو"۔

"تم کہہ دو بھیا نام بھی تمہارا ہی ہوگا، تم جھگڑو مت۔ آج جانے چھوٹے بھائی کو کیا

ہو گیا ہے۔"

میں نے یہ کہنے کو زبان کھولی ہی تھی کہ ایک سہیلی چیخ اٹھی۔

" تو ہو جانے دو بٹوارہ ——— کیا حرج ہے اس میں۔ آخر سبھی گھروں میں ایسا ہوتا ہے"
میں نے آگ بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ کونے والی بڑھیا نے بھی اس کی طرف آنکھ اٹھائی۔ لیکن وہ اپنا وار کر چکی تھی۔

" ضرور ہو گا بٹوارہ" چھوٹا بھائی چیخا۔ اس کی آواز میں بجلی کی تپش اور طوفان کی تخریب تھی۔

" بہت اچھا" بڑے بھائی نے ایک آہ بھری۔ کتنا زرد ہو گیا تھا اس کا چہرہ، جیسے وہ اپنی بہن کی شادی نہیں اس کی آخری رسومات ادا کرنے والا تھا۔

میری سہیلیاں خوشی سے آپس میں کھسر پھسر کرنے لگیں۔ گھر میں جمع لوگوں میں ایک ہلچل مچ گئی۔ اور میری مہندی رچی انگلیوں کی پوریں جانے کیوں جلنے لگیں۔

پھر جانے کیا ہوا کہ یک لخت تمام سہیلیاں چھت پر چڑھ گئیں۔ کمرے میں صرف میں اور وہ بڑھیا رہ گئی۔ میں اسے نہ بھی پہچانتے ہوئے اپنی ماں سمجھ رہی تھی۔

دونوں بھائیوں کی ماں، گھر میں جمع لوگوں کی ماں، بوڑھی بیمار اور کمزور ماں۔

" وہ دیکھو برات آرہی ہے" کسی نے ایک چیختی ہوئی سی آواز میں کہا۔ میری ہی کوئی سہیلی تھی شاید۔

ماں نے کہا " دیکھو گی بیٹی برات؟ سبھی لڑکیاں اپنی برات دیکھا کرتی ہیں"۔

" نہیں میرا جی نہیں چاہ رہا" میں نے جواب دیا۔

وہ خاموش رہی اور چند لمحوں تک ایک پُر اسرار سناٹا چھایا رہا۔

" واہ۔ دیکھا لوگ کس طرح ایک دوسرے پر تلواروں اور بھالوں سے جھپٹ رہے ہیں، کتنے بہادر ہیں یہاں کے باسی"

" اری ننگی عورتوں کا جلوس، کتنی خوبصورت ہیں یہ عورتیں"

" لیکن وہ آنکھیں کیوں بند کیے ہوئے ہیں؟"

" نیزے پر ایک بچے کو کیسے اٹھائے ہوئے ہے وہ بوڑھا۔ ضرور کوئی مداری ہو گا؟"

" اور بچہ بھی تو دیکھو کس پھرتی سے تھرک رہا ہے"

مَیں یہ سب سُن رہی تھی اور سوچ رہی تھی اے بھگوان یہ کیسی برات ہے، یہ کیسا جلُوس ہے؟ کیا مجھے کسی راکھشس سے بیاہا جا رہا ہے؟ میں خوف سے چیخ اٹھی۔

"ہاں راکھشس ہی ہے تمہارا خاوند ــــ" اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آہستہ سے کہا لیکن میں اب ہوش میں نہیں تھی۔ وہ کچھ اور بھی کہتی رہی پر میں نے کچھ نہ سُنا تھا۔

اور جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ ایک دہلیز پر پڑی تھی۔ کمرے اور آنگن خون سے بھرے پڑے تھے اور آس پاس سے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں میں نے دونوں بھائیوں کو دیکھا۔ ان کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے تھے، اُن کے کپڑے پھٹ چکے تھے اور چہرے پر خون رِستی خراشیں تھیں۔ میں نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔

دونوں بھائی میرے جسم کو کھینچ رہے تھے۔ ایک نے میرے بازو پکڑ رکھے تھے اور دوسرے نے ٹانگیں۔ وہ یوں زور لگا رہے تھے جیسے میں ان کی بہن نہیں رسّی کا ایک ٹکڑا تھی۔ میرے اعضاً ٹوٹ رہے تھے، میری ہڈیاں چیخ رہی تھیں۔ اور پھر اچانک میں نے ایک چیخ سُنی۔ بوڑھی ماں آنگن میں سے بول رہی تھی۔

"کچھ تو شرم کرو بے حیاؤ، دیکھو اس کے کپڑے پھٹ رہے ہیں۔ وہ ننگی ہو رہی ہے دھتکار ہے تم پر!!"

اور میں نے ایک شرمناک گالی اپنے گمبھیر اور شانت بھائی کے منہ سے نکلتی ہوئی سُنی۔ اور پھر مجھے اپنے ننگے پن کا احساس ہوا۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور پھر فوراً ہی میچ لیں۔ میں بالکل ننگی ہو چکی تھی اور دونوں بھائی گِدھوں کی طرح میرے جسم کو نوچ رہے تھے۔

اور اب میں زخمی اور جاں بلب دہلیز پر پڑی ہوں، امرتسر اور لاہور کی درمیانی حد پر سسک رہی ہوں اور دونوں بھائی خون آلود ہاتھوں سے اپنے ماتھوں کو تھامے، سر نہوڑائے اُداس بیٹھے ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان دونوں پشیمان ہیں۔

اُن کی ماں مر چکی ہے۔

اور میرا رکھوالا وہ بُوڑھا سنیاسی بھی مر چکا ہے۔

■■

چہروں پر لِکھا اِتہاس

نارتھ زون کلچرل سینٹر نے دراصل ہم دونوں کو ہی ایکسپلائٹ کیا تھا۔ ہربھجن کو تو انھوں نے یہ کہا کہ میں نے اس کے بغیر ہماچل اُتسو کے مشاعرے میں شریک ہونے سے انکار کر دیا ہے اور مجھ سے وہ لوگ یہ کہتے رہے کہ جب تک میں شملہ جانے کی حامی نہیں بھروں گا، ہربھجن بھی نہیں جائے گا۔ کلچرل سینٹرل والے ہم دونوں کو کسی بھی قیمت پر شملہ لے جانے پر تُلے ہوئے تھے لیکن میری اور ہربھجن کی اس سلسلے میں ٹیلیفون پر بات نہ ہو سکی۔ میں نے ایک آدھ بار ٹیلیفون لگایا تو وہ دفتر میں نہیں تھا۔ اور جب اس نے ٹیلی فون کیا تو میں موجود نہیں تھا اور اس طرح بنا ہماری آپسی بات چیت کے کلچرل سینٹرل والے ایک طرفہ کارروائی کرتے رہے اور سینٹر کا پبلک ریلیشنز آفیسر ورما جو ایک اسمارٹ اور پُر اخلاق آدمی تھا۔ ہم دونوں کو ٹیکسی میں لاد کر شملہ لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ بیچارے نے راستے میں ہم دونوں کو وی آئی پی ٹریٹمینٹ دیا اور ہم دونوں قلمکار خوش ہو گئے ــــ ہربھجن میرے ناول " ناگ پُتری گنگا " کے بارے میں بات کرتا رہا جو "جن ستّا" میں ان دنوں قسط وار چھپ رہا تھا اور میں اس سے اس کی پنجابی غزلیں اور نظمیں سنتا رہا۔ لنچ ٹایم پر ہم شملہ پہونچ گئے۔

ورما کو ہی گیٹی تھیٹر میں مشاعرے کا انتظام کرنا تھا جس میں تین چار زبانوں کے شاعر شرکت کر رہے تھے۔ ہماچل اُتسو کے تین دن کے پروگرام میں آج شام مشاعرے کی خاص محفل تھی۔ ورما جب تک شملہ نہیں پہونچا تھا تب تک تو اُس میں گھبراہٹ نام کو بھی نہ تھی لیکن اب ایکدم نروس ہونے لگا تھا۔

" اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میرے ساتھ رِج تک چلیں "

" ہم بہت تھکے ہوئے ہیں، ہمیں تو ہوٹل پہونچا دو " ہربھجن نے کہا۔

"رِج پر ہی ہمارا دفتر بھی ہے وہیں سے معلوم ہوگا کہ آپ کا انتظام کس ہوٹل میں ہے۔ کوئی ایک ہزار کے قریب مہمان آئے ہوئے ہیں۔ جگہ کی بڑی تنگی ہے شملہ میں۔ آپ دونوں کا الگ انتظام ہے۔ میری درخواست منظور کر لیجئے۔" ورما نے انتہائی منّت بھرے لہجہ میں کہا۔

"تو چلو۔" میرے جواب سے ورما خوش ہوگیا۔

سامان ہم نے ٹیکسی میں ہی چھوڑ دیا جو آک لینڈ ہوٹل کے پاس ہی ڈرائیور نے پارک کر دی تھی۔ شملہ میں کاریں یا ٹیکسیاں رِج سے بہت نیچے ہی پارک کی جاتی ہیں۔ یہ دستور بھی انگریزوں کے زمانے سے ہی چلا آرہا ہے۔ صرف خاص خاص افسروں کی گاڑیاں ہی رِج کے آس پاس تک جا سکتی ہیں۔ رِج تو پہچانا ہی نہیں جا رہا تھا۔

ہماچل اُتسو نے تو سارے رِج کی شکل بدل ڈالی تھی۔ کہیں کوئی اسٹریٹ پلے ہو رہا تھا۔ کہیں کسی سٹیٹ کا فوک ڈانس تھا۔ کسی جگہ کوئی آرٹسٹ لوگوں کی تصویریں بنا رہے تھے۔ اِدھر کتابوں کی نمائش ہو رہی تھی تو اُدھر ہماچل کے ہینڈی کرافٹس کے اسٹال چمک رہے تھے۔ سچ مانئے میں تو رِج کا جغرافیہ ہی بھول گیا تھا۔ حالاں کہ یہاں بیسیوں بار آتا رہا تھا۔

"ہربھجن کیا واقعی ہم رِج پر سے گذر رہے ہیں اس وقت؟"

میری بات پر ہربھجن نے خالص پنجابی قہقہہ لگایا اور پنجابی کی ایک بولی سُنائی۔

"دِیوا بال کے بنیرے اُتے رکھنی آں۔ گلی بُھل نہ جائے ماہی میرا۔"

"یہاں تو بھائی صاحب ہم دن میں ہی راستہ بھول رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"رات کو نہیں بھولیں گے، روشنیوں کی بھرمار ہوگی۔" ورما نے کہا۔ بہت دیر کے بعد پہلی بار ورما کے دماغ پر پڑا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تھا۔

ورما نے کئی جگہ ٹیلی فون کر کے آخر یہ معلوم کر ہی لیا کہ ہمارا انتظام کس ہوٹل میں تھا۔ اس نے ہوٹل کے منیجر کو بھی ٹیلی فون کر دیا۔ اور ہم سے شام کے چار بجے ملنے کا وعدہ کر کے دوبارہ اپنے دفتر کے اندر چلا گیا۔

جتنا راستہ طے کر کے ہم رِج پر آئے تھے اتنا ہی فاصلہ طے کر کے ہمیں ٹیکسی اسٹینڈ جانا پڑا۔ ہمارا ہوٹل وہاں سے قریب ہی تھا۔

رِیسپشن پر پہونچ کر معلوم ہوا کہ کئی آرٹسٹ وہیں ٹھہرے ہوئے تھے اور لاؤنج میں بیٹھے اپنی اپنی پریشانی کا اظہار کر رہے تھے۔ ایک تو یہ ٹورسٹ سیزن تھا اور دُوسرا ہماچل اُتسو۔

لوگوں کو ٹھہرنے کے لیے جگہ ہی نہیں مل رہی تھی۔ دوسرے ہوٹلوں کی طرح اس ہوٹل میں بھی کوئی کمرہ خالی نہیں تھا۔ بری سیشن پر اتنے لوگ جمع تھے کہ انکار کے باوجود جگہ کے لیے منتیں کرتے جا رہے تھے۔ میں تو الگ کھڑا ہو گیا لیکن ہربھجن کے بس میں ایک طرف کھڑا رہنا نہیں تھا۔ وہ تو پنجابی ادب میں بھی زیادہ دیر تک کھڑا نہیں رہ سکا۔ فوراً آگے بڑھ کر اس نے اپنی جگہ بنالی تھی۔ وہ ریسپشن پر کھڑے لوگوں کے درمیان گھس کر راستہ بناتا آگے بڑھا اور کمرے کی چابی لے کر میرے پاس آیا۔

" تُسی ویٹر نال کمرے وِچ چلو۔ میں سامان لے کے آؤندیاں "

یہ کہہ کر وہ ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

میں ویٹر کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اُترتے جا رہا تھا۔ لگتا تھا وہ مجھے کہیں پاتال میں لے جا رہا تھا۔ ہوٹل کی سب سے نیچے والی منزل پر ایک تنگ سے کاریڈار کے آمنے سامنے چھ کمرے تھے۔ تین ایک طرف، تین دوسری طرف۔ ہمارے والے کمرے کا نمبر پچیس تھا اور اس کمرے کے سامنے اٹھائیس نمبر کا کمرہ تھا۔ جب ویٹر نے ہمارا کمرہ کھولا تو اٹھائیس نمبر کے کمرے سے ایک نیا بیاہتا جوڑا نکلا۔ جب تک لڑکے نے کمرہ بند کیا، خوبصورت خدوخال والی لڑکی اپنے جسم اور کپڑوں سے نکلتی خوشبو کے جھونکے کاریڈار کے نیم اندھیرے ماحول میں بکھیرتی رہی۔ میں نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے وقت تالا بند کرتے ہوئے نوجوان کو دیکھا۔ لڑکی کے مقابلے میں وہ نوجوان مجھے جسمانی اور اقتصادی دونوں لحاظ سے کمزور نظر آیا۔

ہربھجن نے سامان کے ساتھ کمرے میں وارد ہوتے ہوئے کمینٹ کیا۔

" تُسی اٹھائیس نمبر والا جوڑا ویکھیا اے "

" تم نے کمرے کا نمبر بھی دیکھ لیا ؟ "

" من دے او کہ نہیں ؟ "

" مان گئے حضور "

" اے کُڑی چھوڑ جاوے گی اپنے گھر والے نوں "

" گھر والا ساتھ بھی رہے گا تو کیا کر لے گا "

" کی کرے گا وچارا ؟ " ہربھجن کا صحت مند پنجابی قہقہہ گونجا اور پھر وہ ایک بھاری گٹھڑی کی طرح پلنگ پر گر گیا۔ لگتا تھا وہ بہت تھک گیا تھا۔

گیئٹی تھیٹر شملہ کا اپنا ایک اتہاس ہے۔

ابھی کچھ دنوں پہلے اس نے اپنے وجود کے سو سال پورے کیے تھے۔ آزادی سے پہلے شملہ میں تعینات فوجی اور سول انگریز افسروں اور ان کی بیوی بچوں کے لیے یہ جگہ ایک بہت ہی خوبصورت کلچرل سنٹر ہوا کرتا تھا۔ یہ افسر خود ہی ڈرامے لکھتے تھے اور خود ہی ڈائرکٹ کرتے تھے۔ افسر اور ان کی بیویاں یا بیٹیاں ڈراموں کے کردار ہوتے تھے۔ یہ چھوٹا سا تھیٹر واقعی شملہ کی کلچرل زندگی کا مرکز ہے۔ یہیں مشاعرہ تھا شام کو۔ بہت سے شاعر دوست شرکت کے لیے پہونچے تھے دُور دُور کی جگہوں سے۔ جب میں اور ہربھجن پہونچے تو مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ گیٹ ہی پر ہوٹل کے اٹھائیس نمبر کمرہ کے مہمان مل گئے۔ وہی نوجوان اور وہی لڑکی۔

" آپ پچیس نمبر کے کمرے میں ہیں نا ؟ — نوجوان نے مجھ سے پوچھا۔

" جی "

" ہم اٹھائیس نمبر میں ہیں "

" یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی، چلو " اُس کی بیوی اُس نوجوان کو ڈانٹتے ہوئے ہال کے اندر لے گئی۔

ہربھجن اور میں دونوں اسٹیج پر آ گئے۔ اسٹیج پر بیٹھے دوستوں نے پہچانتے ہوئے سلام دعا کی اور ورما جو پہلے ہی سے وہاں موجود تھا اور ہمیں وہاں نہ دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا، اپنی جگہ سے اُٹھا اور ہم دونوں کو اسٹیج پر بیٹھے دوستوں کی اگلی قطار میں بٹھا دیا اور ایک ایک گاؤ تکیہ بھی ہمارے پیچھے رکھ دیا۔ میں اسٹیج سے اٹھائیس نمبر والے نوجوان کو دیکھنے لگا — لیکن وہ نظر نہیں آیا شاید کہیں پیچھے کی سیٹوں پر بیٹھا ہو۔

مشاعروں کا بھی اپنا انداز ہوتا ہے۔ جم جائیں تو جم جائیں اور نہ جمیں تو ہزار کوشش کے بعد بھی نہیں جم پاتے۔ گیٹی تھیٹر والا مشاعرہ کوئی خاص نہیں جما۔ البتہ ہربھجن کی پنجابی نظمیں جو اس نے پنجاب کے موجودہ ماحول کے بارے میں کہیں تھیں بہت کامیاب رہیں۔

مشاعرہ کے بعد ورما کا اصرار تھا کہ ساؤتھ کا جو ایک ٹروپ آیا تھا اس کا پروگرام ہم لوگ ضرور دیکھیں۔ ہربھجن کو بڑے زور کی بھوک لگی تھی۔ وہ جانا نہیں چاہتا تھا لیکن میرے کہنے پر وہ راضی ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اُٹھ آئیں گے۔

" بڑھیا کھانا کھلاؤں گا " میں نے کہا۔

"منظور ا ے"

ورما جب ہمیں بھیڑ میں سے نکالتا ہوا اسٹیج کے سامنے لے آیا اور ساتھ ہی ہمارے لیے کرسیاں بھی اٹھالایا تو میں نے محسوس کیا کہیں آس پاس، ہوٹل کے کاریڈار والی خوشبو منڈلا رہی تھی۔ بڑی حیرت ہوئی کہ وہ خوشبو یہاں کیسے پہونچ سکتی تھی۔ مڑ کر پیچھے دیکھا تو اٹھائیس نمبر والی لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ ہمارے پیچھے کھڑی تھی۔ نوجوان مجھے دیکھ کر مسکرایا، جان پہچان کا ثبوت دینے کے لیے میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کرسی اس لڑکی کو آفر کر دی۔ مجھے کھڑا دیکھ کر ہربھجن نے بھی کرسی چھوڑ دی اور اس نوجوان کو بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا۔ وہ دونوں میاں بیوی ہماری والی سیٹوں پر بیٹھ گئے اور ہم دونوں ان کے پیچھے قطار میں کھڑے ہو گئے۔ کچھ لمحوں کے بعد جب ورما ہمیں دیکھنے آیا تو اسے ہماری اس حرکت پر خوشی نہیں ہوئی۔ بہت تیز چمکتی ہوئی روشنی میں جب میں نے ان دونوں کے چہرے کو دیکھا تو وہ ایکدم کورے تھے۔ چہروں کے کاغذ پر کوئی نقش، کوئی لکیر، کوئی لفظ نہیں تھا۔ کچھ ہوتا تو اتنی تیز روشنی میں کچھ تو نظر آتا۔ لگتا تھا انھوں نے اپنے نئے جیون کے اِتہاس کی شروعات بھی نہیں کی تھی۔ صرف خوشبو ہی خوشبو تھی اور لباس کی چمک ہی چمک تھی، وہ بھی صرف ایک فریق کے پاس دوسرے کے پاس تو یہ سب بھی نہیں تھا۔ وہ بے چارہ تو ایک دم تھکا ہوا اور ہارا ہوا لگتا تھا۔ اپنے طبقے کی پوری نمائندگی کر رہا تھا، جس سے اس کا تعلق تھا۔

کچھ دیر کے بعد ہربھجن اور میں اُٹھ کر چلے آئے۔ ورما اپنے کچھ دوسرے مہمانوں کی دیکھ بھال میں لگ گیا تھا اور اُسے یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ ہم کب غائب ہو گئے تھے۔

ہم دونوں ہوٹل بہت دیر سے لوٹے۔

صبح جب میں اُٹھا تو ہربھجن ابھی سو رہا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے رِسیپشن کے ساتھ والے ہال میں چلا گیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا تو محسوس ہوا کہ میں واقعی شملہ میں تھا۔ پورا نظارہ آنکھوں کے سامنے پھیلا تھا۔ ہوٹل کا کمرہ تو جیسے پاتال کا کوئی حصّہ تھا جہاں نہ باہر سے روشنی آتی تھی نہ ہَوا۔ بس کمرے کے اندر مدھم سی روشنی تھی۔ ہنی مُون منانے آئے جوڑوں کو شاید اسی روشنی کی ضرورت تھی اور اسی ماحول کی بھی۔ ہنی مُون کوئی پہاڑ کی چوٹی پر، نکھرتی ہوئی دُھوپ میں تھوڑی مناسکتا ہے۔ کوئی گپھا چاہیے' باہر چاہے دوپہر ہو لیکن گپھا کے اَندر تو اگر رات کی نہیں تو کم سے کم شام کی کیفیت تو ہونی ہی چاہیے۔

کچھ دیر کھڑکی کے سامنے کھڑا رہنے کے بعد میں کھڑکی کے ساتھ لگی میز کی دائیں طرف لگی

کرسی پر بیٹھ گیا اور بیرے کو چائے کے لیے کہا۔

اس ہال میں صرف ایک میں ہی بیٹھا تھا۔ باقی سبھی لوگ اپنے اپنے نیم تاریک کمروں میں پڑے تھے۔

میں اپنی پیالی میں چائے ڈال رہا تھا کہ ہال کا دروازہ کھول کر اٹھائیس نمبر والا نوجوان داخل ہوا۔

"گڈ مارننگ۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"گڈ مارننگ، کہیے کیسے ہیں؟"

"اچھا ہوں۔" اس کا جواب سُن کر میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ اس کے دونوں گالوں پر لو بائیٹس کے نشان تھے۔ وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

"لگتا ہے بہت اچھے ہو۔" وہ جھینپ گیا اور غیر ارادی طور پر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے گال سہلانے لگا۔ شاید اپنے نیم تاریک کمرے میں لگے آئینے سے اسے اپنے چہرے پر درج پوری تحریر نظر نہیں آئی تھی۔

میں نے دوسری پیالی میں اُس کے لیے چائے بنائی اور پیالی اس کی طرف سرکا دی۔ اُس نے پیالی کو اپنی طرف کھینچ لیا اور بولا۔

"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے سر۔"

"میری مدد کی؟"

"مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ آپ بڑے آدمی ہیں۔"

"آپ کی یہ انفارمیشن غلط ہے۔ خیر بتائیے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"میرے سُسرال والوں نے فیروز پور سے ہمارے لیے تین دن کے لیے اس ہوٹل میں کمرہ ریزرو کروایا تھا۔"

"آپ خود نہیں کروا سکتے تھے؟"

"میری اتنی حیثیت نہیں، سر۔ میں تو بہت غریب گھر سے ہوں۔ میرے سسرال والوں نے مجھے خرید لیا ہے۔"

"خرید لیا ہے؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"وہ آجائے گی۔ میری بات جلدی سے سُن لیجیے۔"

" کون ؟ "

" میری وائف "

" کہیے "

" اس لڑکی کے دماغ میں کچھ نقص ہے۔ گھنٹوں نہیں بولے گی اور اگر بولنے پر آجائے گی تو تمام دن بولتی جائے گی۔ یا تو سوئے گی ہی نہیں اور اگر سوئے گی تو پھر جاگنے کا نام نہیں لے گی۔ عجیب بکھیڑا ہے سر "

" شادی سے پہلے آپ کو معلوم نہیں تھا "

" بہت کم معلوم تھا۔ یہی کہا گیا تھا کہ اس کی بیماری صرف شادی سے ہی ٹھیک ہو گی اور میں اُن کی باتوں میں آ گیا "

" کن کی باتوں میں ؟ "

" جو لوگ مڈل مین تھے "

" اب میں کیا کر سکتا ہوں ؟ "

" میری بیوی کہتی ہے کہ وہ کم سے کم تین دن اور یہاں رہے گی۔ ہوٹل والوں کی بڑی منت کی ہے۔ ان کے پاس کوئی کمرہ خالی نہیں "

" کسی دوسرے ہوٹل میں ٹرائی کر لیں "

" اسی ہوٹل کے لوگ ٹرائی کر رہے ہیں۔ لیکن ہماچل اُتسو کی وجہ سے سارے ہوٹل فل ہیں "

" یہ تو بڑا مشکل مسئلہ ہے "

" کل تو شاید پرائم منسٹر بھی آ رہے ہیں، اُتسو کی کلوزنگ پر "

" اس لیے تو مسئلہ اور بھی نازک ہو گیا ہے "

ہماری گفتگو اس مرحلے پر پہونچی تھی کہ ہربھجن بھی وہیں آ گیا۔

" آپ مجھے سوتا چھوڑ کر آ گئے "

" یار اس نیم اندھیرے غار میں پڑا رہنا اچھا نہیں لگا۔ ذرا کھڑکی سے دیکھو شملہ کتنا پیارا ہے۔ لو چائے لو " میں نے خالی گلاس میں چائے بنا کر اس کے سامنے کر دی۔ اسی گلاس سے ہال میں داخل ہوتے ہی میں نے ٹھنڈا پانی پیا تھا۔

چائے پیتے ہوئے وہ اس نوجوان سے مخاطب ہوا۔

"آپ بھی بہت جلدی جاگ جاتے ہیں"۔

"جی"۔ اُس نے جھینپتے ہوئے آنکھیں جھکا لیں۔

اسی لمحہ اٹھائیس نمبر کے کاریڈار میں خوشبوئیں لٹانے والی خوبصورت لڑکی زور سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"تم تو کہہ رہے تھے تم کمرے کا انتظام کرنے جا رہے ہو اور یہاں بیٹھ کر چائے اُڑا رہے ہو، وی آئی پیز کے ساتھ"۔ وہ غصّے سے بولی۔

"آیئے نہ بیٹھئے"۔ میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا

"نہیں جی، شکریہ!" اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا اور پھر اپنے خاوند سے مخاطب ہوئی

"چائے کا آرڈر دے کر نیچے کمرے میں آؤ"۔

پھر وہ خوشبوئیں بکھیرنے والی لڑکی ایک دم جانے کو مُڑی اور اس نوجوان نے جن نظروں سے میری طرف دیکھا وہ ایک تیز بھالے کی طرح میری روح میں اُتر گئیں۔

"ذرا دیر کو رُک جایئے"۔ میں نے کہا۔

وہ رُک گئی۔

"کہیئے"۔

"پچیس نمبر کا کمرہ تین روز کے لیے آپ کے نام ریزرو ہو گیا ہے"۔

"اِز اِٹ"؟

"جی"۔

"آپ خالی کر کے جا رہے ہیں"؟

"جی ہاں، ہمیں آج دوپہر تک چنڈی گڑھ پہونچنا ہے"۔

ہربھجن نے چائے کا گلاس چھوڑ دیا تھا اور حیرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"آجاؤ ڈیر"۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے خاوند کو بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو ویری مچ سر"۔ وہ کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولا۔

اور اپنی نیم پاگل بیوی کے پیچھے پیچھے ہال سے باہر نکل گیا۔

"یہ کیا پاگل پن ہے یار، کل تو پرائم منسٹر آرہے ہیں۔ تم چنڈی گڈھ واپس جانا چاہتے ہو؟" ہربھجن نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

" نہیں ، ہم وائی ایم سی اے میں چلے جائیں گے ، تم نے دیکھا نہیں ان دونوں کی زندگی کا اِتہاس شروع ہوچکا ہے ۔ اگر انھیں ہوٹل میں کمرہ نہیں ملا تو ساری تاریخ بدل جائے گی۔ سارا اِتہاس ختم ہوجائے گا۔ اور وہ پاگل لڑکی اپنے خاوند کو قتل کرڈالے گی "

" اور ہم ؟ "

" ہم کرائیسٹ کے حضور پیش ہو جائیں گے، اپنے گناہ بخشوانے کے لیے "

" کہاں ؟ "

" وائی ایم سی اے میں " میں نے اُٹھ کر ہربھجن کو اپنی باہوں میں لے لیا۔

دوپہر کو جب ہم نے اپنا کمرہ خالی کیا تو اٹھائیس نمبر کمرے کے باہر پھیلی خوشبو کی لہریں، خالی کمرے کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں۔

■■

دُوسرا مرد

میری زندگی میں آیا دُوسرا مرد میرا بیٹا ہے۔

میں نے اِسے مرد اِس لیے کہا ہے کہ اب اس کی عمر بیس سے اوپر ہو گئی ہے۔ اور ایک آدھ برس میں اُسے ووٹ ڈالنے کا بھی حق مل جائے گا۔

پہلا مرد جو میری زندگی میں آیا تھا وہ میرا خاوند پرم پال تھا۔

میرا اپنا نام جگتار ہے۔ جگتار کا مطلب ہے جگ کا کلیان کرنے والی۔ دنیا کا بھلا کرنے والی میں دنیا کا بھلا کر سکی ہوں یا نہیں لیکن اپنا آپ ضرور بگاڑ چکی ہوں۔ پینتیس برس پہلے والی جگتار تو اب پہچان میں بھی نہیں آتی۔ اس کا تو رنگ رُوپ ہی بگڑ گیا ہے۔ جیتو منڈی میں میرے ساتھ پڑھنے والی کوئی لڑکی کبھی مل جاتی ہے تو اس کا پہلا سوال ہوتا ہے۔

"جگتار تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیتی، صرف ہنس دیتی ہوں اور یوں ہنستے ہوئے بھی کچھ ایسا لگتا ہے۔ جیسے ایک جوان اور صحت مند عورت نہیں ہنس رہی بلکہ ردی اخبار سے بنا ہوا ایک خالی لفافہ ہوا میں پھڑ پھڑا رہا ہے۔ عورت کبھی ایک بے کار خالی لفافہ بھی بن سکتی ہے، اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوتا ہے جب میں ناری نکیتن میں ظلم اور ناانصافی کا شکار ہوئی کسی عورت کو خالی وقت میں ردی اخبار کے کاغذوں سے لفافے بناتے دیکھتی ہوں۔ یہ اُس کے خالی وقت کو اچھے ڈھنگ سے گزارنے، اسے مصروف رکھنے اور اُسکی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کا ایک تعمیری ذریعہ ہے۔ ایسی ہی ایک عورت سے بات کرتے ہوئے ناری نکیتن کی وِزٹ پر میں نے پُوچھا تھا۔

"تم یہاں کیسے چلی آئیں؟"

"شاید تقدیر میں یہی لکھا تھا۔"

"تقدیر تو آدمی خود بناتا ہے۔"

"بناتا ہوگا لیکن عورت تو صرف لفافے ہی بنا سکتی ہے۔ شریمتی جی۔"

میں اُس مجبور عورت کا جواب سن کر سکتے میں آگئی تھی۔ اس کا وہ تلخ لہجہ مجھے آج تک یاد ہے۔ اس کی آنکھوں میں گھلا درد میرے تمام جسم میں سنسنی سی پھیلا گیا تھا۔

"مگر کیوں؟"

"عورت جب کٹ جاتی ہے تو اس کی اپنی حیثیت بھی ایک خالی لفافے کی طرح ہو جاتی ہے۔ ردی کاغذ سے بنا ہوا ردی سا لفافہ۔"

میں ناری نکیتن کی اُس خوبصورت عورت سے زیادہ بات نہ کر سکی تھی۔ اپنے آپ کو ہاری ہوئی محسوس کرتے ہوئے لوٹ آئی تھی۔

اُس شام مجھے پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ وہ عورت جو کسی مرد کے بھروسے کو اپنا سب کچھ سمجھ کر اُسے اپنا پیار، اپنا وشواس، اپنا جسم اور اپنی آتما تک سونپ دیتی ہے وہ ایک دم لُٹ ہی تو جاتی ہے۔ پیار کے ایک بول کی ماری عورت جب لُٹ جاتی ہے تو ایک آدمی کیا اُسے سارا سماج قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ جسم کا لُٹ جانا شاید بہت بڑا حادثہ ہے ایک عورت کی زندگی میں اور وہ عورت بڑی خوش نصیب ہے جو صرف ایک ہی مرد کے ہاتھوں لُٹ کر اُس کی ہو جاتی ہے۔ کیا وہ واقعی خوش نصیب ہے؟ میرا خیال ہے۔ نہیں۔ اُس نے اپنا پیار دے کر عُمر بھر کی غلامی خرید لی ہے۔ اس نے اپنا وشواس، اپنا پیار، اپنے خواب، اپنی تمنائیں، سبھی کچھ بیچ کر اپنے لیے ایک محفوظ چار دیواری خریدی ہے، جو اُس کے لیے آخر ایک غیر محفوظ قید خانہ بن جاتا ہے۔ یہ سودا کتنا مہنگا ہے!

زندگی بھر کے خواب اور اُن کے عوض زندگی بھر کی غلامی!

یہ دُوسرا مرد جو اچانک میری زندگی کو جھنجھوڑنے لگا ہے۔ میرا بیٹا ہے بلرام۔ لیکن اس وقت اس کی بات نہیں کروں گی۔

اِس سے پہلے میں اپنے جیون میں آئے پہلے مرد کی بات کروں گی۔ جو میرا خاوند ہے، پرم پال۔

پرم پال اور میں دونوں جیتو منڈی کے رہنے والے ہیں۔ جیتو منڈی پنجاب میں ہے۔

کسی زمانے میں یہ قصبہ ریاست نابھہ کے راجہ کی جاگیرداری میں تھا۔ یوں تو اناج کی بڑی بھاری منڈی تھی یہاں لیکن اس کی شہرت کی وجہ دوسری تھی۔ جیتو منڈی کے کچھ لوگوں نے اپنے راجہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ آزادی کا پرچم بلند کیا تھا۔ خوب سزائیں پائی تھیں۔ لیکن آخر راجہ کی غلامی سے نجات بھی تو حاصل کرلی تھی۔ ان لوگوں میں جنہوں نے راجہ کے خلاف بغاوت کی تھی میرے پتاجی بھی تھے۔ بغاوت کے عوض انہیں کئی برسوں کی قید ملی تھی۔ میں ان دنوں پرائمری اسکول میں پڑھتی تھی۔ پرم پال بھی اسکول جاتا تھا۔ پتاجی جیل گئے تو ایک دم مشہور ہو گئے اور ایک بڑے نیتا بن گئے۔ میری ماں اور پرم پال کی ماں دونوں بہت اچھی دوست تھیں۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے اپنی دوستی پرم پال اور مجھ میں منتقل کردی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اُس وقت نہ مجھے تھا نہ پرم پال کو۔ پر میں تھی بہت خوبصورت۔ شاید اسی لیے پرم پال کی سانولی بے ڈھب اور موٹی سی ماں نے مجھے اپنے آنگن کے لیے چن لیا تھا۔ اور یہ بات بھی سچ ہے کہ پرم پال کی ماں مجھے کبھی اچھی نہیں لگی نہ بیاہ سے پہلے نہ بیاہ کے بعد۔

پرم پال اونچے قد کا خوبصورت لڑکا تھا۔ وہ اپنی ماں پر نہیں گیا تھا ورنہ اُس کا رنگ روپ اور طرح کا ہوتا۔ پرم پال جب اسکول سے نکلا تو مانو بچپن سے نکل کر ایک دم جوانی کی حدوں میں داخل ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ اپنی عمر کے مقابلے میں زیادہ بڑے لگتے ہیں۔ پرم پال ان ہی لوگوں میں سے تھا۔ وہ اب اکثر ہمارے گھر بھی آنے لگا تھا۔ میری ماں نے کئی بار ٹوکا بھی لیکن وہ باز نہیں آیا۔

"میں تو تمہیں دیکھنے آتا ہوں۔ ماسی جی کے لیے تو نہیں آتا۔"

پرم پال نے ایک بار کہا تھا۔

"مجھے دیکھنے کیوں آتے ہو؟"

"تم مجھے اچھی لگتی ہو۔"

"میں تو تمہارے گھر کبھی نہیں جاتی۔"

"تم لڑکی جو ہو۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"لوگ بُرا مانتے ہیں۔"

"تمہارے یہاں آنے کا لوگ بُرا نہیں مانتے؟"

"میری اور بات ہے۔"

"تمہاری اور بات کیوں ہے۔"

"میں تمہارا منگیتر ہوں۔"

پرم پال نے یہ جواب دیا اور مسکراتے ہوئے ہمارے گھر سے باہر نکل گیا۔ پرم پال کی یہ مُسکراہٹ میری زندگی کی پہلی ہار تھی۔ اس سمے میں اُسے ہار نہیں سمجھا تھا اپنی جیت سمجھا تھا۔ پرم پال میرے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ جیتو منڈی میں کالج نہیں تھا اس لیے پرم پال اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے پٹیالہ چلا گیا اور وہاں اس نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ میں دسویں کرکے گھر بیٹھ گئی۔ لیکن میرے پتاجی آزاد خیال آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے رتن اور پربھاکر کے امتحان پاس کرنے اور پھر پرائیویٹ طور پر بی اے کرنے کی صلاح دی۔ نہ صرف صلاح ہی دی بلکہ خود ہی پڑھانے بھی لگے۔ پرم پال کالج میں پڑھ رہا تھا میں گھر پر امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ یہ بات پرم پال کو تو پسند تھی لیکن اس کی ماں کو نہیں۔ اس نے اپنی تینوں بیٹیوں میں سے کسی کو بھی آٹھویں درجے سے آگے نہیں پڑھنے دیا تھا۔ کئی بار اُس نے میری ماں سے بھی کہا کہ وہ مجھے کیوں آگے پڑھا رہی تھی۔ ماں اسے ہمیشہ یہی کہہ کر ٹال دیتی کہ یہ فیصلہ اُس کا نہیں میرے پتاجی کا تھا۔ یہ ایک اور وجہ تھی جس سے میرے اور پرم پال کی ماں میں بعد میں من مٹاؤ ہو گیا تھا۔ وجہیں تو خیر کئی تھیں۔ بڑی وجہ تو یہ تھی کہ اس کی اپنی بیٹیاں نہ خوبصورت تھیں نہ پڑھی لکھی۔ اس لیے ان کے بیاہ کی بھی بہت بڑی سمسیا تھی۔

اُدھر پرم پال نے بی اے کیا تو اُس نے شادی کا تقاضا شروع کر دیا میں نے بھی بی اے انگلش کر لیا تھا۔ اس کی ماں چاہتی تھی کہ پرم پال کی شادی سے پہلے اس کی کم سے کم دو بیٹیوں کی تو شادی ہو جائے۔ کوشش تو وہ سر توڑ کر رہی تھی۔ لیکن جہاں بھی بات چلتی کسی نہ کسی کارن ٹوٹ جاتی۔ لڑکیوں کا زیادہ پڑھا لکھا نہ ہونا ایک بڑا کارن بن جاتا۔ پرم پال کچھ دن پہلے تو اپنی ماں کا ساتھ دیتا رہا اور اپنی بہنوں کے لیے لڑکے تلاش کرتا رہا لیکن آخر وہ تنگ آ گیا۔ ایک دن جب وہ بہت پریشان تھا تو ہمارے گھر آیا۔ اتفاق سے ماں اُس وقت گھر پر نہیں تھی۔

"ماں گھر پر نہیں ہے تم چلے جاؤ۔" میں نے بڑی رُوکھائی سے کہا تھا۔

"لیکن تم میری بات تو سنو"

"ماں کی غیر حاضری میں تم مت آیا کرو۔"

"تم اپنی ماں سے آخر کب تک چوکیداری کرواتی رہو گی؟"

"جب تک میں اِس گھر میں ہوں۔"

"اس کے بعد؟"

"پھر تو تمہاری ماں میری چوکیداری کرے گی ہی۔"

"میں نہیں چاہتا کہ کوئی پھر بھی تمہاری چوکیداری کرے" پرم پال نے کہا تھا۔
وہ اب تک کھڑا ہی تھا۔ میں نے اُسے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا تھا اور نہ ہی میں چاہتی تھی کہ وہ بیٹھے ہی۔

"تم جلدی سے کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"پانی وانی بھی نہیں پلواؤ گی؟" پرم پال کے ہونٹ واقعی سُوکھ رہے تھے۔
میں جب رسوئی سے پانی لینے گئی تو پرم پال کمرے میں رکھی ایک پرانی سی کرسی پر بیٹھ گیا جس کی سیٹ پر ابھی دو دن پہلے میں نے کم روئی ڈال کر ایک ہلکی سی گدی رکھی تھی۔ میں نے ٹوکا نہیں پرم پال کو واقعی بہت پیاس لگی تھی۔ اُس نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا تھا۔

"اور پانی لاؤں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" اس نے اپنی قمیص کے بازو سے ہی اپنے گیلے ہونٹ پونچھتے ہوئے کہا۔

"تو اپنی بات کہو"

"جگتار میں چاہتا ہوں کہ جلدی ہی ہم دونوں کی شادی ہو جائے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے اس کا فیصلہ تو میرے اور تمہارے گھر والے کریں گے۔ تمہارے چاہنے سے کیا ہوگا؟" میں نے کھڑے کھڑے ہی جواب دیا۔ پانی کا خالی گلاس ابھی میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ دراصل میں پرم پال کے اس سجھاؤ کے لیے تیار نہیں تھی۔

"جہاں تک میری ماں کا سوال ہے۔ وہ تو پہلے اپنی بیٹیوں کی شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"اس میں غلط بات بھی کیا ہے؟ اُن کی شادی تو پہلے ہونی ہی چاہیئے۔"

"میں بے شک بوڑھا ہو جاؤں ؟"

"نہیں تم اتنی جلدی بوڑھے نہیں ہو گے۔" میں مسکرا دی تھی۔

ماں کی غیر حاضری کے کارن میرے من پر جو بوجھ تھا اب کچھ ہلکا ہو چکا تھا۔

"تو تمہیں جلدی نہیں ہے ؟"

"نہیں۔"

"کیوں ؟"

"دو کارن ہیں۔ ایک تو یہ کہ تمہیں اپنے لیے کوئی کام کاج تلاش کرنا چاہیئے۔ بیکار آدمی کو شادی ہرگز نہیں کرنی چاہیئے۔"

"دوسرا کارن یہ ہے کہ جب گھر میں تین جوان لڑکیاں ہوں تو گھر کا ماحول خوشگوار نہیں ہو گا۔"

"تو کیا کروں ؟"

"ان دونوں مسئلوں کا حل سوچو۔" میں نے جواب دیا۔

پرم پال ایک دم اداس ہو گیا تھا۔ اُسے یہ امید نہیں تھی کہ میں اس کی تجویز نہیں مانوں گی اور اُسے کسی نئی الجھن میں ڈال دوں گی۔ وہ چُپ چاپ اٹھ کر جانے لگا تو میں نے کہا۔

"تم ناراض نہ ہو پرم پال شادی تمہیں سے کروں گی۔ تھوڑا اور انتظار کرو۔"

پرم پال رونے کے انداز میں مسکرایا اور چلا گیا۔ میں نے اُسے ناراض تو نہیں ہونے دیا تھا لیکن وہ مایوس ضرور تھا۔

پرم پال نے اپنے لیے ملازمت تلاش کر لی تھی۔

ایک دن اس کی ماں لڈو لے کر آئی تھی ہم سب کے لیے ہم سب خوش تھے۔ میں اور بھی زیادہ خوش تھی کہ پرم پال نے میری بات مان لی تھی۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ اُس نے اپنی ماں کو کیسے راضی کر لیا تھا لیکن یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ اُس دن پرم مال کی ماں شادی کی تجویز لے کر آئی تھی۔

اور پھر پرم پال سے میرا بیاہ ہو گیا۔

اب سے کچھ پہلے زمانہ اچھا تھا۔ لڑکی کی شادی کے لیے بہت جہیز کی مانگ نہیں ہوتی تھی۔ اب کی طرح اخباروں میں ہر روز کسی نئی بیاہتا لڑکی کے تیل چھڑک کر جلا دینے یا

مجبور ہو کر خودکشی کر لینے کی خبریں نہیں چھپتی تھیں۔ چنانچہ نہ تو پرم پال کے گھر والوں کی طرف سے جہیز کی مانگ ہوئی اور نہ ہی میرے پتاجی نے شادی پر فضول خرچ کیا۔ معمولی لوگوں کی شادی تھی جو سادھارن ڈھنگ سے ہوئی تھی۔ دکھاوا کم تھا، رکھ رکھاؤ زیادہ تھا۔ پرم پال کی بہنوں نے میرا پورا سواگت کیا جیسے میں غیر نہیں تھی۔ ان کی سگی تھی۔ ان کا کھلا پیار مجھے بہت اچھا لگا۔

پرم پال نے ملازمت کے ساتھ ساتھ پولٹیکل سائنس میں پرائیویٹ طور پر ایم اے کی بھی تیاری شروع کر دی تھی۔ میں نے بھی بی اے کے باقی پرچوں میں امتحان دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ پرم پال کی دونوں بڑی بہنوں نے بھی رتن کا امتحان دینے کے لیے کتابیں خرید لی تھیں۔ کچھ کتابیں میرے پاس تھیں جو میں نے انہیں دے دی تھیں۔

گھر کا واتاورن اچھا تھا۔ بیچ بیچ میں پرم پال اور میں پتاجی سے اور ماں سے ملنے کبھی چلے جاتے تھے۔ حالات ٹھیک ٹھاک تھے اور کہیں کوئی اُلجھن نہیں تھی۔ ہاں پرم پال کی ماں کا مزاج کچھ سخت تھا۔ لیکن میں اس کی چھوٹی موٹی باتوں کو برداشت کر لیتی تھی۔ آپسی رشتوں کو قائم رکھنے کے لیے بُردباری بہت ضروری ہے۔

اڑھائی تین سال کا عرصہ بہت پُرسکون گزرا۔

میری بیاہتا زندگی کا یہی مختصر سا واقعہ میری زندگی کا سب سے زیادہ خوشگوار عرصہ تھا۔ پھر تو حالات تیزی سے بدلتے گئے تھے۔ پرم پال نے پولٹیکل سائنس میں ایم اے کر لیا تھا اور اسے سنگرور کے کالج میں لیکچرار کی ملازمت مل گئی تھی۔ میں نے بی اے کے بعد بی ٹی کا امتحان پاس کر لیا تھا اور لڑکیوں کے ایک سکول میں ملازمت کرنے لگی تھی۔

پرم پال کی دونوں بہنوں نے پربھاکر کا امتحان پاس کر لیا تھا لیکن اُن کی شادی کی بات کہیں بھی سرے نہ چڑھی تھی۔

اِدھر میرے پتاجی کا انتقال ہو گیا تھا اور ماں بیمار رہنے لگی تھی۔

پرم پال چونکہ ہفتے میں کئی روز گھر نہیں رہتا تھا۔ اس لیے اس کی ماں مجھے تنگ کرنے لگی تھی۔ اُسے میرا سکول میں نوکری کرنا کبھی پسند نہیں تھا۔ پرم پال جب سنگرور سے آتا اُس کی ماں شکایتوں کی پوٹلی کھول دیتی۔ شروع شروع میں ماں بیٹے کی تکرار ہوتی۔ پھر پرم پال کی بہنیں ماں کی طرفداری کرتیں لیکن میں خاموش رہتی حالانکہ جھگڑا میری ہی کسی بات کو لے کر ہوتا تھا۔

دھیرے دھیرے لڑائی کا محاذ بدلتا گیا اور پھر نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ گھر کے سبھی افراد ایک طرف ہو گئے اور میں ایک دم اکیلی رہ گئی۔ بات کہیں سے بھی شروع ہوتی ختم آکر ہوتی مجھ پر۔ کمان کہیں بھی تنتی تیر مجھے ہی لگتا۔ سبھی حملوں کا نشانہ میں ہی تھی۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ پرم پال جس کے منہ میں زبان نہیں تھی اور جو میرے پیار میں پاگل ہو گیا تھا ایک دم گندی گندی گالیاں بکنے لگے گا۔ میں نے اکیلے میں جب بھی اُسے سمجھانے کی کوشش کی وہ اور بھی زیادہ بدمزاجی سے پیش آنے لگا۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔

یہ دُوسرا مرد، جو میرا بیٹا بلرام ہے اُن دنوں بنا نام اور بنا کسی رُوپ کے میری کوکھ میں کونپل کی طرح پھوٹ رہا تھا اور جب کونپل پھوٹتی ہے تو بہار کا پیغام آتا ہے۔ چاندنی کی رمق تھرکتی ہے۔ اور خوشبوؤں کے قافلے چلنے کو ہوتے ہیں۔ اور مندروں میں گھنٹیاں گونجتی ہیں اور مسجدوں میں اذانیں اُبھرتی ہیں اور گرجا گھروں میں مقدس باپ کے نغمے گائے جاتے ہیں۔ اور اس پیغام کو اور گھنٹیوں کو اور اذان کو اور مقدس باپ کی حمدوں کو صرف وہ عورت سُنتی ہے جو ماں بن رہی ہے۔ جس کے اندر ایک نیا انسان ڈھل رہا ہے۔ دُوسرا کوئی نہیں سن سکتا اس پوتر پیغام کو بہار کا اور مستقبل کا اور امن کا اور حسین دور کا پیغام! ماں اس لیے درد سہتی ہے کہ اس درد کے بطن سے ایک نیا خدا جنم لیتا ہے جو انسان کا آخری سہارا ہے۔

میرے علاوہ میری روح میں کسمساتا نئے دور کا پیغام اور کوئی نہیں سُن رہا تھا۔ سب میرا اُبھرتا ہوا جسم دیکھتے تھے۔ اس کے اندر تخلیق ہوتا ہوا وجود کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ یہ وجود پرم پال کو بھی نظر نہیں آیا، جسے میرے انگ انگ پر ہر قسم کے چھوٹے سے چھوٹے نشان کا بھی گیان تھا۔

اُس روز میں لیڈی ڈاکٹر کو دکھا کر آئی تھی جس نے بتایا تھا کہ بچے کی پوزیشن کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ اس کے لیے اس نے کچھ دوائیں بھی دی تھیں۔ میں چاہتی تھی کہ ڈاکٹر سے ہوئی ہر اِک بات پرم پال کو بتا دوں اور اس کی رائے بھی لوں اور اس سے مشورہ بھی کروں۔

کمرے میں ہم دونوں ہی تھے۔ شام کا وقت تھا میں چائے بنا کر لائی تھی۔ چائے کی ایک پیالی اُسے دی اور دوسری پیالی میں چائے ڈالتے ہوئے میں نے کہا تھا۔

"پال ڈیئر تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔"

"تمیز سے مخاطب کرو میں تمہارا خاوند ہوں۔" اُس نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے

کہا تھا۔ میں سناٹے میں آگئی تھی۔ کیا میں جانتی نہیں کہ تم میرے خاوند ہو؟"

"نہیں تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"مجھے تم کہہ کر مت مخاطب کیا کرو۔ عزت سے پیش آیا کرو۔"

"میں تمہاری عزت نہیں کرتی کیا؟"

"اپنے دل سے پوچھو۔"

"اپنے دل ہی سے پوچھ کر تو تمہیں زندگی کا ساتھی بنایا تھا۔"

"یہ سب بکواس ہے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ پرم پال کے رویے میں پچھلے کچھ دنوں سے تبدیلی آگئی تھی۔ میں نے اس کی وجہ گھر کی پریشانیاں سمجھ کر دھیان نہیں دیا تھا۔ لیکن حالات تو قابو سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔

"تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے آج کل؟"

"میری ماں نے مجھ پر جادو کر رکھا ہے۔ وہ کالی ڈائن تمہارا گھر اُجاڑ رہی ہے۔ یہی کہتی پھرتی ہو نا لوگوں سے؟" وہ چیخا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم۔ کس سے کہا ہے کچھ میں نے؟"

"سب سے کہتی پھرتی ہو ایسی بے ہودہ باتیں۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟"

"تمہاری قسم میں نے کبھی ایک لفظ بھی نہیں نکالا زبان سے۔"

"تو یہ لڑکیاں جھوٹ بولتی ہیں؟" اُس کا اشارہ اپنی بہنوں کی طرف تھا۔

"ہاں"

"میری ماں بھی جھوٹ بولتی ہے؟"

"بالکل جھوٹ بولتی ہے۔"

"میری ماں کو جھوٹی کہتی ہے حرام زادی۔" وہ ہاتھ اُٹھا کر میری طرف لپکا۔ میں ایک طرف ہو گئی۔ اس خیال سے کہ دوسرے کمرے میں اس آپسی تکرار کی آواز نہ جائے میں دروازہ بند کرنے کو ہوئی تو دیکھا کہ پرم پال کی ماں دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی مجھے دیکھتے ہی وہاں سے ہٹ گئی۔

"دروازہ کیوں بند کر رہی ہو؟" وہ بولا

مجھے غصّہ تو بے حد تھا لیکن میں خاموش رہی۔ پرم پال نے میری خموشی کو اپنی بے عزتی سمجھا۔ اس کو میری کمزوری بھی سمجھا کہ میں نے خموشی سے اتنی بڑی گالی برداشت کرلی تھی۔ مجھے کمزور سمجھ کر پرم پال شیر ہو گیا۔

"دھکّے دے کر گھر سے باہر نکال دوں گا"۔

"تو تم اپنی ماں اور بہنوں کے کہنے میں آکر اپنا گھر برباد کرنا چاہتے ہو۔؟"

"ہو جانے دو برباد میں اور گھر بسا لوں گا"۔

"تو بات یہاں تک آ پہنچی ہے۔ بہنوں کے لیے تو آج تک کوئی لڑکا ملا نہیں۔ خود دوسری بار گھر بسانا چاہتے ہو۔ شرم کرو پرم پال" پرم پال پر تو جیسے بھوت سوار ہو گیا تھا۔ اُس نے کرسی سے اٹھ کر مجھے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا اور پھر میز پر پڑی چائے کی پیالی زور سے مجھ پر ماری۔ چائے تو خیر پڑے پڑے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ لیکن پیالی کا کونہ پورے زور سے میرے ماتھے کے عین درمیان میں لگا۔ ماتھے سے خون بہنے لگا پرم پال کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ چلّا رہا تھا۔

"حرام زادیو تماشہ دیکھ لو تم" وہ اپنی بہنوں کو مخاطب کر رہا تھا۔ جو باہر کھڑی تھیں۔

وہ گھر سے باہر نکل گیا اور پھر نہیں لوٹا۔

کئی دنوں تک پرم پال گھر نہیں آیا۔

کئی دنوں تک گھر میں مرگھٹ جیسی خاموشی رہی۔

کئی دنوں تک میرے ماتھے کا زخم نہیں بھرا

اور کئی دنوں تک میں اسکول سے چھٹی پر رہی۔

میری زندگی کی یہ دراڑ پھر نہیں بھر سکی۔ اُس دن کے بعد کبھی نہیں جس دن میں نے بلرام کو جنم دیا تھا۔ میں کٹ گئی تھی اپنے گھر سے' اپنے ماحول سے' اپنے حالات سے اور خود اپنے آپ سے بھی۔ اگر عورت کو اس طرح ذلیل ہو کر جینا ہے تو میں نہیں جی پاؤں گی۔ اگر جیوں گی تو ذلیل نہیں ہوں گی۔ جنم سے پہلے میرے پیٹ میں بلرام کی پوزیشن ٹھیک نہیں تھی لیکن پیدا ہونے کے بعد اُس نے میری پوزیشن ایک دم ٹھیک کر دی تھی۔

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بلرام کے بعد اب میرے کوئی اولاد نہیں ہو گی۔

میری کوکھ میں اب کوئی نیا انسان پرورش نہیں پائے گا۔

وہ مقدس باپ اب میری کوکھ میں کوئی صلیب نہیں گاڑے گا۔

میں اب کسی کو بھی کسی اور آنے والی سہاگ کا پیغام نہیں دوں گی۔

میرے ماتھے کا زخم تو بھر گیا لیکن زخم کی جگہ ایک جلتی ہوئی گرم مہر میری جِلد کے ساتھ چپک کر رہ گئی۔ میں جب بھی آئینہ دیکھتی میرے ماتھے پر چپکی مہر جلنے لگتی اور مجھے محسوس ہوتا کہ تپش کی ایک جُھلس دینے والی رَو میرے تمام جسم میں پھیلنے لگی تھی۔

بلرام ابھی دس ہی دن کا تھا کہ میں نے پرم پال کا گھر چھوڑ دیا۔

پرم پال سنگرُور گیا ہوا تھا۔ یہاں ہوتا تو یقیناً روکتا اور ہو سکتا ہے میں رُک بھی جاتی اور میرا ارادہ ڈگمگا جاتا۔ اچھا ہُوا وہ یہاں نہیں تھا۔ میں نے پرم پال کی کالی کلوٹی جھگڑالو ماں کو چھوڑ دیا۔ میں نے اس کی بہنوں کو بھی چھوڑ دیا جو مستقل بے کاری اور کنوارے پن کی وجہ سے اپنا دماغی توازن کھوتی جا رہی تھیں۔ میں نے اپنی ماں کو بھی چھوڑ دیا، جو اُن دنوں بہت بیمار تھی۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ میں کہاں جا رہی تھی۔

اور یوں میں نے بیس برس کا بن باس کاٹا ہے۔ سب سے ایک دم کٹ کر، سب سے الگ ہو کر۔ اُس حبس بھری چار دیواری سے دُور جس کے تحفظ نے مجھے ڈرپوک اور بُزدِل بنا ڈالا تھا۔

اور یُوں میری زندگی میں آیا میرا پہلا مرد، پرم پال، میرے نہ چاہنے پر بھی میری زندگی سے آپ ہی آپ نکل گیا۔ مجھے اس کے لیے زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑی۔ ہو سکتا ہے اُس نے دوسری بار اپنا گھر بسا لیا ہو جس کے طعنے وہ اکثر دیا کرتا تھا۔

میں نے بلرام کو اپنی مرضی کے مطابق سنوارنے اور نکھارنے کی کوشش کی ہے۔

میں سمجھتی ہوں میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی ہوں۔

لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک عجیب سانحہ ہوا ہے۔

بلرام اپنے ساتھ ایک لڑکی کو لے کر آیا تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اُس نے کبھی مجھ سے کوئی بات چُھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اُس نے اُس لڑکی کا تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا۔

"ماں، یہ میری دوست رنجُو ہے"۔ اور اس لڑکی نے بڑے ادب سے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"نام ٹھیک سے بتاؤ بلرام" میں نے اس لڑکی کو اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے، ذرا تیکھے انداز سے کہا۔

"رنجنا، ماں جی۔" لڑکی نے بڑے ادب سے جواب دیا۔
بلرام ایک طرف کھڑا مسکرا رہا تھا۔ گھبراہٹ نہیں تھی اُس کے رویے میں، بڑا آتم وشواس تھا اُس میں۔
"ہم دونوں نے اکٹھے ہی امتحان دیا ہے۔" بلرام بولا
"پہلے کیوں نہیں لائے کبھی اسے اپنے ساتھ؟"
"ہمارا ایک فیصلہ تھا ماں جی" رنجنا بولی
"کیا؟"
"جب تک ہم بی اے کا امتحان نہیں دے لیتے آپ سے نہیں ملیں گے۔"
"آج ہمارا آخری پرچہ تھا اور آج میں اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔" بلرام نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"اچھا کیا تم نے۔"
"ماں میں رنجنا سے شادی کر لوں؟" بلرام نے آنکھیں جھکا کر بڑے ادب سے پوچھا۔
"نہیں" میرا بس ایک ہی لفظ کا مختصر جواب تھا۔
"کیوں؟" اُس نے اپنی جھکی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ بڑے یقین کے ساتھ۔
اور مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ رنجنا میرے بازوؤں میں کانپ سی گئی تھی۔
"تم دونوں کا آپسی تعلق کہاں تک بڑھا ہے؟"
میرے اس سوال پر رنجنا ایک دم لرز گئی۔
"بس یہیں تک" بلرام بولا
"کس حد تک؟"
"آج میں پہلی بار اسے یہاں تک لایا ہوں۔"
"اس کے علاوہ؟"
رنجنا پسینے سے بھیگ رہی تھی۔ میں نے اپنے بازوؤں کا گھیرا مضبوط کر لیا تاکہ اُسے تحفظ کا احساس ہو۔
"اس کے علاوہ کچھ نہیں" بلرام نے جواب دیا۔
"شادی کے بعد اِسے کہاں رکھو گے؟"

"تمہارے پاس اور کہاں ؟"

"قید کرنے کے لیے ؟"

"نہیں، تمہاری سیوا کرنے کے لیے۔"

"اِسے غلام بنانا چاہتے ہو ؟"

میرے اس سوال کا جواب بلرام کے پاس نہیں تھا۔ وہ کچھ لمحے ایک ٹک مجھے گھورتا رہا اور پھر بولا "میں نے رنجنا کو سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"کیا بتا دیا ہے تم نے، تم ایکدم گدھے ہو۔" میں نے دُرشت لہجے میں کہا۔

بلرام مجھے ایکدم گھورے جا رہا تھا خاموشی سے اور رنجنا پسینے سے بھیگتی جا رہی تھی۔

"میرے بارے میں بات کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھا تھا تم نے ؟"

"یہ میری غلطی ہے۔" وہ دھیرے سے بولا۔

مجھے لگا بلرام کے جواب پر میرے ماتھے کا ابھرا ہوا زخم ایک دم بڑی شدت سے جلنے لگا تھا۔

"تمہیں کسی کے بارے میں بنا اس کی اجازت کے کچھ بھی کہنے کا حق نہیں پہونچتا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ماں جی۔" پسینے میں بھیگی رنجنا نے اپنی آنکھیں اُونچی کر کے مجھے مخاطب کیا۔

"رنجنا نے تمہیں اپنی ماں کے بارے میں کچھ بتایا ہے ؟" میں نے بلرام سے سوال کیا۔

"میری ماں نہیں ہے ماں جی" رنجنا سُلگ اٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے اپنے دوپٹے کے پلّو سے اُس کے آنسو پونچھے تو وہ اور زور سے رونے لگی۔

"مجھے افسوس ہے رنجنا" میں نے اُس کا ماتھا چُومتے ہوئے کہا، میں جب چائے بنا رہی تھی تو رنجنا چپ چاپ رسوئی میں کھڑی رہی۔ پھر اُس نے پیالیاں صاف کر کے میز پر رکھیں اور پھر خود ہی گرم پانی کیتلی میں ڈالا اور اس میں چائے کی پتی اور پھر مجھ سے پُوچھا۔

"کتنی شکر ڈالوں آپ کی پیالی میں ماں جی ؟"

"آدھی چمچ"

"میرے پتا جی بھی آدھی چمچ پیتے ہیں۔"

"کیا کرتے ہیں تمہارے پتا جی ؟"

"سکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔"

جب وہ تینوں پیالیوں میں چائے بنا چکی تو صوفے پر بیٹھ گئی۔ میری پیالی میرے ہاتھ میں دینے کے بعد وہ چائے پینے لگی۔ بلرام نے اپنی پیالی خود ہی اٹھالی تھی۔

"تم بلرام سے بہت پیار کرتی ہو؟"

"جی" اُس نے آنکھیں جُھکاتے ہوئے کہا۔

"میں بھی بلرام کے پتاجی سے بہت پیار کرتی تھی۔"

میری بات سن کر رنجنا خاموش رہی۔

"جانتی ہو عورت کو اُس کے پیار کے بدلے میں کیا ملتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"وشواس، ماں جی" وہ دِھیرے سے بولی۔

"نہیں۔ یہ صرف عورت کی آرزو ہوتی ہے۔ اُسے وشواس نہیں ملتا صرف عمر بھر کی غلامی ملتی ہے۔"

بلرام بڑی ڈری ڈری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"مرد عورت کا وشواس خریدتا ہے۔ ایک چھوٹی سی گھٹن بھری چار دیواری کے بدلے میں۔ اور ایک دن اُسی چار دیواری کی زہر بھری سڑاند میں وہ دم توڑ دیتی ہے۔"

"ایسا نہ کہو ماں جی" بلرام نے مجھے ٹوک دیا۔ کتنا اتھاہ درد تھا اُس کی آواز میں۔

"مگر ایسا ہوتا ہے میرے بیٹے۔ ایسا ہی ہُوا ہے میرے ساتھ۔ ایسا ہی ہو رہا ہے ہزاروں عورتوں کے ساتھ۔ مرد عورت کو ایندھن بناتا ہے۔ عورت مرد کی بنائی ہوئی بھٹی میں عمر بھر تِل تِل جلتی رہتی ہے۔ میں نے بلرام کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"کیا تم رنجنا کو بھی ایسی ہی بھٹی میں جلانا چاہتے ہو؟" میں نے بڑے تیکھے لہجے میں بلرام سے پوچھا۔

"ہرگز نہیں ماں ہرگز نہیں" وہ زور سے چیخا اور پھر صوفے سے اٹھ کر میرے ساتھ لپٹ گیا۔ میں نے اس کے چہرے کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

"تم وعدہ کرو کہ رنجنا کو غُلام نہیں بناؤ گے۔ اس کی آزادی پر پہرے نہیں بٹھاؤ گے؟"

"میں تمہاری قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں۔" اُس نے مجھے زور سے جھنجھوڑ دیا۔

اُسی لمحہ رنجنا میرے پاؤں پر گر پڑی۔

"اتنا کڑا امتحان نہ لو اپنے بیٹے کا ماں جی" اُس کے گرم گرم آنسو میرے ٹھنڈے پاؤں کو بھگو رہے تھے۔

میں نے بلرام کو اور رنجنا کو اُٹھا کر اپنے سے لگا لیا۔

"اپنے پتا جی سے کہنا میں اُن سے ملنے آؤں گی۔" میں نے رنجنا سے کہا۔

"سچ !!" رنجنا کی آنسو بھری آنکھیں چمک اُٹھی تھیں۔

"جاؤ اسے گھر چھوڑ آؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔" میں نے بلرام سے کہا اور ساتھ ہی اُس کے گال بھی تھپتھپا دیئے۔

بلرام اور رنجنا ابھی ابھی گئے ہیں۔

اور میں اپنی زندگی میں آئے دوسرے مرد کے بارے میں سوچ رہی ہوں، جو میرا بیٹا ہے۔

کاش میری زندگی میں آئے پہلے مرد کا سایہ تک نہ پڑے دُوسرے مرد پر ——!

دُوسرا مرد میرا بڑا ہی معصوم اور پیارا بیٹا ہے۔

بلرام!

ہم سب گواہ ہیں

(پنڈت جی کے آخری سفر کی کہانی)

دہلی کے تین مورتی مارگ پر بنگلے میں کھڑی تین مورتیاں ایک دم خاموش ہیں۔ خاموش، بے جان اور ساکت۔ ان کے سامنے لوہے کا بڑا سا گیٹ بند ہے۔ گیٹ کے باہر بے شمار لوگ آہنی سلاخوں کو پکڑے کھڑے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر سسکیاں ہیں۔ گیٹ کے اندر وشال بھون میں ایک دردناک فضا ہے۔ اس عمارت کی دیواروں کو ناز اور شان بخشنے والا انسان اس سے وداع ہو گیا ہے۔ کروڑوں انسانوں کی دھڑکنوں میں سمایا ہوا شخص، انھیں ایک دم چھوڑ گیا ہے۔ جس نے ایک بار ان لوگوں کے لیے کہا تھا۔

"IF ANY PEOPLE CHOSE TO THINK OF ME THEN I SHOULD LIKE THEM TO SAY: THIS WAS THE MAN WHO WITH ALL HIS MIND AND HEART, LOVED INDIA AND INDIAN PEOPLE. AND THEY IN TURN, WERE INDULGENT TO HIM AND GAVE HIM OF THEIR LOVE MOST ABUNDANTLY AND EXTRAVAGANTLY".

وہی اس گھڑی ان سب سے بے نیاز گہری نیند سویا پڑا ہے اور اس کے پاس اس کی اکلوتی بیٹی، جسے وہ پیار سے اندو کہا کرتا تھا اور جس کے خط درست کر کے واپس بھیجا کرتا تھا، غم والم کی تصویر بنی بیٹھی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں۔ رُوح میں اچانک بھڑکی آگ نے آنسوؤں کے سوتے خشک کر دیئے ہیں۔

شام ہو رہی ہے۔ لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی ہے۔

سب کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

سب کے ہونٹوں پر سسکیاں ہیں۔

اور سب کے من میں خواہش ہے کہ وہ ایک بار اور آخری بار اُس کے چہرے

کے درشن کرلیں جسے دیکھنے کو پھر آنکھیں ترس جائیں گی۔

اور پھر لوہے کا بڑا سا گیٹ دِھیرے دِھیرے کھُلتا ہے اور انسانوں کا ایک دریا بڑھتا ہے عمارت کے اندر، باندھ توڑ کر اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف جل تھل ہو جاتا ہے۔ انسانوں کی شرھا کی لہریں سب چیزوں کو اپنے میں سمو لیتی ہیں۔ چاروں طرف ایک اتھاہ سمندر پھیل جاتا ہے۔ اور اس سمندر میں خشکی کا ایک سفید سا ٹکڑا نظر آ رہا ہے۔ جیسے ایک غیر آباد جزیرہ ہو اور اس جزیرے میں صرف خاموشی اور سکوت ہے کہیں زندگی کی رمق نہیں صرف ایک گھُلتی ہوئی سی شمع جل رہی ہے ہلکی ہلکی سی روشنی بکھیرتی ہوئی۔ اور یہ روشنی اس سُرخ پھول کی پنکھڑیوں میں سے پھُوٹ کر نکل رہی ہے، جو اس شخص کی اچکن میں اٹکا ہے۔ رات کا اندھیرا بڑھ رہا ہے لیکن اس چراغ کی روشنی بڑی خاموشی اور عزم سے سب کے درمیان پھیل رہی ہے اور اس اُجالے میں آنکھوں کے آنسو، ہونٹوں کی سسکیاں، سینوں کی ڈھڑکن اور رُوح کی جلن نظر آ رہی ہے۔

اور یہ سب کچھ نظر آ رہا ہے صرف دو ہستیوں کو۔ ایک سفید ساڑھی میں برف بنی اِندرا کو ــــ

اور ایک لان کے کونے میں اُگے گلاب کے پودے پر اَدھ کِھلے پھول کو۔ اور وہ پھُول میں ہوں اور اس گھڑی اپنی ہی روشنی سے سب کو دیکھ رہا ہوں۔ سب کے درد کو محسوس کر رہا ہوں، سب کی محرومی کے احساس کو ماپ رہا ہوں اور اپنی پنکھڑیوں کی آنکھوں سے آنسو بہا رہا ہوں۔ میں رو رہا ہوں، بغیر آواز کے اور اپنی بے زبان آواز میں مخاطب ہو رہا ہوں، اُن سب سے جو یہاں جمع ہیں۔ یہ ایک ایسی آواز ہے جس کی کوئی گُونج نہیں، جس کے کوئی الفاظ نہیں، کوئی ارتھ نہیں پھر بھی اُس کے معنی ہیں، ایک مقصد ہے۔ ایک منزل ہے۔

گلاب کا یہ پودا بہت دنوں سے یہاں کھڑا ہے۔ اُس نے درجنوں پھُول کھِلائے ہیں۔ اور آج شاید میں آخری پھول ہوں جو اس ٹہنی پر کھِلا ہوں۔ پھر اس ٹہنی پر کوئی پھُول نہ کھِلے گا، کوئی کلی نہ چٹکے گی، کوئی خوشبو نہ اُڑے گی، کوئی رنگ نہ نکھرے گا۔

میرے ساتھ تین پھُول اور بھی ہیں۔ ہم سب صبح شام کے وقفے سے کِھلے ہیں۔ ہماری شکل و صورت، سج دھج، روپ رنگ بالکل ایک جیسا ہے۔ ہمیں مالی نے بڑے پیار اور دُلار سے پالا ہے ٹہنیوں کی تراش خراش کی ہے۔ پانی دیا ہے۔ سُوکھے پتّوں کو

الگ کیا ہے۔ نئی نئی کونپلوں کو اپنی محبت کی حرارت دی ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہم میں سے ایک پھول الگ ہو گیا ہے۔ مالی جب توڑنے آیا تو ہم سب نے اپنی اپنی گردنیں ہلا کر خود کو پیش کیا لیکن اُس نے صرف ایک پھول توڑا جو سب سے آخر میں کھلا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا مالی اس پھول کو مالک کی اچکن میں ٹانک رہا تھا کیونکہ آج ابھی تک ان کی اچکن میں پھول نہیں لگا تھا کہیں ایک کمی رہ گئی تھی جسے کسی نے ابتک محسوس نہ کیا تھا اور اب وہ کمی پوری ہو گئی تھی اور یہ وہی پھول تھا جس کی روشنی اردگرد چھائے اندھیرے میں تحلیل ہو رہی تھی۔

اور پھر اندھیرا چھٹ گیا لیکن انسانوں کی سٹردھا کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور بھی گہرا ہوتا گیا اور اس وسیع سمندر میں نظر آتا خشکی کا ٹکڑا اور بھی اونچا ہو گیا۔ طوفان بھی اُٹھا تھا۔ بادل بھی کڑکے تھے مینہ بھی برسا تھا لیکن غم کی شدت ایک مقام پر رُک گئی تھی۔ ماحول ساکن ہو گیا تھا۔ مشرق کے جھروکے سے سورج نکلا تھا اُس کی کرنوں نے عمارت کے درودیوار کے ساتھ لگ کر سسکیاں بھری تھیں اور اُس ہستی کو گھر کے ایک ایک کونے میں تلاش کیا تھا جو اِن کرنوں کو سمیٹ کر ایک مشعل بنا رہا تھا جس کی روشنی میں وہ دنیا کے ہر فرد بشر کو امن، محبت اور بھائی چارے کا راستہ دکھانے کا عزم رکھتا تھا۔

گیتا، قرآن، جپ جی صاحب کا پاٹھ ہو رہا تھا۔ رُندھے ہوئے گلے سے رام دُھن کا اُچارن ہو رہا تھا۔ اور اپنے مالک کو گھر سے سدا کے لیے وداع کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں سبز سبز پتوں کی اوٹ سے گردن اٹھا اٹھا کر سب کچھ دیکھ رہا تھا اور ان کلیوں کو بتا رہا تھا جو کانٹوں کے ساتھ لگی سسک رہی تھیں اور لہولہان ہو رہی تھیں۔

اور پھر آسمان کو دہلا دینے والی ایک چیخ گونجی اور گھر کا مالک گھر سے جُدا ہو گیا۔ ایسا مالک جس کا گھر صرف اس تین مورتی مارگ کی عمارت کی دیواروں پر مشتمل نہیں تھا۔ اس کا گھر تو ہمالیہ کی چوٹیاں تھیں، ہند مہاساگر کی ترنگیں تھیں اجنتا اور ایلورا کے غار تھے۔ گنگا اور جمنا کی لہریں تھیں لال قلعہ اور جامع مسجد کی سرخی تھی غالبؔ اور ہمایوں کے خواب تھے۔ بہادر شاہ ظفر اور شیواجی کے خاکے تھے۔ گوتم بُدھ کے اصول تھے چاروں طرف لہلہاتے کھیت تھے۔ گیہوں کی بالیاں اور دھان کے خوشے تھے ترنجنوں کے گیت اور لوک ناچوں کی آن تھی۔ اور آج جب اتنے بڑے گھر کا مالک گھر سے جُدا ہو رہا تھا تو سبھی رو رہے تھے۔

ہمالیہ کی چوٹیاں اور ہند مہا ساگر کی لہریں رو رہی تھیں گوتم اور نانک کے اقوال سسک رہے تھے۔ اجنتا اور ایلورا کے بت آنسو بہا رہے تھے۔ کھیتوں میں گیہوں کی بالیاں کانپ رہی تھیں اور ترنجنوں کے گیت اور لوک ناچوں کی آن تڑپ رہی تھی۔

میں یہ سب دیکھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا لیکن خاموش تھا۔ میری طرح میری بہن بھی خاموش تھی، جس کو لوگ اِندرا پریہ درشنی کہہ کر پکارتے تھے اور آج جس کے چہرے پر زمانے بھر کی مایوسی پھیل گئی تھی۔

اور اس کے الفاظ "باپُو الوداع"۔

فضا میں گونج رہے تھے اور سُرخ سُرخ شعلے لپک رہے تھے اور چاروں طرف آنسوؤں کا سمندر پھیلا تھا اور کچھ ہی سو گز کے فاصلے پر بُدھ اور عیسیٰ کا نام لیوا جسے کچھ ہی برس پہلے کروشی فانی کر دیا گیا تھا اپنی خاموش آواز میں کہہ رہا تھا۔

"میرا ہندوستان نہرو کے ہاتھوں میں محفوظ رہے گا"

میں نے یہ سب کچھ سُنا ہے میں اس کا ساکھشی ہوں اور میرے ساتھ ہزاروں میرے ساتھیوں نے بھی اسے سُنا ہے میرے وہ ساتھی جو جانے کہاں کہاں پھیلے تھے اور اب پنڈت نہرو کے قدم چومنے کے لیے سینکڑوں میلوں کا فاصلہ طے کر کے یہاں پہنچے تھے۔ وہ سب اس دعوے کے ساکھشی ہیں۔

جب اِندرا واپس لوٹی تو وہ وشال بھون ایک کھنڈر بن چکا تھا، جس میں یادوں کے چراغ جل رہے تھے اور خوابوں کے پھول مرجھا رہے تھے۔

ایک دن اور بیت گیا۔

ایک یُگ ختم ہو گیا۔

ایک زمانہ سو گیا۔

اور پھر پو پھٹی اور لال قلعے پر جھکا ہوا جھنڈا سر نہوڑائے اپنی یادداشت میں پچھلے سینکڑوں سال کی تاریخ کو دہرا رہا تھا۔

وسیع عمارت کی اُداسی اور غم کی چادر اوڑھے، اس گھر کا پرانا ملازم ہیرا لال آ رہا تھا میری طرف۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، اُس کی اُداس آنکھیں رو رو کر سُوج گئی تھیں اُس کے قدم میری طرف بڑھتے آ رہے تھے وہ بالکل میرے قریب

پہنچ گیا تھا۔ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ وہ رو پڑا۔ شبنم کے چند قطرے میری پنکھڑیوں سے ٹکرا کر پتوں پر جم گئے۔ یہ پنکھڑیاں ہی تو میری پلکیں ہیں۔ رات جب روتی ہے تو اس کے آنسو ان پلکوں پر ہی تو جمتے ہیں۔ میں نے کئی بار رات کو روتے دیکھا ہے رات تب ہی روتی ہے جب کسی سہاگن کا سیندور لٹتا ہے۔ وہ اس لمحے بھی روتی ہے جب کوئی بچہ یتیم ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت بھی آنسو آتے ہیں جب فٹ پاتھ پر سویا ہوا کوئی بھکاری سردی سے اکڑ کر مر جاتا ہے۔ وہ اس پل بھی سسک اٹھتی ہے جب کوئی بے گناہ پھانسی کے تختے پر جھول جاتا ہے۔ رات آج بھی جی بھر کر روئی تھی۔ اس لیے کہ آج سبھی کچھ ہوا تھا' سہاگنوں کا سیندور بھی لٹا تھا' یتیمی کا وار بھی ہوا تھا' فٹ پاتھوں پر جاڑے سے بھی موتیں ہوئی تھیں۔ بے گناہ بھی پھانسی پر لٹکے تھے۔ رات کی پلکوں پر آنسوؤں کی نمی تھی۔ اور اس کے ہونٹوں پر سسکیوں کی جلن تڑپ رہی تھی۔ میری ہمت نہ ہوئی کہ ہیرالال کی سوجی ہوئی آنکھوں کو جی بھر کر دیکھ سکوں۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔

اور جب ہیرالال نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے میرے ساتھ کھلے ہوئے دوسرے پھول کو توڑ کر اسے اپنے غم کی چادر میں چھپا لیا تو میری روح میں سینکڑوں کانٹوں کی نوکیں ٹوٹ کر رہ گئیں۔

اور میں نے سنا اس دلدوز آواز کو جو شانتی گھاٹ کی گرم راکھ سے ابھری تھی' جب اس پر دودھ اور پانی چھڑکا گیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے کانوں میں کوئی ابلتا ہوا سیسہ ڈال رہا تھا۔ میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ گھر کا مالک راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ کل شام لپکتے ہوئے شعلے گرم راکھ میں بدل گئے تھے۔ میں اب سن تو نہیں رہا تھا۔ میرے کانوں میں چیخوں کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ہونٹوں پر لرزتی ہوئی سسکیاں مجھ تک نہ پہنچ رہی تھیں لیکن میری آنکھوں میں جو تیں جل اٹھی تھیں۔ روشنی اور تیز ہو گئی تھی جیسے کل کے لپکتے ہوئے شعلے میری آنکھوں میں سما گئے تھے۔ میں نے دیکھا ایک دم حیرت زدہ اور بنا پلک جھپکائے۔ ہیرالال سر جھکائے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ٹھنڈی ہو چکی راکھ کے ڈھیر کے پاس آیا۔ پل بھر کو رکا۔ اس کے ہونٹوں سے ایک چیخ نکلی' اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی ٹوٹی اور اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے غم کی چادر میں چھپایا وہ گلاب کا پھول جو صبح اس نے توڑا تھا نکال کر راکھ کے ڈھیر پر رکھ دیا۔

"میرے مالک یہ اپنا من چاہا پھول سویکار کیجئے۔" پاس کھڑے لوگوں کی چھاتی پھٹ

گئی۔ وہ تھکے ہوئے قدم اٹھاتا لوٹ گیا۔

سرخ پھول ٹہنی پر کھلا ہوا دوسرا گلاب، راکھ کے ڈھیر پر پڑا رو رہا تھا لیکن سسکیاں منتروں کے اُچارن میں ڈوب گئی تھیں۔

اور پھر راکھ بھرا کلش تین مورتی مارگ کے وشال بھون کی آخری امانت بن کر شردھا اور عقیدت کا خراج وصول کرتا رہا، جسے مرد اور عورتیں ہزاروں کی تعداد میں آنسوؤں کی شکل میں پیش کرتی رہیں۔

میں یہ سب دیکھتا رہا اور کانٹوں سے لہولہان ہوتی کلیاں سرگوشیوں میں مجھ سے درد کی داستان سنتی رہیں۔ ایک یُگ اور بیت گیا۔ کروڑوں لمحوں کا ایک عظیم قافلہ ماتمی چال سے وقت کی راہوں پر سے گزر گیا، اسے شاید منزل کی تلاش تھی اندھیرے میں۔ اندھیرے میں بھلا منزلیں کہاں ملتی ہیں؟

اس گہرے اندھیرے میں کئی قافلے چلتے چلتے ایک دم رُک گئے تھے۔ کئی راستے ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھے تھے۔ کئی منزلیں اپنا نشان گنوا رہی تھیں۔ اسی اندھیرے میں اپنے ساتھ کلیوں کو چمٹائے میں سوچ رہا تھا کہ ہم سب اب کہاں جائیں گے؟ ہماری منزلیں ہمیں اپنائیں گی کہ نہیں۔ عمارت کے وسیع احاطے میں اُگا ہر پیڑ، ہر بوٹا، ہر بیل، ہر پھول، ہر کلی یہی سوچ رہی تھی۔ اب ہم کہاں جائیں گے؟ اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ اب ہمارے سامنے کون سا راستہ ہے؟

ہماری سوچوں سے رات کا اندھیرا بوجھل ہو کر اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ سناٹا اور بھی شدید ہو گیا تھا۔

اندھیرے کی اس خاموشی میں ایک دھڑکن جاگی، ایک آواز گونجی۔ میں اس آواز کو پہچانتا تھا۔ یہ آواز میں پہلے بھی کئی بار سُن چکا تھا۔ اس فضا میں، اسی ماحول میں، اسی عمارت کے اندر۔ یہ پنڈت نہرو کی بہن کی آواز تھی۔ وجے لکشمی پنڈت کی، اُس عورت کی جس کے چہرے کو میں ایک ٹک دیکھتا رہتا تھا۔ کتنی جاذبیت اور جلال تھا اس چہرے پر! اور وہی چہرہ اب کیسے بجھ گیا تھا۔ جیسے جلتی ہوئی مشعل پر کسی نے ایک دم پردہ ڈال دیا ہو۔

میرے اور ہم سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ وجے لکشمی پنڈت کی آواز دھیرے

دھیرے اُبھر رہی تھی۔ وہ اپنے عزیز بھائی کی وصیت سے کچھ اقتباسات پڑھ کر سنا رہی تھیں اُس کی آواز میں درد تھا اور گلا رُندھ رہا تھا۔

"گنگا ندی کا تصور میرے ذہن میں ہمیشہ یہ رہا ہے کہ یہ بھارت کے ماضی کی علامت ہے" جو زمانۂ حال سے گزرتی ہوئی مستقبل کے مہاساگر کی طرف بہہ رہی ہے۔ اگرچہ میں نے ماضی کی بہت سی روایات اور رُسوم کو ترک کر دیا اور میری زبردست خواہش ہے کہ بھارت کو ان تمام بندھنوں سے نجات حاصل ہو، جو اس ملک کے بہت سے لوگوں پر بوجھ بنے ہوئے ہیں، ان کے پھلنے پھولنے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور ان میں نفاق پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ تاہم ماضی سے اپنا رشتہ بالکل ہی نہیں توڑ لینا چاہتا۔ مجھے اپنے عظیم ورثے پر فخر ہے اور مجھے اس امر کا احساس ہے کہ میں بھی بھارت کے دوسرے لوگوں کی طرح اس زنجیر کی ایک کڑی ہوں، جس کا ایک سرا بھارت کی قدیم ترین تاریخ تک پہنچتا ہے۔ بھارت کے ثقافتی ورثے کے تئیں آخری عقیدت کے طور پر میں یہ درخواست کر رہا ہوں کہ میری مٹھی بھر استھیاں الٰہ آباد کے مقام پر گنگا ندی میں بہا دی جائیں تاکہ وہ اس مہاساگر میں مل جائیں جو بھارت کے ساحل کو چھو رہا ہے۔ میری استھیوں کا بیشتر حصّہ ہوائی جہاز کے ذریعہ ان کھیتوں میں بکھیر دیا جائے جہاں بھارت کے کسان محنت و مشقت کرتے ہیں تاکہ میری راکھ ہندوستان کی مٹی اور خاک میں اس طرح مل جائے کہ الگ سے اس کا وجود باقی نہ رہے۔"

ہائے دھرتی سے کتنا پیار تھا اس کو۔ ہم دھرتی پر رہنے والوں کو ایک دم تنہا اور بے سہارا چھوڑ کر وہ آسمان کی وسعتوں کی طرف پرواز کر گیا تھا۔ اسے پہاڑ اور دریا پسند تھے۔ اسے گنگا سے اس لیے محبت تھی کہ وہ اسے روشن ماضی کی روایات کی امانت دار نظر آتی تھی اس میں حال کے حسین خاکوں کے لئے رنگ اور مستقبل کے سنہری خوابوں کی رُوپ ریکھا تھی اس کی لہروں میں ماضی، حال، مستقبل کا یہ تسلسل کتنا عزیز تھا پنڈت جی کو، اس لیے انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ان کی راکھ کی ایک مٹھی گنگا میں بہا دی جائے تاکہ وہ ایک عظیم مستقبل میں تحلیل ہو کر رہ جائے گا۔

اور پھر ایک صبح کشتی میں راکھ کا کلس لہروں پر سے گزرتا ہوا اُس مقام کی طرف جا رہا تھا جہاں گنگا جمنا ملتی ہیں اور جہاں سرسوتی ان میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ سرسوتی جو نظر نہیں آتی، جو گپت ہے۔ جو ان دو ندیوں کے نیچے بہتی ہوئی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔

جسے کوئی دیکھ نہیں سکتا لیکن جس کی مہانتا کو ہر کوئی تسلیم کرتا ہے۔ اور آج سنگم پر ایک اور دریا چل رہا تھا، ایک بہت بڑی شخصیت کا دریا جس کی ہلکی سی لہریں تینوں ندیوں کی لہروں کو اپنے بازوؤں میں لے کر انھیں امر کر رہی تھیں۔ ایک ایسا دریا جو دیکھنے میں صرف راکھ کی ایک لکیر، اور بے شمار پنکھڑیوں کی ایک قطار نظر آتی تھی، پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی، لیکن جس میں کروڑوں ہندوستانیوں کی بھاونائیں ملی تھیں، لاکھوں سوچنے والوں کے دماغوں کی روشنی میں سینکڑوں ہاتھوں کا مشعل بردار اجالا تھا اور اس میں وہ سہن شیلتا تھی جسے ہماری پرمپراؤں نے جنم دیا تھا اس میں وہ ٹھہراؤ تھا جو ہماری تہذیب کا امانت دار تھا۔ اس میں وہ زور تھا جو ہمارے ارادوں کی دین تھا اور یہ چوتھا دریا اپنے آغوش میں تینوں ندیوں کو لیے بڑھے جا رہا تھا ہند مہاساگر کی طرف، انھیں بھی سمندر میں بدل ڈالنے کے لیے۔

اور چاروں دریاؤں کی ایک لہر پر ڈولتا ہوا میری ٹہنی پر میرے ساتھ کھلا ہوا تیسرا پھول تھا، جسے سنجے اور راجیو توڑ کر لے گئے اپنے معصوم ہاتھوں سے آخری بھینٹ پیش کرنے۔ اور وہ پھول اپنی بھیگی ہوئی پنکھڑیاں لیے سورج کی کرنوں میں چمکتا ہوا بہا جا رہا تھا اور اُسے میری یاد آ رہی تھی۔ میری یاد جسے وہ اکیلا چھوڑ گیا تھا اس اداس اور غمگین فضا میں سسکنے کے لیے۔

اور پھر اس سارے المیے کی آخری کڑی تشکیل پا رہی تھی۔

اتنے بڑے گرنتھ کا انتم ادھیائے لکھا جانے والا تھا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کا آخری روشن کنارہ افق کی وسعتوں میں ڈوبنے جا رہا تھا۔ وصیت میں لکھی آخری خواہش کی تکمیل ہونے والی تھی۔

پنڈت نہرو کی راکھ ان کھیتوں میں بکھیری جانے والی تھی جہاں ہندوستان کے کسان اپنا خون پسینہ ایک کرتے ہیں اس لیے کہ راکھ کے وہ ذرے بھارت کی دھرتی میں سما کر ایک ہو جائیں۔

ہوائی جہاز راکھ لیے اُڑ رہے تھے۔ پہاڑوں اور میدانوں پر، گلشیروں اور سوکھی چٹانوں پر، جنگلوں اور سمندروں کو چھوتے ساحلوں پر، قلعہ احمد نگر کے گرد پھیلے کھیتوں پر بکھر رہے تھے راکھ کے ذرے۔ اس کی دیواروں میں پنڈت جی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اپنی دھرتی کو آزاد کرانے اور اس کی تقدیر سنوارنے کے خواب دیکھے تھے۔

یہ راکھ جیسے اُس تصویر کو آخری ٹچ دے رہی تھی۔ انڈیمان اور لنکادیو جزیرے، پنجم اور راج کوٹ، کنیا کماری اور تری وینڈرم، کھونیشور اور امپھل، ملک کے چاروں کھونٹ ان کی راکھ کے ذرے بکھیر دیئے گئے کہ ان کے خواب دھرتی میں مل کر اس کا ایک جزو بن جائیں۔

میرے کانوں میں ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ گونج رہی تھی اور میں اکیلا اپنی ٹہنی کے ساتھ لگا سوچ رہا تھا کہ اب میرا کیا ہوگا؟ یوں بے سہارا پڑے رہنے سے کیا فائدہ۔ میرے باقی تین ساتھی خوش قسمت تھے کہ میرا ساتھ چھوڑ کر مکتی پراپت کر گئے۔ انھیں نروان مل گیا۔ اور میں یہاں تین مورتی مارگ کے سامنے بڑی سی عمارت کے ایک کونے میں پڑا سسک رہا تھا۔ میرے پاس دُبکی کلیاں کانٹوں سے لہولہان ہوکر مجھ سے بات کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن میں خاموش تھا۔ وہ مجھ سے سُننا چاہتی تھیں ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنوں کی کہانی۔ لیکن میری زبان جیسے کٹ گئی تھی۔ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ میں تو قوت گویائی سے محروم ہو گیا تھا۔

کلیوں نے بات کرنا چاہی۔

پتیوں نے سرگوشی کی۔

کانٹوں نے سوال کیے۔

لیکن میرے پاس کسی بات کا جواب نہیں تھا۔

میں تو خود ایک سوال بن کر ٹہنی کے ساتھ ساکن لٹکا تھا۔ کاش اس سوال کا کوئی جواب مل سکے۔ اور پھر اچانک ہوا کا ایک تُند ریلا آیا اور میرے چاروں طرف جیسے بگُولے سے ناچنے لگے، میں جیسے بے ہوش سا ہو گیا ——— مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا ہو رہا تھا۔ احساس ہو رہا تھا جیسے میں اُڑ رہا ہوں، ٹہنی سے ایک دم الگ ہو گیا ہوں، ہوا کے کندھے پر سوار ہو کر کہیں جا رہا ہوں، آسمان کی طرف، بلندیوں کی سمت اور جب مجھے ہوش آیا جب میں نے اپنے آپ کو سنبھالا تو میں نے دیکھا میں پہاڑوں کے اوپر سے اُڑتا ہوا ایک وادی کی طرف آ رہا تھا، بلندی سے کم بلندی کی طرف۔ نیچے سرسبز گھاس پھیلی تھی۔ ایک ندی کا نیلا پانی بہہ رہا تھا اور اس میں گول گول پتھر بڑے لہروں کا راستہ روک رہے تھے۔ میں نے آنکھیں جھپکیں، دوبارہ جھپکیں، میں شاید خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے آپکو جھنجھوڑا۔

نہیں خواب نہیں تھا۔ حقیقت تھی۔ میرے قریب تو اندرا جی بیٹھی تھیں۔ سفید ساڑھی لپیٹے اداس نگاہوں سے نیچے پھیلی وادی اور اس میں بہتی ہوئی ندی کو دیکھتی۔ یہ پہلگام کی وادی تھی۔ جہاں وہ اپنے پتا کے ساتھ کئی بار آئی تھیں اور جس سے انہیں ذہنی لگاؤ تھا۔

اور پھر اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور اُس سرخی سے اُس کہانی کی آخری سطر لکھ دی گئی۔ راکھ کی آخری مٹھی ندی کی لہروں پر بکھیر کر پچھتر برس سے لکھے جاتے ہوئے گرنتھ کی تکمیل کر دی تھی۔

میں نے سفید آنچل کو آخری بار چھوا۔

گھر کی مالکن آخری بار پرنام کیا۔

اور گرنتھ کے آخری صفحے پر گر کر مکت ہو گیا۔

مجھے بھی نروان مل گیا اور میرے ساتھ اُن ہزاروں پھولوں کو بھی جنہوں نے انتم پوجا میں حصہ لیا تھا اور اب میں اور میرے تینوں ساتھی گلاب کے پھول جو میرے ساتھ گلاب کی ایک ہی شاخ پر کھلے تھے اور پھر دھیرے دھیرے جُدا ہو گئے تھے۔ ہم سب ساکھشی ہیں اس بات کے کہ راکھ کے ان ذرّوں سے جو ملک کے کونے کونے میں بکھرے ہیں ہندوستان کا مستقبل بنے گا ایک روشن اور مضبوط مستقبل۔

اور میرے ساتھ ساکھشی ہیں لاکھوں میلوں میں پھیلے ہوئے کھیت اور کنوارے میدان۔ اور برف سے ڈھکی چوٹیاں اور سمندر سے ملتے ساحل اور ان سب دریاؤں کے تٹ جہاں تہذیب نے پہلی بار سورج کی روشنی دیکھی تھی۔ اور وہ سارے کسان جو اس تہذیب کے رکھوالے ہیں اور کلائیوں میں کھنکھتی چوڑیاں اور پن گھٹوں پر گونجتے لوک گیت اجنتا اور ایلورا میں بکھرے خاکے۔ یہ سب اور ان سب کے ساتھ دلوں میں گونجتی دھڑکنیں اور ماتھوں پر رقصاں مضبوط ارادے گواہ ہیں کہ ہمیں انسان کی عظمت اور اسکی شرافت کا یقین ہے۔

یاترا سے لوٹی پوتر لڑکی

امرناتھ کی یاترا سے لوٹی ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی نے مجھ سے پوچھا، جب میں چندن واڑی کے ایک موڑ پر کھڑا یاترا سے واپس آئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

"تم شیش ناگ سے ہی لوٹ آئے تھے؟"

"ہاں"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ وہاں کی جھیل امرناتھ کی گپھا سے زیادہ خوبصورت تھی۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" اس سحر بھری آنکھوں والی لڑکی نے کہا جو دیکھنے میں ایک دیوی کے سمان پوتر لگ رہی تھی۔

"میں دراصل جھوٹ بول رہا ہوں۔"

"سچ کیوں نہیں بولتے؟"

"سچ بولنے والوں کا حشر بہت برا ہوتا ہے۔"

"تم کن لوگوں کی بات کر رہے ہو؟"

"کرائسٹ کی، بدھ کی، نانک کی، گاندھی کی؟"

"مگر انہوں نے سچ بولا ہی کب تھا؟"

"اور کیا کیا تھا انہوں نے؟"

"وہ تو صرف سچ کی تلاش کرتے رہے تھے"

"اگر سچ کی تلاش کرنے والوں کا یہ حشر ہو سکتا ہے تو سچ بولنے والوں کا کیا حشر ہوگا؟"

"وہ موکش پراپت کر لیتے ہیں۔"

یہ موکش کیا چیز ہے؟"

امرناتھ کی یاترا سے لوٹی خوبصورت لڑکی میرے اس سوال پر زور سے ہنسی اور اس کی ہنسی سے، ہمیں چاروں طرف سے گھیرے، بلند و بالا پہاڑوں کی ننگی چوٹیاں گونج اٹھیں۔

"تم جیسے پاپی جیو یہ راز نہیں جان سکتے۔"

"تو پھر کون جان سکتا ہے؟"

"امرناتھ کی گپھا کے سامنے ۱۴ ہزار فٹ کی بلندی پر کھڑے سادھو، جو اس کی تلوار کی طرح تیکھی چوٹی پر کھڑے ہو کر گپھا میں برف سے اٹی اتھاہ گہرائی میں کود جاتے تھے اور امر گنگا کے برفیلے پانی میں ان کی لاشیں ڈوب جاتی تھیں۔"

"یہ راز تو پھر وہ سادھو اپنے ساتھ ہی لے جاتے تھے۔ کھلتا کہاں تھا یہ راز کسی پر؟"

میری یہ بات سن کر یاترا سے لوٹی یوتر لڑکی گھبرا گئی۔ جب اسے کوئی جواب نہ سوجھا تو بولی۔

"تم تو کٹر ناستک ہو۔"

"یہ تو مجھ پر ایک طنز ہے، میرے سوال کا جواب نہیں۔"

سورج اونچے اونچے پہاڑوں کی اوٹ میں جا چکا تھا۔ ہم جس تنگ سی وادی میں کھڑے تھے۔ اب اس میں ان پہاڑوں کے غیر مربوط سائے رینگنے لگے تھے۔ یاتریوں کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی۔ اِکا دُکا یاتری رہ گیا تھا۔ مٹی سے اٹے خچر کے ساتھ چلتا ہوا باتوا پہلگام کا خواب لے رہا تھا، جہاں پہنچ کر وہ یاتری سے اپنی رقم وصول کرے گا اور اپنے خچر کو لدر نالے کے اوپر والے حصے میں چرنے کو چھوڑ دے گا۔ اور خود نمکین چائے کے ساتھ نمکین قلچے کھاتے ہوئے سفر کی تکان بھولنے کی کوشش کرے گا۔

تھوڑی دیر میں شاید یہ اکا دکا یاتری بھی سو جائے گا اور اونچے اونچے پہاڑوں کے سائے اور گہرے ہوتے جائیں گے۔ اس وقت یاترا سے لوٹی یہ خوبصورت یوتر لڑکی کیا کرے گی؟ اس کے بدن پر تو صرف ایک پُل اوور تھا۔ اور ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی۔ اور چہرے پر معصومیت کے ساتھ ساتھ گورے رنگ کی چکنائی تھی...... جس کے بیس پر راستے کی تمام دھول جمی تھی۔ یہ پل اوور، یہ لاٹھی، گورے رنگ کی چکنائی اور پگڈنڈی کی گہری دھول تو اسے نہیں بچا پائیں گے، ان سرد اور تیز جھونکوں سے جو تھوڑی ہی دیر میں نیند سے

جاگ جائیں گے۔ اور اس چھوٹی سی محدود وادی میں حشر برپا کر دیں گے۔

"تو تم کیا جواب چاہتے ہو۔؟"

اُس نے پوچھا

"جو آج سائنس کے دور میں جیتے ہوئے انسان کو مطمئن کر سکے۔"

"آج کے سائنسی دور کا انسان کبھی مطمئن نہیں ہو گا.... کیونکہ اس کا فیتھ ٹوٹ چکا ہے۔"

"کس نے توڑا ہے اس کا فیتھ؟"

"اس کی اپنی سوچ نے۔"

"تو سوچ کا پروسیس ختم کرنا چاہتی ہو تم؟"

"نہیں صرف فیتھ کو مضبوط کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیسے؟"

"امرناتھ کی گپھا تک جا کر۔ شیش ناگ کی جھیل سے ہی واپس آ کر نہیں۔" میں یاترا سے لوٹی اُس پوتر لڑکی کی بات سُن کر مسکرایا۔

"تم تو گپھا سے ہی لوٹی ہو نا؟"

"ہاں۔"

"کیا دیکھا تم نے وہاں؟"

"یہ پوچھو کہ کیا نہیں دیکھا۔"

"یہ نہیں پوچھوں گا؟"

"اور کیا پوچھو گے؟"

"یہی کہ تم نے گپھا میں کیا دیکھا تھا؟"

"ہزاروں کی تعداد میں یاتری جو شیو لنگ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے صبح سے ٹھنڈ میں کانپ رہے تھے۔"

"اور.....؟"

"کبوتروں کے جوڑے کی ایک ہلکی سی جھلک جو صبح سویرے ایک بار گپھا سے نکل کر شام کو ہی لوٹتا ہے۔"

"سب کو آتا ہے نظر کبوتروں کا وہ جوڑا؟"

"نہیں....."

"تو سب لوگ بیوقوفوں کی طرح کیوں اُن کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں؟"

"فیتھ، میرے ناستِک دوست صرف فیتھ؟"

"تم نے دیکھا تھا کبوتروں کا وہ جوڑا؟"

"میرے وہاں پہنچتے ہی وہ گپھا سے باہر اُڑان بھر رہا تھا۔ میں نے صرف ایک پرچھائیں دیکھی تھی اُن پوتر پنچھیوں کی۔" اس پوتر لڑکی کی بات سن کر میں ہنسا۔ اتنی زور سے کہ ہمارے اِردگرد پھیلتے ہوئے گہرے گہرے سائے بھی لرز اٹھے۔ جو اِکادُکا یاتری واپس جا رہے تھے ان کی تعداد بھی اب بہت کم ہو گئی تھی۔ شاید سب اپنی اپنی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ میری ہنسی شاید خاموش وادی میں زیادہ بلند ہو گئی تھی۔ وہ لڑکی بولی۔

"تم اتنی زور سے کیوں ہنس رہے ہو؟"

"جب بھی میرا کوئی مخالف ہارتا ہے تو میں زور سے ہنستا ہوں۔"

"تم سمجھتے ہو کہ میں ہار گئی ہوں۔"

"نہیں...... ہار رہی ہو۔"

"میں ہاروں گی نہیں۔"

"ہر ہارنے والا یہی کہتا ہے۔"

"تم کیا کہتے ہو.....؟"

"میں کہتا ہوں کہ یہ راستے اب سُنسان ہو رہے ہیں۔ ہوا کے جھونکے تیز اور سرد ہوتے جا رہے ہیں۔ سب یاتری اب اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے ہیں۔ ہمیں بھی اب لوٹ جانا چاہیئے۔"

"کہاں؟"

"جہاں تم چاہو۔"

"میں کہیں جانا نہیں چاہتی۔"

"تو تم یہیں رہو میں چلتا ہوں۔"

"کیوں.....؟"

"میرے پاس ان سرد ہوا کے جھونکوں سے بچنے کے لیے نہ کوئی گرم کپڑا ہے اور نہ وہ فیتھ ہے جو کچھ لوگوں کو زندگی کش حالات میں بھی زندہ رکھ سکتا ہے۔"

"تو تم میرا فیتھ لے لو۔"

"صرف فیتھ سے کام نہیں چلے گا۔"

"تو میرا اپل اوور بھی لے لو۔" یہ کہہ کر اس لڑکی نے اپنا اپل اوور اُتار کر مجھے دے دیا اور خود وہ سرد ہوا کے جھونکوں میں ٹھٹھرنے لگی۔

"تم کیا کرو گی؟"

"میں کسی خیمے میں رات گزار لوں گی جہاں سے سب لوگ جا چکے ہوں گے۔"

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ میں موکش پراپت کرنا چاہتی ہوں۔"

اب اندھیرا ہونے لگا تھا۔ مجھے یاترا سے لوٹی اس پوتر لڑکی کے خدوخال بھی اب دھندلے نظر آنے لگے تھے۔ ہوا بہت تیز تھی۔ دیودار کے درختوں سے اب ایسی آوازیں آنے لگی تھیں جو دن میں بہت دلکش لگتی تھیں لیکن جنہیں اب سننے سے خوف آتا تھا۔

"کیا موکش صرف ٹھنڈی یخ آلود ہواؤں میں اکڑ کر مر جانے سے ہی پراپت ہوتا ہے؟"

"مجھے خود معلوم نہیں۔"

اُس لڑکی نے ہوا کے سرد جھونکوں سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔

"تو آؤ میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں.....؟"

"پہلگام۔ جہاں میرے پاس ایک ہٹ ہے۔"

"اس میں کتنے کمرے ہیں؟"

"تین۔"

"مجھے ایک کمرہ دے سکو گے؟"

"کمرے کے علاوہ ایک بستر بھی۔"

"تو چلو۔"

اور پھر امرناتھ کی یاترا سے لوٹی وہ پوتر لڑکی اور میں پہلگام کی طرف چل پڑے چندن واڑی کے پل کے اُس پار میری کار کھڑی تھی۔ میں نے کار کا دروازہ کھولا اور اپنی سیٹ کے ساتھ لگتا دوسرا دروازہ بھی کھول دیا۔ وہ لڑکی میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا، میں نے کار اسٹارٹ کر دی۔

پہلگام پہنچ کر میں نے اپنی کار ہٹ کی طرف گھما دی۔ ہوا اور تیز ہو گئی تھی۔ لدر نالے کے پانی کے پتھروں سے ٹکرانے کے کارن بہت اونچی آوازیں فضا میں گھل رہی تھیں۔

نوکر ہٹ کے باہر کھڑا بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے اس پوتر لڑکی کو اس کا کمرہ دکھایا، اس کے باتھ رُوم میں گرم پانی رکھوا دیا۔ اس کا بستر بھی الگ لگوا دیا۔ اور اس کا پلنگ اور اس کے تکیے پر رکھ دیا۔ پھر ہم دونوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ کچھ دیر ٹرانسسٹر سے گانے سنے اور پھر میں نے کہا۔

"اب تم اطمینان سے سو جاؤ کہ اصل موکش گہری نیند میں ہے۔"

"اور تم؟"

"میں واپس شیش ناگ جاؤں گا۔"

"اِس وقت؟"

"ہاں۔"

"لیکن کیوں؟"

"کیونکہ میرا موکش اِسی میں ہے۔"

موکش کی متلاشی لڑکی مجھے روکتی رہی، بلکہ ایک بار اُس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور اور اپنی طرف گھما بھی دیا۔ لیکن میں رُکا نہیں۔

اور جب میں کار اسٹارٹ کر رہا تھا وہ پوتر لڑکی جسے موکش کی تلاش تھی، میری ہٹ کے برآمدے میں کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے، جو میں نے تو خیر بالکل نہیں دیکھے لیکن اُس دُھندلی سی چاندنی نے ضرور دیکھے تھے، جو تمام وادی کو اپنے دامن میں سمیٹے اُسے نیند کی لوریاں سنا رہی تھی۔

"شیش ناگ کی جھیل بہت خطرناک ہے۔ مت جاؤ موکش یہاں بھی مل سکتا ہے۔"

یہ اس پوتر لڑکی کی آواز تھی جو اُس شام یاترا سے لوٹی تھی اور اب میرے ساتھ میری ہٹ میں آگئی تھی اور اب اسے اس ہٹ میں اکیلے رات گزارنے سے خوف آرہا تھا۔ وہ جیسے موکش کی تلاش تھی۔

اس کا فیتھ میرے لڑکھڑاتے ہوئے فیتھ کی رگوں میں سما گیا تھا۔ وہ، جو یاترا سے لوٹی ایک بہت ہی خوبصورت پوتر لڑکی تھی۔

ایک قیدی اور—

پندرہ سال فائلوں کی موٹی موٹی تہوں میں اپنے دماغ اور ضمیر کو دفن کرنے کے بعد اب کہیں میں اپنی کرسی سے اُٹھ کر قریب کی دوسری کرسی پر بیٹھ سکا ہوں۔ پندرہ سال کے اس طویل عرصے میں زندگی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں تجربات کی وسعتیں بڑھ گئیں، مشاہدات کی نئی دنیائیں ظہور میں آئیں، ملک میں متعدد تحریکیں اُبھریں۔ بڑھیں، کامیاب ہوئیں یا مِٹ گئیں۔ خود میری زندگی میں کئی حادثے پیش آئے۔ ان میں بعض پُرمسرت اور بعض تلخ لمحوں کے حامل تھے۔ وقت کے اتنے طویل سفر کے بعد میری دفتری زندگی نے کون سی منزل پائی؟ صرف اتنا ہوا کہ وہ کرسی جس پر کبھی لالہ یوگ دھیان بیٹھا کرتے تھے، آج میرے لیے مخصوص ہو چکی ہے۔ دفتری زندگی کو صرف اسی ایک بڑے سے کمرے کی دیواروں کے اندر ہی پنپنے کی اجازت ہے، جہاں دن کے تیز اُجالے میں بھی بجلی کے لیمپ جلائے جاتے ہیں اور اس طرح کرمچاریوں کی آنکھوں کی روشنی کم کی جاتی ہے۔ انھیں چند گنی چُنی کرسیوں پر وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ، کسی ایک کرسی پر کچھ مدّت ٹکنا اور پھر آگے نکل جانا۔ جیسے یہ کرسیاں کوئی جزیرے ہوں۔ اور پھر انھیں میں سے کسی جزیرے پر پھیلی ہوئی ریت پر بھوکے پیاسے لیٹ کر اپنی زندگی کو ختم کر دینا، یہی ایک کلرک کی داستانِ حیات ہے۔ کتنی مضحکہ خیز لیکن کتنی تلخ حقیقت ہے یہ!

میرے ساتھ کام کرنے والے تقریباً میری ہی عمر کے سات کلرک اور ہیں۔ اِن میں سے تین تو دفتر کے لیے مر چکے ہیں۔ اس لیے کہ وہ عُمر کی ایک خاص سیڑھی کے حصّے پر پہنچ کر رُک گئے ہیں۔ ان کی ترقی کی سست رونائی اپنے عروج پر پہنچ کر ڈوب گئی ہے۔ اپنے لیے شاید وہ اب بھی زندہ ہوں لیکن دفتر کے لیے ان کا وجود ایک دم ختم ہو چکا ہے۔ دوسرے

چار کلرک جو ابھی زندہ ہیں سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اب ہانپنے لگے ہیں ۔ اُن کے چہروں پر تھکن کے آثار ہویدا ہیں ۔ ان کی گفتگو اور برتاؤ میں ایک ہارے ہوئے کھلاڑی کی تلخی ہے۔ اپنی آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی عینکیں جمائے ، وہ ہر وقت اپنے ماحول کو گھورتے رہتے ہیں ۔ ان کی بینائی اب کمزور ہو چکی ہے اور نزدیک کی چیزوں کو بھی پہچاننے کے لیے انھیں سہارے کی ضرورت ہے ۔ سہارا ، جو ہم سے اکثر چھین لیا جاتا ہے ! پچھلے چار سالوں میں تین نئے کلرک آئے ہیں ۔ وہ تینوں جوان ہیں ۔ ان میں زندگی ہے ، جوش ہے ، ہلچل ہے ، اضطراب ہے ۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان کی کرسیاں دوسرے چار کلرکوں کے درمیان ہیں ۔ ہر جوان کلرک کے دائیں بائیں زندگی کی حدیں کھڑی ہیں ۔ لگتا ہے جیسے تین سرد اور میٹھے پانی کے چشموں کے گرد جھلسے ہوئے پہاڑوں کے خشک ہونٹ جمے ہوں ۔ جیسے تین تازہ اور نوشگفتہ غنچوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں ہالہ بنائے ہوئے ہوں ۔ جیسے تین خوبصورت شمعوں کے پھیلتے ہوئے اُجالے کو کھردری دیواروں میں قید کر دیا گیا ہو ۔ جیسے جوانی کے بڑھتے ہوئے طوفان کو بوسیدہ کناروں سے روکنے کی سعی کی جا رہی ہو ۔ جہاں وہ بیٹھتے ہیں، ٹھیک اس کے سامنے والی کرسی پر دفتر کا انسپکٹر بیٹھا ہے ۔ نئے کلرکوں کی نگاہیں دن میں کئی کئی بار اس لرزتے ہوئے پردے کی طرف اٹھتی ہیں جس کے پیچھے ہی انسپکٹر کی کرسی ہے وہ پردہ گویا اُن کے مستقبل پر گرا ہوا پردہ ہے ۔ جب اس میں ہلکی سی لرزش ہوتی ہے تو اُن کے دل میں گُدگُدی سی ہونے لگتی ہے ۔ جب کبھی کوئی اُس پردے کو اٹھا دیتا ہے تو انھیں ایک انجانی خوشی کا احساس ہوتا ہے ۔ ان کی نگاہیں نوجوان انسپکٹر پر چند لمحوں کے لیے گڑ جاتی ہیں ۔ وہ پردہ اُن کے اقبال اور ترقی کا پرچم ہے ۔ ان کا تصوّر جوان ہے ، اُن کے بازوؤں میں طاقت ہے ۔ اور وہ اس پرچم کو پکڑ کر بہت اُونچا اُٹھا سکتے ہیں ۔

کبھی میرا بھی یہی حال تھا ۔ دفتر میں کام کرنے والے میری عمر کے سبھی کلرک اس دور میں سے گزر چکے ہیں ۔ دس بارہ سال پہلے میں بھی دن میں کئی کئی بار اس پردے پر اچٹتی سی نگاہ ڈالا کرتا تھا ۔ میں بھی اس دفتر کا انسپکٹر بننے کا خواب دیکھا کرتا تھا ۔ اب اگرچہ پہلے کی نسبت میں اس پردے کے زیادہ نزدیک ہوں لیکن مجھے اس قربت کا کبھی احساس نہیں ہوتا ۔ میں نے اب کبھی اس لرزتے ہوئے پردے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا ۔ اب تو میری نگاہیں اپنے قریب بیٹھے ہوئے سپرنٹنڈنٹ کو بھی غور سے نہیں

دیکھتیں ۔ اب میں سپرنٹینڈینٹ کی جگہ بھی حاصل کرنے کا خیال نہیں کرتا ۔ وقت نے الھڑ اور معصوم تمناؤں کو ادھیڑ اور زمانہ ساز بنا دیا ہے ۔ اب وہ ان شعبدہ بازوں کے دھوکے کو سمجھتی ہیں ۔ اب انھیں دھوکہ دینا آسان نہیں ہے ۔

چند روز سے لالہ یوگ دھیان کے لڑکے امرناتھ کی درخواست دفتر میں آئی ہوئی ہے ۔ وہ بھی نوکری چاہتا ہے ۔ اپنی درخواست میں اُس نے لکھا ہے کہ اُس کے والد نے اسی دفتر میں بیس سال تک ملازمت کی ہے اور پھیپھڑے خراب ہو جانے کے کارن اسے نوکری چھوڑنا پڑی تھی ۔ وہ گریجویٹ ہے اور تمام کُنبے کو سنبھالنے کی ذمے داری اب اسی پر ہے ۔ جس قفس سے اس کے قیدی باپ نے اپنی قوتِ پرواز کھو کر اور آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرنے کی کوشش ترک کر کے رہائی پائی تھی ۔ اُسی قفس میں اب اس کے بیٹے کی تازہ جوانی قید ہونا چاہتی تھی ۔ جس محاذ پر کھڑے ہو کر اس کے باپ نے مہلک زخم کھائے تھے ، اب امرناتھ بھی وہیں ڈٹ جانا چاہتا تھا ۔ میں نے امرناتھ کی درخواست کو کئی بار پڑھا ہے ۔ جانے اُسے کس نے بتایا تھا کہ چند روز میں دفتر کا ایک اور کلرک ریٹائر ہونے والا تھا ' ایک اور ہستی دفتر کے لیے ختم ہونے والی تھی ، ایک اور کرسی خالی ہونے والی تھی ، ایک اور جزیرہ اجڑنے والا تھا اور ان جوان کلرکوں کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے زندگی کی جُھلسی ہوئی چٹانوں میں سے ایک چٹان وقت کے تیز بہاؤ سے ایک طرف لُڑھک جانے والی تھی ۔ دو دن ہوئے امرناتھ مجھ سے گھر پر ملنے بھی آیا تھا ۔ آخر اُس کا کچھ تو حق ہے مجھ پر ۔ اس کے مرحوم باپ نے مجھے دفتر کا کام سکھا کر آج اس قابل بنایا ہے کہ میں اپنی دائم المریض بیوی اور ہر تیسرے سال جنم لینے والے بچوں کو پال سکوں ۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں خود اس کی درخواست انسپکٹر کے سامنے پیش کروں گا ۔ کل جب میں نے اس کی درخواست انسپکٹر کی میز پر رکھی تو اس نے پوچھا ۔

" یہ یوگ دھیان کون ہے ؟ "

" ہمارے سینئر گریڈ کے ایک کلرک تھے ۔ کھنہ صاحب کے وقت یہاں کام کرتے رہے ہیں "

یہ کہتے ہی مجھے پہلا انسپکٹر یاد آ گیا ، جسے یوگ دھیان سے خدا واسطے کا بَیر تھا ۔ ایک ذرا سی بات پر معاملہ بگڑ گیا تھا ۔ وہ انسپکٹر حد درجے کا مغرور اور سخت کلام تھا ۔ ایک ایک دن لالہ صاحب سے کہہ بیٹھا ۔ تم تو سرکار کے نمک حرام ہو ، سرکار تم جیسے ملازموں کو نوکری

میں رکھنا پسند نہیں کرتی۔ اس کے جواب میں لالہ صاحب نے کہا تھا۔ آپ کو اپنے ماتحتوں سے مخاطب ہونے کا سلیقہ سیکھنا چاہیے، آپ صرف اس لیے انسپکٹر بنا دیئے گئے ہیں کہ آپ کی اقتصادی اور سماجی حیثیت ہم سے کہیں اچھی ہے، ورنہ رائے بہادر کے ریٹائر ہونے پر دفتر ہی کے سپرنٹنڈنٹ کو ترقی ملنا چاہیے تھی۔ اس پر انسپکٹر جل بھُن گیا تھا اور لالہ صاحب کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ اس ایک حادثے نے ان کے تمام کیریئر کو خراب کر دیا۔ دو سال کے لیے ان کی ترقی رُک گئی اور اس کے بعد انھیں ہر جائز حوصلہ افزائی سے محروم رکھا گیا۔

" اچھا درخواست دہندہ کو کل پیش کیجئے۔" انسپکٹر نے درخواست اپنے پاس رکھ لی اور میں چلا آیا۔

آج صبح جب امرناتھ دفتر میں آیا تو اس کے چہرے سے عجیب قسم کی گھبراہٹ اور پریشانی ٹپکتی تھی، جیسے وہ ایک مُجرم کی حیثیت سے عدالت میں فیصلہ سننے جا رہا ہو۔ میں نے اسے پیار سے اپنے پاس بٹھایا اور پھر صاحب کے سامنے پیش کیا۔ بیچارا کس طرح کانپ رہا تھا۔ حالات موافق دکھائی دیتے ہیں۔ امید ہے اسے ملازمت مل جائے گی۔

امرناتھ کے چلے جانے کے بعد میں اپنے دماغ میں ایک عجیب سی کشمکش اور چُبھن سی محسوس کر رہا ہوں۔ اس کے معصوم سے چہرے کو دیکھ کر، جس پر افلاس اور احساسِ کمتری کی گہری چھاپ ہے، مجھے بہت دُکھ ہوا ہے۔ اتنے برسوں کی طویل محنت نے اسے اس قابل بھی نہیں بنایا کہ وہ اپنی روزی ہی کما سکے۔ تعلیم نے اس کے نکھرتے ہوئے پروں کو اُڑنے کی قوت بھی نہیں دی۔ وہ اب ایک ہی ٹہنی پر بیٹھ کر اور اچھے بُرے پھل کھا کر پیٹ بھر لینا چاہتا ہے۔ کسی دوسرے درخت کی خواہش تو درکنار، قریب کی سبز ٹہنی پر نشیمن بنانے کی بھی اُسے حسرت نہیں ہے۔ آج سے پندرہ سال پہلے کا زمانہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا ہے۔ امرناتھ دفتر میں کیا آیا ہے اپنی کمزور سی زرد انگلیوں سے ٹھوکا دے کر میرے ماضی کو جگا گیا ہے کم بخت۔ اس نے لمحوں کی گرد کو ایک دم جھاڑ کر بہت پرانا منظر اُجال دیا ہے میرے سامنے۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب میں ملازم ہو کر پہلی بار اس دفتر میں آیا تھا۔ دراصل قیدی اپنے جیل خانے میں داخل ہونے کی تاریخ کبھی نہیں بھولتا۔ وہ اس سنگِ میل سے اپنے سفر کی طوالت کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ پہلے روز جب میں نے دفتر کی چاردیواری میں قدم رکھا تو سب کلرکوں کی نگاہیں مجھ پر جم گئیں۔ جانے انھوں نے کیسے جان

لیا کہ میں ہی نیا کلرک ہوں۔ ان کی نگاہوں میں ایک ظاہری اور رُوکھا استقبال تھا۔ ان کی نگاہیں جیسے میرا مذاق اُڑا رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی آنکھوں میں ایک ایسا جذبہ تھا جیسا کسی لاش کو نوچتے ہوئے گدھوں کے دل میں کسی اور اجنبی گدھ کو پاس آتا دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ ایک کمینہ اور بھونڈا جذبہ، ایک ایسا جذبہ جو گھٹیا قسم کے انسانوں میں مسلسل ذہنی اور جسمانی غلامی کے بعد پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا رویہ جو صرف ان لوگوں میں دیکھا جاتا ہے جو زندوں سے ڈرتے اور مُردوں کو پھاڑ کھانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ میں اس اجنبی، غیر مانوس اور نئے قسم کے استقبال سے سہم گیا تھا۔ اور میں نے محسوس کیا تھا کہ انجانے میں ہی میں نے دروازے میں رکھے پائیدان کی ایک کھُلی رسی میں اپنا پاؤں اُلجھا لیا تھا۔ تمام کلرکوں کا ایک بھرپور مجموعی قہقہہ بھالے کی طرح میری طرف بڑھا تھا اور اس کے ساتھ ہی دو بازو مجھے تھامنے کے لیے پھیل گئے تھے۔

"آؤ مسٹر روی موہن، ڈرو نہیں۔ اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ یہی تمہاری جگہ ہے"، لالہ یوگ دھیان کی نرم آواز نے مجھے مخاطب کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ کسی نے تلخ قہقہوں کا بڑھتا ہوا بھالا روک کر مجھے ایک گہرے زخم کی اذیت سے بچا لیا تھا۔

میری کرسی لالہ صاحب کے قریب تھی۔ شروع شروع میں میرا بھی سارا کام وہی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر کبھی کام زیادہ ہوتا تو وہ اسے گھر لے جاتے اور مجھے بُلوا کر سمجھاتے اور پیار سے مکمل کرواتے۔ ان کے اس ہمدردانہ برتاؤ نے مجھے جیت لیا۔ ہم دونوں میں ایک گہرا قلبی تعلق پیدا ہو گیا۔ وہ میرے گھریلو معاملات میں بھی دلچسپی لیتے اور کہتے کہ زمانہ بڑا نازک ہے، دیکھ بھال کر قدم اٹھانا چاہیے۔ انھیں دنوں ان کا بڑا لڑکا نمونیہ سے مر گیا۔ بیماری کے دوران میں جو کچھ خدمت کر سکتا تھا کرتا رہا، لیکن موت کے مضبوط ہاتھ جسے ایک دفعہ جکڑ لیں اسے کہاں چھوڑتے ہیں۔ زندگی مجموعی طور پر آہستہ آہستہ مدافعت اور مقابلے کی کوشش ترک کرتی جاتی ہے اور پھر ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو جاتی ہے۔ اپنے جوان بیٹے کی موت کا انھیں اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ ایک دم بدل گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس حادثے نے ان کے تمام اعصاب پر بُرا اثر ڈالا تھا۔ چند ہی روز میں وہ بوڑھے سے لگنے لگے۔ آنکھوں کی بینائی گھٹ گئی تھی اور چہرے پر ضعف اور تھکن کے نہایت گہرے نقوش

اُبھر آئے تھے۔

وقت نے کسی حد تک ان کے دُکھ کا مداوا کر ہی دیا تھا لیکن ان کی صحت پر جو ایک غیر معمولی اثر پڑا تھا وہ کسی طرح نہ مٹ سکا۔ دفتر میں کام کرتے کرتے کئی دفعہ یکایک اُن کا رنگ زرد ہو جاتا اور آنکھوں کے سامنے سیاہ رنگ کے سائے رینگنے لگتے۔ اب اگرچہ ان کا بہت سا کام میں خود ہی کر دیتا تھا لیکن کام گھٹ جانے کے باوجود ان کی صحت میں کوئی نمایاں فرق نہ پڑا تھا۔ گہرے صدمے کی جوالا اندر ہی اندر ان کا خون چوس رہی تھی۔ اسی دوران سپرنٹنڈینٹ کی آسامی خالی ہوئی۔ انھیں امید تھی کہ وہ سپرنٹنڈینٹ بن کر ریٹائر ہوں گے لیکن انسپکٹر نے دفتر کے ایک جونیئر آدمی کو یہ چانس دلوا دیا اور لالہ صاحب کی حق تلفی کر کے انھیں ایک اور صدمہ پہنچایا۔ اس نئے حادثے نے اُن کے مستقبل کو بری طرح مجروح کر ڈالا۔ طاقت اور قلم کے بَل پر افسر نے اپنے ایک ماتحت کی زندگی کو محض اس لیے برباد کر دیا کہ وہ اپنے آپ میں غلط اقدار کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا، اس کا ضمیر زندہ تھا اور ابھی وہ اس کی آواز سُن سکتا تھا۔

چند دنوں سے لالہ صاحب کی صحت خطرناک طور پر گر رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ دفتر سے کچھ مدّت کے لیے چھٹی لے کر کسی پہاڑی جگہ پر چلے جائیں۔ ایک تو دفتر کے مخالف ماحول سے نکل جائیں اور دوسرے اپنی صحت کی دیکھ بھال کر سکیں گے۔ انھوں نے اسی غرض سے درخواست دی لیکن انسپکٹر نے سفارش نہیں کی۔ وہ ان کو ہر طریقے سے تنگ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کسی کلرک سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر لالہ صاحب معافی مانگ لیں تو وہ آئندہ ان کی امداد کر سکتا تھا۔ لیکن لالہ صاحب کو یہ کوئی نہ سمجھا سکا کہ وہ کس قصور کی معافی مانگیں۔ ایک بار میں نے بھی انھیں مجبور کیا کہ وہ اپنے افسر سے سوری کہہ دیں لیکن ان کے اس سوال کا جواب میں بھی نہ دے سکا کہ وہ آخر کس بات کے لیے سوری فیل کریں۔ صحت کی خرابی کے کارن اب وہ اکثر چھُٹی پر رہنے لگے تھے۔ میں ان کے لیے جو کچھ کر سکتا تھا کرتا تھا۔ دفتر کا سارا کام میں نے اپنے ذمے لے لیا تھا اور اس طرف سے انھیں مطمئن کر دیا تھا۔

ایک دن دفتر پہونچتے ہی تھوڑی دیر کے بعد چپراسی ایک حکم پر دستخط کروانے کے لیے آیا۔

آئندہ سے کوئی صاحب بغیر پہلے منظوری لیے رخصت نہیں لے سکیں گے۔ گھر سے

بھیجی ہوئی رخصت کی درخواست نامنظور کردی جائے گی اور درخواست دہندہ دفتر سے غیر حاضر تصوّر کیا جائے گا۔"

حکم پر دستخط کر چکنے کے بعد ہم سب نے سوچنا شروع کیا اور فوراً ہی سمجھ گئے کہ یہ آرڈر محض لالہ جی کو تنگ کرنے کے لیے نکالا گیا تھا۔ وہ اس دن بھی چھٹی پر تھے۔ اس سے کچھ روز پہلے بھی وہ کسی کام سے باہر گئے تھے اور آج بھی بغیر بتائے وہ کہیں باہر چلے گئے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے گھر والے بھی ان کے اس رویّے پر تشویش کا اظہار کرنے لگے تھے۔ انسپکٹر کو ان کے باہر جانے کی کسی نہ کسی طرح اطلاع مل گئی تھی اور اس نے انھیں تنگ کرنے کی ایک نئی راہ ڈھونڈ لی تھی۔

اس سے دوسرے دن لالہ جی دفتر آئے تو میں انھیں دیکھ کر سہم سا گیا۔ اُن کا چہرہ سیاہ ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں، جیسے وہ ایک دن جو انھوں نے باہر گزارا تھا اپنے لمحات کے بارِ گراں سے ان کے نڈھال جسم کو بار بار روندتا رہا تھا اور اب جیسے ان کی ہڈیاں تک چٹخ گئیں تھیں۔ وہ کرسی کے پُشتے سے پیٹھ ٹیک کر بیٹھ گئے اور ہانپنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد چپراسی پہلے روز والا حکم لے کر لالہ جی کے پاس آیا۔ ان کی درخواست پر بھی وہی حکم لکھا تھا اور ان کے دفتر سے غیر حاضر رہنے کی جواب دہی کی گئی تھی۔ میں نے لالہ جی کے چہرے کی طرف دیکھا ان کی آنکھوں میں ایک لمحہ کے لیے ایک آگ سی بھڑکی اور فوراً بعد وہ شعلہ ان کے چہرے پر پھیلتے ہوئے سیاہ بادلوں میں گُم ہو گیا۔ ان کا جسم غصے سے کانپ گیا۔ انھوں نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایکسرے کا فوٹو جس میں دائیں پھیپھڑے پر تین انچ کے برابر گول نشان لگایا گیا تھا اور ڈاکٹر کا لمبا سا نسخہ نکالا اور آرڈر کے ساتھ لگا کر واپس بھیج دیا۔ ہم سب حیرت سے ان کی طرف تک رہے تھے اور ان کا چہرہ زرد ہوتا جارہا تھا اور ان پر غنودگی چھاتی جارہی تھی۔

اور آج امرناتھ کی درخواست سامنے میز پر رکھے سوچ رہا ہوں کہ قفس شاید کبھی غیر آباد اور سُونا نہیں رہتا۔ اور جب قیدی کا جسم اور اس کی رُوح قوتِ پرواز کھو چکتے ہیں تو قفس کی چھوٹی سی کھڑکی دوبارہ کُھل جاتی ہے کسی اور کا استقبال کرنے کے لیے۔ ■■

سحر قریب ہے

دائیں پہلو کی طرف طاق میں رکھے ہوئے چراغ کی لَو تھکے ہوئے جاں بلب مسافر کی طرح کانپ رہی ہے۔ رات اتنی زیادہ جا چکی ہے اور میں نے اسے ابھی تک نہیں بُجھایا۔ اور وہ تھک گیا ہے اور دھوئیں کے گھنے بادل کوٹھڑی میں اُگل رہا ہے، تیل کی بُو سے ساری فضا بوجھل ہو رہی ہے۔ اور ناک میں چبھن سی پیدا کرتی ہے لیکن پھر بھی یہ بُو ایسی تیز نہیں جیسی کہ سامنے والے محدود سے میدان میں جمع کیے ہوئے غلاظت کے ڈھیر پر منڈلاتی رہتی ہے۔ کوّے، چیلیں اور گِدھ ڈھیر پر چکّر کاٹتے ہیں اور بدبو ان سب کے اوپر اٹھ کر ایک پردہ سا تان دیتی ہے۔ ایک جالا سا بُن دیتی ہے اور بستی کا یہ حصّہ اس بوجھ تلے سسکنے لگتا ہے۔ سامنے کے اونچے مکان کے دریچوں سے صبح سویرے سُورج کی روپہلی کرنیں داخل ہوتی ہیں اور ہمارے کواڑوں کو غلاظت کے پھوڑوں بھرے مکرُوہ ہاتھ کھٹکھٹاتے ہیں۔ شام کو جب چاند اپنی کرنوں کے سہارے اتر کر ان رنگ محلوں میں رقص کناں ہوتا ہے تو بدبُو اور دھوئیں کے لطیف بادل اس بستی پر چھا کر اس کی ہستی کو اُپلوں کے ایک بڑے سے سُلگتے ہوئے ڈھیر میں بدل دیتے ہیں۔ اور اس وقت یہ ڈھیر سلگ رہا ہے۔ فضا میں دھوئیں کا کسیلا پن رچ گیا ہے اور طاق میں رکھا ہوا دِیا تھرّا رہا ہے اور میری طرف مِنّت بھری نظروں سے تک رہا ہے، جیسے پوچھ رہا ہو۔ "میرے جلنے کی میعاد کب ختم ہوگی؟"

"سحر تک تو تمہیں جلنا ہی چاہیے"۔ جیسے میری آنکھیں اسے جواب دے رہی ہوں۔

"لیکن کب ہوگی تمہاری سحر؟" اور میں چونک پڑتا ہوں۔

"یہ تو تم چاند اور تاروں سے پوچھو" اور اس کی لَو زیادہ اونچی ہو کر تھرتھرانے لگتی

ہے اور پھر افسردگی سے جھک جاتی ہے، جیسے اسے اپنے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔

یہ ہر رات کا قصّہ ہے، ہر شب کی داستان ہے۔

لیکن کل رات یہ داستان، عجیب روپ اختیار کر گئی۔

میں پیٹھ کو دیوار کے ساتھ ٹِکائے اپنی کھاٹ پر لیٹا تھا، چراغ کی لرزتی ہوئی لَو میں دیواروں پر سائے سے ناچ رہے تھے اور ان سب کے درمیان میرا سایہ میرے ہی قریب بائیں دیوار پر کانپ رہا تھا۔ میں نے اپنے سائے کی طرف دیکھا۔ اندھیرے اور اُجالے کی اس باہمی کشمکش میں وہ عجیب سی بے چینی اور اضطراب سے لرز رہا تھا۔ کبھی تو وہ اس طرح کانپنے لگتا جیسے جادو کے زیر اثر اپنے آپ پر ہر قسم کا قابو کھو چکا ہو۔ بہت دیر تک اس کیفیت کو دیکھنے کے بعد میں وحشیانہ طور سے ہنس پڑا۔

میری پائنتی کے ساتھ، بمشکل پھنس کر لگی ہوئی چارپائی پر میری بیوی گہری نیند سوئی پڑی تھی۔ اس کے پہلو میں میرا بچہ بے سُدھ لیٹا ہوا تھا۔ اپنی ماں کے ننگے گورے تھن پر اس کا نازک سا ہاتھ یوں پڑا ہوا تھا، جیسے اجنتا کے کسی بُت پر ایک ادھ کھِلا پھول رکھا ہو۔ میرے پہلو میں کوئی ڈیڑھ ہاتھ کے فاصلے پر ایک اور چارپائی بچھی تھی۔ اس پر گھٹنوں میں سر دیئے میرا باپ پڑا تھا۔ وہ دمہ کا مریض ہے اور رات کے بارہ گھنٹوں میں سے نو گھنٹے جاگتا ہے اور کھانس کھانس کر بلغم سے بھرا تھوک قریب کی دیوار پر پھینکتا رہتا ہے۔ حالانکہ میں نے اس سے کئی بار کہا ہے کہ وہ کاغذ کے کسی ٹکڑے پر، راکھ کی ایک تہ جما لیا کرے اور رات بھر اس پر تھوکتا رہے، لیکن وہ میری بات نہیں مانتا اور اپنی غلاظت کو بے ترتیبی سے باہر اُگل کر تمام رات سونے اور جاگنے کی مختلف حدوں کو پھلانگنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے اور صبح چارپائی سے اُٹھتے ہی یوں ہانپنے لگتا ہے جیسے تمام رات جلتے ہوئے چراغ کا پہرہ دیتا رہا ہو۔

میرے قہقہہ لگانے پر وہ اپنے لحاف میں کسمسایا اور منہ کا تھوڑا سا حصّہ باہر نکال کر بلغم کا ایک بڑا سا تہ وہ طاق کے ذرا نیچے، دیوار پر چسپاں کر دیا۔ اور پھر لحاف کو اِدھر اُدھر سے اپنے گرد لپیٹ کر آہستہ آہستہ کراہنے لگا۔ جیسے انتہائی کرب کا اظہار کر رہا ہو۔ اور وہ سفید سا تھوک دھندلی سی دیوار پر چمٹا یوں لگ رہا تھا جیسے کسی بھکاری کی سیاہ ران پر رِستا ہوا کوئی ناسور ہو۔ صبح تک جانے کتنے ایسے ناسور پیدا ہو جائیں گے۔ میرے قہقہے کی

کرخت آواز سے اجنتا کے بُت میں ارتعاش سا رینگا، جیسے اسے کسی آہنی ہتھوڑے کی کوئی گذشتہ چوٹ یاد آ گئی ہو۔ جیسے اس کے پتھریلے ذہن میں کوئی مُردہ چنگاری جاگی ہو۔ اس کے پہلو میں خاموشی سے پڑا ہوا بچّہ چیخ اٹھا۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دیوار پر کانپتا ہوا میرا ہی غیر متناسب سایہ چیخا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے بچّے کی طرف دیکھا۔ وہ پھر سو گیا تھا۔ اس کا ہاتھ بدستور اپنی جگہ پر پڑا ہوا تھا اور طاق میں رکھا ہوا چراغ تیزی سے دھواں اُگلے جا رہا تھا۔

میں نے پریشان ہو کر اپنی آنکھیں بھینچ لیں۔

اس خاموش ماحول میں ایک بھاری لیکن مدھم آواز اُبھری۔ میں نے سمجھا میرا باپ بڑبڑا رہا تھا لیکن وہ گٹھری بنا بے حس پڑا تھا۔ شاید کھانس کر تھک گیا تھا اور اب اسے نیند آ گئی تھی۔ میں نے کوٹھری کے چاروں طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر میں نے کواڑ پر نگاہ ڈالی لیکن باہر کسی قسم کی آواز نہ تھی۔ میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور تکیے کو پیٹھ کے پیچھے رکھ لیا۔

آواز پھر اُبھری۔

"تم سوئے کیوں نہیں، رات بہت جا چکی ہے، اب آرام کرلو۔"

میں نے پھر آنکھیں کھولیں، کوٹھری کی ہر شے کو ٹٹولا اور آخر میں نگاہیں چراغ پر اٹک گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چراغ کے قریب، طاق میں سے وہ آواز آ رہی تھی۔ میں کچھ گھبرا سا گیا۔

"سارا دن مِل میں کام کرتے ہو اور رات جاگ کر کاٹ دیتے ہو۔ کس قسم کے انسان ہو تم؟" جیسے طاق بول رہا ہو۔

"کون ہو تم؟" میری آواز میں کپکپی سی تھی۔

"میں اس گھر کی رُوح ہوں۔"

"گھر کی رُوح ——— گھر کی بھی رُوح ہوتی ہے کہیں"! میں نے گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا۔

"ہاں ہوتی ہے۔ جو تمہارے سو جانے کے بعد تمہاری نگہبانی کرتی ہے۔ تمہارے کہیں باہر چلے جانے پر گھر کی رکھوالی کرتی ہے۔" یہ سُن کر میں تذبذب میں اُلجھ گیا۔

اور جیسے تم لوگ طرح طرح سے دُکھی کرتے ہو۔ لیکن تم سے مجھے کوئی گِلہ نہیں تم اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو لیکن یہ تمہارا بوڑھا باپ بہت کمینہ ہے۔ دیکھتے نہیں ہو اس نے ــــ"

" خاموش ! " میں حیرت، خوف اور غصّہ سے چیخا۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی جیسے اُس کی آواز مرگئی تھی۔

" گھر کی رُوح تم بولتیں کیوں نہیں ؟ "

" تم اب سو جاؤ۔ دو بج چکے ہیں "

آواز میں محبت اور ہمدردی کا جذبہ تھا۔

" مجھے نیند نہیں آرہی، میری پلکوں کے اندر جیسے کانٹوں کے گچھے ہیں۔ جوں ہی آنکھیں بند کرتا ہوں شدید چبھن ہوتی ہے۔ میرا دماغ سُلگ رہا ہے۔ میرا سینہ کھول رہا ہے۔ میں دن بھر تمام مزدوروں سے زیادہ کام کرتا ہوں کہ تھکن سے چُور ہو جاؤں اور کھاٹ پر پڑتے ہی سو جاؤں لیکن جوں ہی چارپائی پر پاؤں رکھتا ہوں نیند کی پریاں تالیاں بجاکر قہقہے لگاکر اور غُل مچاکر بھاگ جاتی ہیں اور میں رات بھر ان کے پیچھے دوڑتا رہتا ہوں لیکن اُنھیں پکڑ نہیں سکتا۔"

" اچھا تو میں تمہیں ایک کہانی سُناتی ہوں تمہاری دادی اماں بھی بچپن میں تمہیں کہانیاں سُناتی ہوں گی۔ کہانیوں سے پریشان من کو شانتی ملتی ہے" آواز جیسے میرے اور قریب ہوگئی تھی۔

" ہاں سناؤ کوئی کہانی۔ شاید اُسے سُن کر میں سو جاؤں اور پھر روز سُنوں تم سے کہانیاں سُنتا ہی رہوں حتیٰ کہ ــــــ"

" حتیٰ کہ تمہیں ان کی ضرورت نہ رہے "

ایک بوڑھا مدھم سا قہقہہ اُبھرا

" خیر تم سنو کہانی

بہت عرصے کی بات ہے میدان میں ٹھیک اسی جگہ جہاں اب تمام دن غلاظت کا بڑا سا ڈھیر لگا رہتا ہے ایک کوڑھی بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے تمام جسم پر پھوڑے ہی پھوڑے تھے۔ وہ سارا دن اپنے زخموں کو چھیلتا رہتا اور کوئی گیت گنگناتا رہتا۔ کم بخت کی آواز میں بڑا سوز تھا۔ اپنے جزام خوردہ ہاتھوں سے جب وہ میل سے اَٹے ہوئے لمبے لمبے کالے بالوں کو اپنے

چہرے سے ہٹاتا تو یوں لگتا جیسے رات کی سیاہی میں شفق کی سُرخی گھُل رہی ہو۔"

" تم تو فن کاروں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میرا بھی ایک دوست ایسی ہی باتیں کیا کرتا تھا۔ اُس کی بھی ایک کہانی ہے۔ آج تم اپنی کہانی مکمل کر لو۔ کل میں سناؤں گا کہانی۔ ہاں تو پھر ــــ"

"وہ وہیں اس کھلے میدان میں پڑا رہتا۔ کوئی کچھ دے دیتا تو کھا لیتا ورنہ بھوکا ہی سو رہتا۔ میں نے اس کے خون آلود ہاتھوں کو کبھی بھیک کے لیے پھیلے ہوئے نہیں دیکھا۔ ایک دن اچانک وہ کہیں چلا گیا۔ مجھے ماحول میں ایک سُوناپن محسوس ہونے لگا۔ فضا جیسے اُس کے نغموں سے محروم ہو گئی تھی اور پھر چند روز کے بعد وہ اچانک ہی لوٹ آیا۔ اُس کے ساتھ ایک عورت تھی، اس جیسی ہی کوڑھی عورت۔ شاید اپنے نغموں کے مرمر سے وہ اسے تراشتا رہا تھا۔ اب وہ بُت اس کے سامنے تھا۔ اس کے ہاتھ صاف تھے۔ اُن پر کوئی ناسُور نہ تھا۔ لیکن اس کا جسم تو ایک دم جیسے بھٹی بنا ہوا تھا جو ہر لمحہ آگ اُگل رہا ہو۔ شعلے چبا رہا ہو، اور انگارے پھینک رہا ہو۔ اس کے ہاتھ اپنے ساتھی کے زخموں کو پونچھتے رہتے۔ اس کے بالوں میں سے جوئیں چُنتے رہتے اور جب وہ گیت گاتا تو عورت اپنی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ کر گُم صُم ہو جاتی۔ پھر اس نوجوان نے رات کو یہاں پناہ لینا شروع کر دی۔"

" اس کوٹھری میں؟" میں نے پوچھا۔

" ہاں لیکن اُس وقت تو یہاں صرف ایک کھنڈر تھا کسی پرانی عمارت کی یادگار۔ وہ دن بھر میدان میں پڑے رہتے اور جب سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا تو وہ کھنڈر میں چلے جاتے اور کافی رات گئے تک وہاں گیت گونجتے رہتے۔ وہ گیت یا ستاروں نے سُنے ہیں یا میں نے۔ محبت کے گیت، دو زخمی رُوحوں کے ملاپ کے گیت، تخلیق کے سپنے ــــــــ اور ایک اندھیری رات کے پچھلے پہر میں، کراہیں گونجیں، ٹیسیں اُبھریں، چیخیں لرزیں اور ستارے افسردہ ہو گئے، چاند پھیکا پڑ گیا، رات تڑپ اُٹھی اور پھر اچانک اُجالا ہو گیا۔ کوڑھی عورت نے کھنڈر کی ویرانی میں اپنا مستقبل آباد کر لیا تھا۔ تین روز تک دونوں میں سے کوئی بھی میدان میں نہ آیا۔ چوتھے روز مرد نے ایک پرانا کمبل اپنی مخصوص جگہ پر بچھایا اور اُس کی ساتھی اپنے صاف ہاتھوں میں اپنے سپنوں کی تعبیر اور محبت کی امانت اٹھائے آہستہ آہستہ وہاں آئی اور لیٹ گئی اور مرد دیر تک اس کے سرہانے بیٹھا کسی پرانے پہاڑی گیت کے کچھ بول گنگناتا رہا۔

ایک ہفتہ کے بعد اچانک بارش اور آندھی کا ایک تُند طوفان برپا ہوگیا۔ تمام رات وہ دونوں کھنڈر کے ہر کونے میں گھسٹ گھسٹ کر اپنے بچے کو بچانے کی کوشش کرتے رہے دُنیا آرام سے سو رہی تھی اور میں جاگ رہی تھی اور خدا سے دعائیں مانگ رہی تھی، اس آفت کو ٹال دینے کی۔ لیکن آفت نہ ٹلی۔ ویران اور سنسان کھنڈر میں پانی بھر گیا اور صبح میں نے اور بستی کے کئی آدمیوں نے دیکھا کہ بچہ مر چکا تھا، بچے کی ماں دم توڑ رہی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی مر گئی۔

کھنڈر کی مہیب ویرانی اور تاریکی نے اپنے پورے بوجھ سے ایک ننھی کرن کو کچل دیا تھا۔ موت نے زندگی کی کسمساہٹ کو اپنے آہنی ہاتھوں سے دبا کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔

اس سے اگلے روز میدان میں کوئی نہ آیا صرف چند گندے اور خون سے بھرے چیتھڑے وہاں پڑے تھے۔ دن کے بعد رات آئی، رات کے بعد دن بھی آیا۔ میدان میں لگے نیم کے پیڑ پر بور پڑا۔ نمولیاں لگیں۔ الھڑ لڑکیوں نے ساون میں جھولے بھی جھلائے۔ زندگی کے سبھی دور پلٹ کر آئے لیکن اس کوڑھی مرد کو کوئی اپنے ساتھ نہ لا سکا۔ وہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

اور اب بھی جب کبھی میں کوّوں، چیلوں، اور گدھوں کو غلاظت کا وہ ڈھیر کریدتے ہوئے دیکھتی ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے، جیسے وہ سب کوڑھی کی لاش کو نوچ رہے ہیں اُس کے زخموں کو چھیل رہے ہیں، اُس کے ناسوروں میں نشتر چبھو رہے ہیں اور وہ ان سب سے بے نیاز گائے جا رہا ہے اور فضا میں تعفن اور تلخی گھُل رہی ہے۔"

اور پھر آواز اچانک خاموش ہو گئی۔ میں جیسے گہری نیند سے جاگ اُٹھا تھا۔ میں نے اپنے اِردگرد دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ طاق میں رکھے دیئے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ اُس کی لَو کسی اندرُونی کرب سے نڈھال ہو رہی تھی، تڑپ رہی تھی، بھڑک رہی تھی۔

"گھر کی رُوح، کہانی ختم ہوگئی کیا؟"

"نہیں ابھی تو ایک ہی حصّہ ختم ہوا ہے۔"

مَری ہوئی سی آواز اُبھری۔ جیسے کہیں دور سے آ رہی ہو، جیسے کھنڈروں کی تاریکی میں بھٹک رہی ہو۔

" تو تم خاموش کیوں ہو گئیں ؟ "

" یوں ہی ۔ کہانی کا اگلا حصہ یاد کر رہی تھی "۔

جیسے بہت دوڑ دھوپ کے بعد وہ تھک چکی ہو۔

" پھر کیا ہوا ــــــــــ ؟ " میں نے پوچھا۔

" ایک مدّت تک کھنڈر کی ہیبتناکی مجھے اکھرتی رہی ۔ رات کی تاریکیوں میں جب زندگی کے دھارے سکون کی گہرائیوں میں کھو جاتے تھے ، جب دن کا اُجالا رات کی تاریکی کے ساتھ لپٹ کر سو جاتا تھا ، میں ستاروں کے زینے طے کرتی ہوئی افلاک کی وسعتوں میں گھومتی پہاڑوں کے دامن میں بسی جھونپڑیوں کے اندر جھانکتی ، چاند کی کرنوں کا سہارا لے کر زمین کا کونہ کونہ چھانتی ، صرف اس امید پر کہ شاید کوئی انسان اس کھنڈر کو آباد کرنے پر راضی ہو جائے ۔ شاید کوئی ایسا مسیحا مل جائے ، جو مُردہ مستقبل میں جان ڈال دے ۔لیکن میری آوارگی لاحاصل رہی میری محنت اکارت گئی ۔میری امید پنپ نہ سکی اور جب میں نراش ہو کر کھنڈر کی تاریکی کا ایک حصّہ بن جانے پر تیار ہو گئی تو اچانک ایک صبح گری ہوئی شکستہ دیواروں کی بنیادوں کو کھودا جانے لگا ۔ بہت سے مزدور ہاتھوں میں کدالیں اور بیلچے لے کر کام پر لگ گئے اور دن چھپنے تک ایک صاف اور سادہ جھونپڑی نظر آنے لگی ۔ اس جگہ پر جہاں پہلے کھنڈر کی ہیبت مسلّط تھی میں تمام دن ایک طرف کھڑی نہایت انہماک سے سب کچھ دیکھتی رہی اور پھر شام کا دُھندلکا چھانے لگا ۔ آکاش کے مندر میں اَن گنت جوتیں جل اٹھیں اور میں دروازے پر کھڑی اپنے نئے مہمان کا انتظار کرنے لگی ۔ ہر قدم پر میرا کلیجہ دھک سے ہو جاتا۔
ہر آہٹ کو اپنے مہمان کی آمد کا پیغام سمجھتی ۔ اور پھر یک لخت فضا میں ننھے جاگ اٹھے پازیب کی جھنکار سے ماحول پر مدہوشی چھانے لگی ۔ ساڑھی کی سرسراہٹوں سے کون و مکاں سرگوشیاں کرنے لگے اور پھر وہ آ گئی جس کا میں انتظار کر رہی تھی ۔جس کے لیے نئی عمارت بنائی گئی تھی ۔وہ بہار کے پہلے پھول کی طرح حسین ، شبنم کے پہلے قطرے کی طرح شفاف ، لاجونتی کی پنکھڑی کی طرح نازک اور سوَرگ کی اپسرا کی طرح خوبصورت تھی ۔ میں اسے دیکھ کر تعظیم کے لیے جھک گئی ۔جب وہ دہلیز پار کر کے جھونپڑی کے اندر داخل ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک دیو داسی پربھات کے ملگجے اُجالے میں دیوتا کے حضور پیش ہو رہی تھی ۔ میں دیر تک ایک کونے میں کھڑی خوشی کے نشے میں جھومتی رہی۔

وہ درحقیقت ایک نرتکی تھی۔ رات کے سناٹے میں جب ساری دنیا سو جاتی تو اس کی پازیب کھنکتی اور ستارے گھنگھروؤں کو چومنے کے لیے تمام رات آکاش کی آخری چوٹیوں سے نیچے لڑھکتے رہتے۔ وہ جب اپنے اعضا کو گھماتی تو یوں لگتا جیسے دن اور رات کا نظام آپس میں مدغم ہو رہا ہو۔ جب وہ بل کھا کر ایک طرف کو جھومتی تو یوں لگتا جیسے زمین حرکت کرتے کرتے اچانک رُک گئی ہو اور اجرام فلکی کی نگاہیں ایک نقطے پر مرکوز ہو گئی ہوں اور تمام کائنات پر ایک سحر آلود غنودگی طاری ہو گئی ہو۔

اس کے پاس لوگوں کا ایک ٹھٹھ سا لگا رہتا۔ وہ ناچتی، لوگ دیکھتے، لوگ محظوظ ہوتے۔ وہ اپنے اپنے اعضا کو مروڑتی، اس کی ہڈیاں چٹختیں اور تمام تماشائی واہ واہ کرتے۔ تمام دیواریں اجنتا کی سی خوبصورت تصویروں سے سجی تھیں۔ وہ جھونپڑی اچانک فن کے ایک معبد میں بدل گئی تھی۔

ایک بار وہ شاہی ناچ گھر میں بلوائی گئی۔ وہ پورنیما کی رات تھی۔ تمام کائنات جیسے چاندنی میں ڈھل گئی تھی۔ دنیا نے جیسے دوسری بار جنم لیا تھا۔ نرتکی نے بہت اچھا رقص کیا اور چاند نے اپنی کرنوں کے پھول اس کے قدموں پر نچھاور کیے اور کئی آنکھیں اس کی اداؤں پر قربان ہو گئیں۔ جب وہ لوٹ کر آئی تو تھکن سے اس کا بند بند ٹوٹ رہا تھا۔ وہ رات اس کی زندگی میں شاید آخری پُرسکون اور شفاف رات تھی۔ اس کے بعد اس کی شخصیت داغ دار ہونے لگی۔ تعریف و تحسین کے غلافوں میں لپیٹ کر اس پر پھینکی ہوئی نگاہیں اپنے اپنے نشان اس کے کردار پر چھوڑتی گئیں۔

دوسری صبح وہ بازار کی ایک جنس بن چکی تھی۔ اس کی قیمت مقرر ہو چکی تھی اور وہ بکنے لگی۔ فن کے ساتھ ساتھ اس نے اپنا جسم بھی بیچنا شروع کر دیا۔ جس نے مقررہ قیمت دی اس نے اسے خرید لیا۔ کبھی گاہک اس کے پاس آتے کبھی وہ گاہکوں کے پاس چلی جاتی۔ فن اور جسم کی اس تجارت میں اب صرف نفع کا خیال رہ گیا تھا۔ دیواروں پر لگی تصویروں پر گرد جمنے لگی۔ کسی نے اسے نہ جھاڑا۔ کئی تصویریں ٹوٹ بھی گئیں اور کسی نے اسے جڑوایا نہیں۔ شراب کا دور چلتا اور رات جام کی گردشوں میں گھوم کر ختم ہو جاتی۔

اب پربھات کے دُھندلکے میں پازیب نہ کھنکتی تھی۔ رات بھر کھنک کھنک کر بھور کے ان پوتر لمحوں میں وہ اونگھنے لگتی۔ ستاروں نے کئی روز تک اپنے کان جھونپڑی کے کواڑ

پر گاڑے رکھے اور پھر مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ دیواروں پر جا بجا پان کی سُرخ پیک کے نشان روز بہ روز پھیلتے جا رہے تھے۔ لیکن نرتکی کو جیسے اس سب کا احساس ہی نہ تھا۔ وہ رات بھر جاگتی اور دن کا بیشتر حصّہ سوئی رہتی۔ جب اس کی دکان خوب چل رہی تھی، جب اسے نفع ہی نفع تھا، اچانک ایک رقاص اس کے پاس آ پہنچا۔ وہ زندگی کے اس موڑ پر تھی جب محنت اور بھرپور عیاشی نے اس کے بدن کو بُری طرح متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا جسم بہت کمزور پڑتا جا رہا تھا اس کے ذہن پر ایک بھیانک افسردگی مسلّط تھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے شعلے دفن تھے، جو اسے جھلس کر خود خاموش ہو گئے تھے، لیکن اس کے ضعیف اعضاء میں لوچ اور اس کی آواز میں اب بھی جادو تھا۔ چند ہی روز میں ان کے تعلقات گہرے ہو گئے۔ کبھی وہ رات کے آخری ٹوٹتے لمحوں میں کواڑ آن کھٹکھٹاتا، کبھی شام کے پہلے ستارے کی تھرتھراہٹ پر آ جاتا، کبھی دوپہر کی نکھری ہوئی دھوپ میں نمودار ہو جاتا۔ اور وہ جب بھی آتا نرتکی کی آنکھیں تازہ کنول کی طرح کھل جاتیں۔ اگر وہ سوئی ہوئی ہوتی تو دستک دینے پر ہی اس کی نیند کافور ہو جاتی۔ اگر تجارت کے کسی مرحلے پر ہوتی تو فوراً اپنا کاروبار سمیٹ لیتی اور جھونپڑی میں بیٹھے سب لوگ منہ تھوتھڑائے چلے جاتے اور مڑ مڑ کے اس عام سے بے ہودہ انسان کو دیکھتے اور بڑبڑاتے ہوئے اپنی راہ لیتے۔ رفتہ رفتہ رقاص نرتکی کے اوقات پر قابض ہو گیا۔ اب اس جھونپڑی میں دن رات صرف نغمے برستے تھے، گھنگھرو چھنکتے تھے۔ اور رقص ہوتا تھا۔ اُن دونوں نے کسی آپسی سمجھوتہ کے بعد بیرونی دنیا سے ناطہ توڑ لیا تھا۔ وہ صرف فن کے لیے جیتے تھے اور زندگی کا ہر لمحہ اس کے ارپن کرتے تھے۔ میں یہ سب کچھ دیکھتی اور خوش ہوتی۔

پھر راجہ کے لڑکے کا جنم دن آ گیا۔ نرتکی کو دربار میں ناچنے کے لیے کہا گیا۔ اس نے انکار کر دیا۔ اس نے کہلا بھیجا کہ اب اس نے اپنی زندگی کی راہیں بدل لی تھیں لیکن طاقت نے اس تبدیلی کی اجازت نہ دی اور نرتکی کی اس جرأت اور بے باکی کے لیے سزا تجویز ہونے لگی اور سزا تجویز ہو گئی۔ یہ طے پایا کہ دربار میں اس کا ننگا ناچ کرایا جائے۔ اگر وہ انکار کرے تو اس کے نازک اعضا کو بھالوں سے چھیدا جائے اور اس کے تڑپنے کا نظارہ کیا جائے۔ دیکھا جائے کہ ایک ناچنے والی تڑپتی کس ادا سے ہے۔

ایک دن پہلے یہ شاہی پیغام اُسے ملا۔ اُس رات جھونپڑی میں سوگ چھایا رہا۔ زندگی نے سانس روک لی۔ اور فن بے حس ہو گیا ـــــــ اماوس کی بھیانک کالی گہری رات تھی اور وہ

دونوں رات کے اس طویل اندھے غار میں جانے کہاں نکل گئے۔ اسے پکڑنے کے لیے انعام مقرر ہوئے لیکن کوئی اُس کی پرچھائیں کو بھی نہ چھُو سکا۔ شاہی عتاب جھونپڑی پر نازل ہوا اور اس میں پڑی ہر شے کو سامنے میدان میں جہاں غلاظت کا ڈھیر جمع رہتا ہے اکٹھا کر کے جلا دیا گیا۔

چاند ہر ماہ ایک پوری مدت اس کی تلاش میں آسمانی وسعتیں ٹٹولتا۔ تارے ہر رات اسے ڈھونڈنے آتے، میدان میں اکٹھی ہو کر لڑکیاں نرتکی کے گائے ہوئے گیت گاتیں۔ لیکن نرتکی پھر نہ آئی۔ فن یہاں پھر کبھی نہ پنپ سکا۔ تخیل کی دیوی طاقت کی بیڑیوں میں نہ جکڑی جا سکی اور اب غلاظت کے ڈھیر سے نکلی ہوئی بُو کی لپٹیں جب ارد گرد پھیلنے لگتی ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے نرتکی شہزادے کے جنم دن پر بھاگ نکلنے کی لاکھ کوشش کے باوجود گرفتار کر لی گئی تھی۔ اُسے دربار میں ننگا کھڑا کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس نے ناچنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر اس کے نازک جسم میں بھالے چبھوئے گئے تھے اور ان کی تاب نہ لا کر وہ تڑپ کر مر گئی تھی۔ اس کی حسین لاش اب تک گل رہی تھی اور اس کے زخموں سے تعفن کے شعلے ابل رہے تھے۔ وہ شعلے سلگتے رہیں گے جب تک بھالے چبھونے والے ہاتھ جل نہیں جاتے، جب تک شہزادوں کے جنم دنوں پر ننگے ناچوں کا رواج ختم نہیں ہو جاتا۔ جب تک فن کو بیسوا سمجھ کر سودے ٹھہرائے جانے بند نہیں ہوتے۔"

"میں حیران ہوں تمہارے خیالات میں اتنی گہرائی اور رنگینی کیسے آئی!" میں نے کہا۔

"میں نے زندگی کی تلخی اور فن کی عظمت دیکھی ہے۔" ایک کھوکھلا اور بوڑھا قہقہہ لرزا۔ پھر اچانک خاموشی چھا گئی۔

میرے بوڑھے باپ نے کھانسنا شروع کر دیا تھا اور بچہ ماں کے پہلو میں لیٹے ہوئے چیخنے لگا تھا اور طاق میں رکھا ہوا چراغ آس بھری نظروں سے میری طرف تک رہا تھا تھوڑی دیر کے لیے میں کوٹھڑی میں رچی ہوئی تلخ بُو کو چکھتا رہا اور پھر چند لمحوں کے بعد جب باپ کے جھلسے ہوئے سینے نے اپنا مواد باہر اُگل دیا اور بچے نے ماں کا تھن اپنے منہ میں لے لیا تو ایک سکون سا محسوس ہونے لگا۔

"دیکھا اس بوڑھے نے عین میرے ماتھے پر تھوکا ہے۔" آواز کڑکنے کی کوشش میں بھی نہ کڑک سکی۔

" تو بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں ! اچھی رُوح " ؟ میں نے معذرت کے سے لہجہ میں کہا۔

" تم نہیں تو اور کون کر سکتا ہے "!

" تو میں یہ جھونپڑی چھوڑ دوں گا۔ تم شاید نہیں جانتیں کہ کتنی مجبوری کے بعد میں نے اس کوٹھڑی میں رہنا قبول کیا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ میں نے کن حالات میں مِل کی نوکری اختیار کی ہے۔

میں نے ہمیشہ مِل والوں کے خلاف لڑتا رہا ہوں۔ جھونپڑوں میں رہنے والوں کے حقوق کے لیے سنگھرش کیا ہے "!

" میرا مطلب "

لیکن میں نے اس کی بات نہ سنی۔

" میں نے کتنی ہی راتیں دوکانوں کے برآمدوں میں سو کر گزارنے کے بعد، سرد ہوا کے جھونکوں میں ٹھٹھرنے کے بعد، کتنے ہی دن اپنی بیوی اور باپ سمیت باغوں کی سوکھی ہوئی گھاس پر تڑپنے اور پولیس کی جھڑکیاں سہنے کے بعد اس ذلیل محبس میں قید ہونا گوارہ کیا ہے اور اس کے لیے تین ماہ کی تنخواہ پیشگی دی ہے۔ تم پوچھتی ہو میں رات کو کیوں نہیں سوتا؟ جب چار آدمیوں کے پیٹ بھرنے کا سوال درپیش ہو اور جیب میں ایک کوڑی نہ ہو تو کون سو سکتا ہے اطمینان سے؟ جب بھوک کی آگ آنتوں کو جلا رہی ہو تو نیند کی لوریاں اپنا اثر کھو دیتی ہیں "

" میں نے یہ کب کہا ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ "!

" اگر کوڑھی مرد اور اس کی ساتھی یہاں نہ رہے۔ اگر نرتکی اور رقاص اسے اپنے نغموں سے آباد کرنے کے بعد اسے سنسان کر گئے۔ اگر پورنما کی رات نے اسے نیا جنم دیکر دوبارہ موت کے ہاتھوں میں سونپ کر اپنی راہ لی تو میں بھی چلا جاؤں گا گھر کی رُوح۔ میں خود بھی عمر بھر اس قید میں تڑپ کر جاگ نہیں سکتا "!

" تم مجھ پر ظلم کر رہے ہو۔ تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ میں تو چاہتی ہوں کہ تم سدا کے لیے یہاں رہو اور مجھے بھی اپنے دکھ سکھ میں شریک ہونے دو۔ میں دُور کھڑے ہو کر یہاں رہنے والوں کی تلخیاں اور سکون، امید اور مایوسی، محبت اور نفرت، زندگی اور موت کے کھیل دیکھ دیکھ کر اُوب گئی ہوں۔ کوڑھی نے جب خُون آلود ہاتھوں سے سر کو تھام کر گیت گائے تو میں اس کے سرہانے آن بیٹھی لیکن اس نے میری طرف آنکھ نہ اٹھائی۔ طوفان کی رات جب اس

کا بچہ مرنے لگا تو میں نے اپنا سوکھا آنچل اس پر ڈالنے کی کوشش کی لیکن اس نے بے توجہی برتی۔ اور نرتکی بھی ناچ ناچ کر اپنے گاہکوں کا من بہلاتی رہی یا رقاص کو پرسن کرتی رہی۔ اس کے لیے وہ بھی کچھ نہ کر سکی، جس نے آسمانوں کی وسعتوں میں آوارہ گھوم کر، تاریکیوں میں اعتماد کی شمعیں جلا کر اسے ڈھونڈا تھا۔ اور جب وہ چلی گئی تو میں اسے یاد کرتی رہی، یہ شکستہ دیواریں اسے پکارتی رہیں، یہ کمزور کواڑ چیختا رہا، یہ چھت روتی رہی۔ اور پھر تم آئے۔"

"نہیں میں بھی چلا جاؤں گا" میں نے غصّہ سے کہا۔

"تم جاؤ مت صرف ان دیواروں پر لگے تھوک کے دھبّوں کو صاف کرا دو، چھت پر جمی چراغ کی ہزاروں راتوں کی اُگلی ہوئی کالک کو دھو ڈالو فرش پر مسلسل استعمال سے پیدا ہوئے گڑھوں کو بھروا دو اور چھت کے قریب ایک روشن دان نکلوا لو جس میں سے کبھی کبھی سورج کی کرنیں اندر داخل ہو جایا کریں۔"

میں نے یہ سُنا اور ایک قہقہہ لگایا۔ کتنا بھیانک تھا وہ قہقہہ، جیسے ایلورا کے غار کسی ہتھوڑے کے مہیب ٹکراؤ سے گونج اٹھے ہوں۔

"تمہاری نظر صرف دیوار کی بیرونی سطح پر جمی مٹی کی موٹی تہہ پر پڑتی ہے اور میری نگاہ اس کے نیچے پھیلی سینکڑوں دراڑوں پر۔ کتنے گہرے خلا ہیں ان دیواروں میں۔ کتنے بڑے بڑے زخم ہیں ان کے سینے میں تھوک کے دھبّوں کو صاف کرنے سے، انھیں کھرچنے سے وہ ناسور، وہ زخم، وہ پیپ زدہ پھوڑے تو ٹھیک نہ ہوں گے بلکہ وہ اور بھیانک شکل اختیار کر لیں گے ــــــ تمہیں چھت پر صرف کالک نظر آتی ہے اور میں اس کے نیچے لاکھوں شگاف دیکھ رہا ہوں جن کا احساس تمہیں اس وقت ہوگا جب کوئی عظیم طوفان آئے گا، جب اچانک نیلے آسمان سے ہی اولوں کی بارش ہونے لگے گی۔ جب ہر طرف دُھوپ پھیل رہی ہوگی، اور آکاش سے پانی کے آبشار لڑھکنے لگیں گے۔ کالک کو دھونے سے تو وہ شگاف اور واضح ہو جائیں گے۔ اور زیادہ ڈراؤنی نظر آنے لگے گی یہ چھت ــــــ اور فرش پر بکھرے ہوئے یہ گڑھے! تم جانے کس طرح انھیں خشک سمجھتی ہو۔ مجھے تو ان میں خون اور پیپ کے چھوٹے چھوٹے جوہڑ نظر آتے ہیں۔ ایسا خون جو مِل میں چلتی ہوئی مشینوں سے ٹپکتا ہے۔ جو برف ایسے سفید اجسام سے رِستا ہے، ایسی پیپ جو جُھلسے ہوئے انسانی ذہنوں میں پرورش پاتی ہے جو معاشرتی اور اقتصادی ناسوروں میں بھرتی رہتی ہے اور پھر اچانک پھُوٹ پڑتی

ہے۔ پھوڑوں سے کوئی غیر مرئی ہاتھ آ ٹکراتا ہے اور دھرتی پر اچانک خون بہنے لگتا ہے۔ پیپ رینگنے لگتی ہے۔ اور جوہڑ بھر جاتے ہیں۔ گڑھے اُبلنے لگتے ہیں اور تعفّن دم گھونٹنے لگتا ہے"۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں، دیوار پر یہ سایہ کیسے تڑپ رہا ہے۔ تمہاری آواز میں یہ گرج کیسی ہے؟"

چراغ کی لَو تھرا رہی تھی۔ جیسے طوفان کی زد میں آ گئی ہو۔

"میں ان دیواروں کو اپنے کمزور بازوؤں سے دھکیل کر گرا دوں گا۔ میں کالک سے بھری اس چھت کو فرش کے گڑھوں کے ساتھ ملا دوں گا۔ میں ان بوسیدہ بنیادوں پر کھڑی شکستہ عمارت کی مرمت کرنے کے بجائے اسے ڈھا دینا بہتر سمجھتا ہوں۔ اس جگہ ایک نئی عمارت کھڑی ہوگی۔ ایک نیا نظام اُبھرے گا، ایک نیا سورج طلوع ہوگا، ایک نیا اُفق دھرتی کو اپنی آغوش میں بھینچ لے گا"۔

"لیکن تم، تمہارا باپ، تمہاری کمزور بیوی کہاں رہیں گے؟"

جیسے رُوح میرے قریب ہی سرگوشی کے انداز میں بول رہی تھی، مجھے اپنی بات پر سنجیدگی سے سوچنے کو اُکسا رہی تھی۔

"ان کھنڈروں میں، جہاں ناسُوروں سے تڑپتے ہوئے کوڑھی بھی مستقبل کے خواب دیکھ سکتے ہیں، جہاں آسمان کے علاوہ کوئی دوسری چھت میسّر نہیں"۔

اور پھر گہری خاموشی چھا گئی، چراغ کی لَو ساکن ہو گئی، دیوار پر لرزتا ہوا سایہ جیسے دیوار پر گاڑ دیا گیا تھا۔

میرا بُوڑھا باپ یوں کھانسا جیسے کوئی پُرزور آبشار کسی غار میں وندنا رہا ہو۔ ماں کے پہلو میں لیٹے ہوئے بچّے کے کُسمی ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی، جیسے پربھات کے سمے کوئی کلی کھل رہی ہو۔ چراغ کی لَو سہم کر مجھ سے پُوچھ رہی تھی۔

"کب ہوگی تمہاری سحر؟"

اور اجنتا کی خوبصورت مورتی کے سینے پر رکھا ہوا گلاب کا پھول، میرا بچّہ جیسے اپنی معصوم توتلی زبان میں بول رہا تھا۔

"سحر قریب ہے"

میں نے دیکھا چراغ کی لَو آخری سنبھالا لے رہی تھی۔

ایک کامیاب مرد

اب یاد نہیں کہاں پڑھا تھا۔
"ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک ناکامیاب عورت کھڑی ہوتی ہے۔"
یہ لائن بڑی دلچسپ لگی تھی اور میں اپنے جاننے والے کامیاب مردوں کے پیچھے کھڑی ناکامیاب عورتوں کو گننے لگا تھا۔ یہ عمل اب بھی جاری ہے اور میرا خیال ہے کہ کچھ عرصہ اور جاری رہے گا کیونکہ اس عمل نے مجھے بڑے دلچسپ نتائج ملے ہیں۔
ناکامیاب عورتوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اس کیٹیگری میں خاصا تنوع تھا اور کئی قسم کی عورتیں اس زمرے میں شامل ہو سکتی تھیں۔ اپنے جان پہچان کے لوگوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا تو ناکامیاب عورتوں کی مندرجہ ذیل قسمیں ملیں، جو اپنے خاوندوں کے پیچھے کھڑی اپنے بھرپور سائے سے انہیں اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھیں۔
محبت میں بُری طرح زخم کھائی عورتیں۔
بانجھ عورتیں۔
وہ عورتیں جن کی اولاد قابو میں نہ ہو۔
ایسی عورتیں جو وقت سے پہلے اپنی جسمانی کشش کھو بیٹھیں۔
وہ عورتیں جن کے ماں باپ بہت امیر ہوں لیکن شوہر معمولی گھرانے سے تعلق رکھتے ہوں۔
عورتیں جنھیں دوسروں سے حسد ہو۔
ایسی عورتیں جنھیں بہت اونچے خواب دیکھنے کی عادت ہو۔
وہ عورتیں جو ذہین تو نہ ہوں لیکن بہت باتونی ہوں۔
ایسی عورتیں جو بہت جھگڑالو اور شکی مزاج ہوں۔

اور وہ عورتیں جو اپنی کمزوریاں چھپانے کے لیے دھرم کرم کا ڈھونگ رچتی ہوں۔

یا جنسی طور پر ناآسودہ عورتیں۔

فہرست مکمل نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے تجربے کی بنا پر اس میں اور اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ صرف اِنڈی کیٹو لِسٹ ہے' فائنل نہیں۔

ایسی عورتوں کے خاوند اُن کے سائے کی گرفت سے بچنے کے لیے چوبیس گھنٹے اِدھر اُدھر بھاگتے پھرتے ہیں اور اس کوشش میں رہتے ہیں کہ جہاں وہ آج کھڑے ہیں کل وہاں سے آگے نکل جائیں وہ اِس سماجی اور اقتصادی دوڑ میں ون ٹریک مائنڈ والے آدمی بن جاتے ہیں اور کہیں نہ کہیں پہونچ ہی جاتے ہیں۔ اِس کہیں نہ کہیں پہونچ جانے کو ہی سماجی اصطلاح میں کامیاب ہونا کہا جاتا ہے۔

ایسے آدمی اگر بزنس مین ہیں تو دیر تک اپنے کیبن میں بیٹھے رہتے ہیں۔ کسی سرکاری دفتر میں ہیں تو دفتر کے بعد فائلیں نکالتے ہیں۔ ان کی اسٹینو گرافر یا پرسنل سکریٹریز جو اکثر عورتیں ہوتی ہیں اُن کے باس اپنی گاڑیوں میں انہیں' اُن کے گھر کے پاس اُتار کر کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ گھر وہ پھر بھی نہیں جاتے ان کی بیویاں دفتر میں ٹیلی فون کر کے کرخت گھنٹیوں کی آوازیں سُن سُن کر ٹیلی فونوں کو توڑتی رہتی ہیں اور گھر کے نوکر پر یا اپنے بچوں پر دہاڑتی رہتی ہیں —— ایسے مرد کچھ عورتوں کو کھیل بھی رکھ لیتے ہیں۔ رکھیل رکھی جانے والی عورتوں کی بھی کئی قسمیں ہیں جن کا ذکر کسی دوسری کہانی میں کروں گا۔ یہاں ان کا ذکر نقادوں کی رائے کے مطابق' کہانی کو خراب کرے گا۔ ویسے بھی کہانیوں کا مقصد یا تو تفریح مہیا کرنا ہے یا پڑھنے والوں کو خراب کرنا ہے۔ یوں بھی آج کے سماج میں لٹریچر کا مقصد رہ بھی کیا گیا ہے؟

جس آدمی کا میں آپ سے تعارف کروا رہا ہوں اس کا نام پربھو دیال مہاجن ہے۔ اب وہ سماجی لحاظ سے ایک خاصا کامیاب آدمی ہے۔ اس کا اپنا بزنس ہے۔ وہ جموں کے قریب قصبہ اکھنور کا رہنے والا ہے۔ یہ کافی بڑا قصبہ ہے اور یہاں اکثر لوگ چھوٹا موٹا کاروبار کرتے ہیں۔ یہاں مہاجنوں کے بہت سے گھر ہیں اور بیشتر لوگ دُکاندار یا تاجر ہیں۔ قصبے کو چھوتا ہوا دریائے چناب گزرتا ہے' چناب کا پانی بہت ٹھنڈا ہے اس لیے جب اس علاقے میں غضب کی گرمی پڑتی ہے تو اکھنور کی شامیں خنک اور راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ لوگ اپنے گھروں کی چھتوں پر ٹھنڈی ہوائیں گہری نیند سوتے ہیں اور صبح جلدی جاگ کر چناب پر نہانے چلے جاتے ہیں۔ جب پربھو دیال کی شادی ہوئی تو وہ بھی ہر روز صبح سویرے چناب پر آ کر نہایا کرتا تھا اور بہت دیر تک دریا کے پانی میں کھڑا اپنے ہاتھوں کے

چلّو بنا کر سورج کی گرم کرنوں پر چناب کا ٹھنڈا پانی پھینکا کرتا تھا۔ بس تپتے ہوئے سورج کو ٹھنڈا پانی ارپن کرتے رہنے کے کارن اس کا بیاہ امرتسر کے لالہ دُنی چند کی لڑکی رانو سے ہو گیا۔

دراصل بات یہ ہوئی تھی کہ رانو امرتسر کے اپنی گلی ہی کے ایک برہمن لڑکے سے پیار کرنے لگی تھی۔ لڑکا بڑا خوبصورت تھا اور کھاتے پیتے گھرانے کا تھا، لیکن لالہ دنی چند اپنی لڑکی اپنی برادری سے باہر نہیں بیاہنا چاہتے تھے۔ رانو نے منت سماجت کر کے اپنے کامیاب بیوپاری باپ کو تو راضی کر لیا لیکن وہ اپنی ناکامیاب ماں کو اس بات پر راضی نہ کر سکی جس کی پانچ بیٹیاں تھیں۔ اگر ایک بیٹی کا، جو سب سے بڑی بھی تھی بیاہ برادری سے باہر ہو گیا تو اس کی باقی چار کم پڑھی لکھی بیٹیاں تو کنواری رہ جائیں گی۔ رانو کی ماں اپنی ضد پر اڑی رہی اور ایک دن رانو نے زہر کھا لیا۔ وہ تو خیر بھگوان کی کرپا سے وقت پر ڈاکٹر نے بچا لیا ورنہ اگلے دن تو اس تنگ سی گلی میں سے رانو کی ارتھی اُٹھتی۔ بچ جانے کے بعد رانو اتنی شکستہ دل ہو گئی کہ اس نے گھر کی چوکھٹ سے باہر قدم رکھنا بھی چھوڑ دیا اور یوں تنگ اندھیرے کمروں میں گُھٹ گُھٹ کر جینے سے اس پر بیہوشی کے دورے پڑنے لگے۔ بس ان ہی دنوں اس کی گلی کا خوبصورت برہمن لڑکا امرتسر چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔

کوئی ایک مہینے بعد جب پربھو دیال مہاجن اپنے باپ گوریال مہاجن کے ساتھ اپنی دوکان کے لیے کپڑا خریدنے امرتسر آیا تو لالہ دُنی چند نے اسے رانو کے لیے چُن لیا اور گوریال مہاجن کو امرتسر کی مارکیٹ سے اتنا سامان اٹھوا دیا کہ اکھنور تو کیا جموں کے بھی کسی بڑے سے بڑے دوکاندار کے پاس اتنا سامان نہیں تھا۔ اس رات دونوں باپ بیٹا لالہ دُنی چند کے مہمان رہے اور رانو کو چھوڑ کر گھر کی سب لڑکیوں نے پربھو دیال مہاجن کی جی بھر کر سیوا کی اور اُن کی ماں نے اسے اگلی صبح ایک سو ایک روپے دے کر وداع کیا۔

تین ماہ کے بعد جب رانو کی ڈولی، امرتسر کی اس تنگ سی گلی سے نکلی تو اُس وقت اُس کے نام اس برہمن لڑکے کا خط آیا تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ وہ اگلے ہفتے اسے اپنے ساتھ لے جانے کو آ رہا تھا۔ رانو کو یہ خط اس کی چھوٹی بہن نے اس وقت دیا جب وہ تین دن کے بعد اکھنور سے امرتسر واپس آئی تھی، پربھو دیال دیال مہاجن کے ساتھ۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد ہی رانو کو بیہوشی کا دورہ پڑا تھا۔ اس کا خاوند اس وقت لالہ دُنی چند کی دوکان پر تھا اس لیے اسے اس بات کا علم نہیں تھا۔ دو دن کے بعد جب رانو اپنے گھر والے کے ساتھ واپس اکھنور گئی تو وہ بہت اُداس تھی اور رو رو کر اس کی آنکھیں سُوج گئی تھیں۔ پربھو دیال مہاجن یہی سمجھتا رہا کہ رانو کو اپنے ماں باپ کو چھوڑنے

کا بڑا غم تھا اور اس لیے وہ اس بُری طرح رو رہی تھی۔ رانو کے جانے سے پہلے اس کی چھوٹی بہن نے اُس سے کہا۔

"بر جُو آنے والا ہے چار دن کے بعد؟"

"ہاں۔"

"اس سے کیا کہوں؟"

"کچھ مت کہنا۔"

"وہ تمہیں لینے آ رہا ہے۔"

"کہہ دینا رانو مر گئی۔"

"یہ کیسے کہوں گی۔"

"بس یہی کہنا۔"

"اور؟"

"اس کا خط اسے لوٹا دینا۔"

"تمہارا پتہ پوچھے تو؟"

"مت بتانا۔ وہ کہیں لکھنؤ آ گیا تو میرا بیڑا ہی غرق ہو جائے گا۔" بات کا یہ آخری حصہ پربھو دیال مہاجن نے سُن لیا تھا۔

"کس کا بیڑا غرق ہو رہا ہے؟"

"میرا۔" رانو کی چھوٹی بہن نے کھلکھلا کر جواب دیا تھا اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی تھی اور پربھو دیال مہاجن خاموشی سے اُداس رانو کو نہارے جا رہا تھا۔ رانو اب لکھنؤ آ کر پھر امرتسر نہیں گئی۔

اپنی زندگی کا وہ باب اس نے بند کر دیا۔ جو اس کی زندگی کا بڑا ہی دردناک باب تھا۔ یہ اور بات تھی کہ کبھی کبھی درد کی کوئی ہلکی سی لہر چناب کے پانی میں گھل کر اس کی آتما سے آ ٹکراتی تو اس وقت اسے ایسا لگتا جیسے وہ سر سے پاؤں تک درد کے گہرے پانیوں میں ڈوب رہی ہو اور کوئی اسے سنبھالنے والا نہ ہو۔ شادی کے بعد کئی برسوں تک اُس کی گلی کا وہ خوبصورت برہمن لڑکا اسکی نیندیں حرام کرتا رہا۔

اس دوران پربھو دیال مہاجن کے باپ کا انتقال ہو گیا اور اس نے کپڑے کا کاروبار چھوڑ کر

جموں میں لوہے کی چادروں کا کوٹہ لے لیا اور پریڈ گراونڈ کے سامنے بیلچے بنانے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ لگا لیا، جس سے اسے بیحد منافع ہونے لگا۔ وہ اس دوڑ میں شامل ہو گیا جس کا مقصد کہیں نہ کہیں پہونچ جانا ہوتا ہے۔

کئی سال بانجھ رہنے کے بعد اور اس کا قصور وار اپنے خاوند کو ٹھہرا کر اور تلخ باتوں کی بوچھار کر کے تھک جانے کے بعد، رانو سے ایک کمزور سا سانولے رنگ کا بیٹا پیدا ہوا۔

اس روز پربھودیال مہاجن نے اپنے کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کو لڈو بانٹے، اس لیے کہ اتنے برس کی جو تہمت اس کی بیوی نے اس پر لگائی تھی وہ آخر غلط ثابت ہوئی تھی۔ اُسے لگا جیسے اس پر کئی برسوں سے چھوٹی عدالتوں میں جو مقدمہ چل رہا تھا، اُسے ہائی کورٹ نے خارج کر دیا تھا۔

جب بچے کا نام کرن سنسکار ہوا تو رانو نے اس کا نام برج موہن رکھا۔ کیوں کہ یہی اس برہمن لڑکے کا نام تھا، جسے اس نے شادی سے پہلے پیار کیا تھا۔ جب ہون کنڈ میں جلتی سامگری کو ساکھشی مان کر وہ پربھودیال مہاجن کے ساتھ پھیرے لے رہی تھی اس وقت بھی اس کی آنکھوں کے سامنے برج موہن ہی تھا، اکھنور سے برات لے کر آیا اس کی برادری کا مہاجن لڑکا نہیں، جسے اس کے ماں باپ نے پسند کیا تھا۔ پربھودیال بیٹے کا نام کچھ اور رکھنا چاہتا تھا لیکن رانو نے منع کر دیا تھا۔ کامیاب مرد کے پیچھے کھڑی ایک ناکامیاب عورت کی یہ پہلی بڑی کامیابی تھی۔

کچھ اور سالوں کے بعد پربھودیال مہاجن کسی سے پارٹنرشپ کر کے دہلی چلا آیا، جہاں اس نے جوتوں کی فیکٹری لگا لی۔ رُوس سے اُسے کئی لاکھ جوتوں کے کئی آرڈر ملے اور پربھودیال مہاجن دو برسوں میں ہی لکھ پتی بن گیا۔ متھرا روڈ پر فرینڈز کالونی میں اس نے اپنا مکان بھی بنوا لیا۔ اس کا کارخانہ بھی فریدآباد میں تھا جو وہاں سے بہت نزدیک تھا اور کار سے جانے میں بیس پچیس منٹ لگتے تھے۔ اسی دوران اُن کے ہاں ایک لڑکی ہوئی جو صحت مند بھی تھی اور خوبصورت بھی۔ اس کا نام رانو نے چیتنا رکھا۔ یہی وہ نام تھا جو اس برہمن لڑکے نے برسوں پہلے اپنی کبھی ہونے والی بیٹی کا تجویز کیا تھا۔

اب تک رانو کی چاروں بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور اس کے ماں باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اُن کے ایک داماد نے ہی لالہ دنی چند کا کاروبار اپنے قبضے میں کر لیا تھا اور اب چاروں دامادوں میں لگاتار جھگڑا چل رہا تھا۔ رانو کے بار بار کہنے پر بھی پربھودیال مہاجن نے

اس خاندانی جھگڑے میں شمولیت نہیں کی تھی اور اسی وجہ سے ان دونوں میں اکثر تکرار ہو جاتی تھی۔ اتنے برسوں کی قربت اور نظریاتی اختلاف نے میاں بیوی میں وہ دکھاوے کی جو آپسی عزت ہوتی ہے وہ بھی ختم کر دی تھی۔ رانو کی صحت بھی اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی اور اس کے چہرے کی جاذبیت بھی کم ہو گئی تھی۔ دو بچوں کو جنم دینے کے بعد وہ موٹی بھی ہو گئی تھی۔

اکثر گفتگو میں وہ تلخ ہو جاتی تھی۔ اپنے باپ کی جائیداد کے جھگڑے سے ایک دم الگ رہنا اور اس میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کرنا اسے پسند نہیں تھا۔ ہر دوسرے تیسرے روز اس بکھیڑے کو لے کر اپنے خاوند سے بحث کرنے لگتی۔ پربھو دیال مہاجن کے سامنے اپنے کاروبار کے بڑے بڑے مسئلے تھے اس لیے وہ بحث میں کوئی دلچسپی نہ لیتا اور بات کو ٹالنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک دن شام کو چائے پر رانو نے دوبارہ وہی قصہ چھیڑ دیا۔

"تم بات کو اس لیے ٹال جاتے ہو کیوں کہ جائیداد میرے باپ کی ہے۔"

"یہی بات ہے۔"

"تمہارے باپ کی جائیداد پر لوگ اس طرح قبضہ کرتے تو تم کبھی خاموش نہ بیٹھے رہتے۔"

پربھو دیال مہاجن نے رانو کو مسکرا کر دیکھا کہ شاید بات ٹل جائے۔

لیکن رانو جھلا کر ہاتھ میں پکڑی چائے کی پیالی اس پر پھینکنے کو اٹھی۔ پربھو دیال جنگ کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ ایک طرف ہو گیا۔

اسی لمحے ان کے دونوں بچے کمرے میں داخل ہوئے اور اپنی ماں کو اس حالت میں دیکھ کر سہم گئے۔

ایک کامیاب مرد اور ایک ناکامیاب عورت میں جو جنگ شروع ہوئی تھی اب اس میں تیزی آ گئی تھی۔

پربھو دیال مہاجن سے جب میری ملاقات ہوئی تو جنگ کا محاذ کافی گرم ہو چکا تھا۔ انھی دنوں میں نے وہ لائن کہیں پڑھی تھی جس سے میں نے اس کہانی کا آغاز کیا ہے۔

اُن دنوں میں کامیاب مردوں کے پیچھے کھڑی ناکامیاب عورتوں کی ٹوہ میں تھا۔

پربھو دیال مہاجن نے جوتوں کی فیکٹری میں اپنی پارٹنرشپ ختم کر دی تھی۔ اور اسی سلسلے میں مجھ سے قانونی مشورہ لینے آیا تھا۔ وہ فرید آباد میں ہی ٹیلی ویژن بنانے کی فیکٹری لگانا چاہتا تھا۔ اُس کے لڑکے برج موہن نے الیکٹرانکس میں انجینئرنگ کی تھی اور پربھو دیال مہاجن

اسی کو ایس ٹیبلش کرنے کے لیے نئی فیکٹری لگانا چاہتا تھا۔ لیکن لڑکے کو اس میں دلچسپی نہیں تھی۔ اُس نے ایک ساؤتھ انڈین لڑکی سے شادی کر لی تھی اور اپنے ماں باپ سے الگ ہو گیا تھا۔ پر بھودیال مہاجن کو اس بات کا بہت افسوس تھا کیوں کہ اس نے جتنی بھی فیوچر پلاننگ کی تھی سب ختم ہو گئی تھی۔ اس کا پارٹنر بہت ہی کم رقم دے کر اسے فیکٹری سے الگ کرنا چاہتا تھا اور یہ بات اس کے لیے بڑی نقصان دہ تھی اس کا مطلب تو یہ تھا کہ نہ تو وہ جوتوں کی فیکٹری کا مالک رہے گا، نہ ٹیلی ویژن بنانے کی فیکٹری ہی لگا سکے گا۔

زندگی کے اسی موڑ پر یہ بھودیال مہاجن مجھے ملا تھا۔

مجھے وہ بڑا خلیق اور وضعدار آدمی لگا، جسے اپنا ماضی یاد تھا اور وہ یہ نہیں بھولا تھا کہ وہ ایک معمولی گھر کا آدمی تھا اور اس نے محنت کر کے کامیابی حاصل کی تھی۔ وہ میرے پاس ایک کلائینٹ کی حیثیت سے آیا تھا اور میں نے قانونی مشورہ دینے کے لیے جو فیس اُسے بتائی اُس نے فوراً منظور کر لی تھی۔ وہ واقعی ایک کامیاب آدمی تھا جو اپنی کامیابی کو قائم رکھنا چاہتا تھا۔ جب ہم بیئر کی ایک ایک بوتل پی چکے تو میں نے اُس سے پوچھا۔

"مہاجن صاحب، آپ کے خیال میں زندگی میں کامیابی ہمیں کیسے ملتی ہے؟"

"محنت سے"

"اور؟"

"ستاروں کی مدد سے۔"

"اور؟"

"اور بیوی کی مہربانی سے۔"

"وہ کیسے؟"

"اگر بیوی معمولی گھر کی ہے اور اُس کی کچھ تمنائیں ہیں تو وہ اپنے خاوند کو ہر لمحہ انسپائیر کرتی رہتی ہے۔ اس کا حوصلہ نہیں ٹوٹنے دیتی۔

اُس سے رات دن کی فرمائشیں کر کے اسے پریشان نہیں کرتی؟"

"وہ اپنے خاوند کے مسائل جانتی ہے اور ان کا حل تلاش کرنے میں اُس کی مدد کرتی ہے۔"

"کیسے؟"

"پیار سے، ہمدردی سے، سیکس سے۔ سیکس آدمی کی بہت بڑی کمزوری ہے اور ایک سمجھدار عورت، مرد کی اس کمزوری کو طاقت میں بدل دیتی ہے۔"

جب میں نے بیئر کی دوسری بوتل کھول کر گلاس میں بیئر ڈالی اور میرے کلائینٹ نے اسے اپنے ہونٹوں سے لگایا تو میں نے ایک اور سوال کیا۔

"اگر بیوی معمولی گھر کی نہ ہو تو کیا ہوتا ہے مہاجن صاحب؟"

"وہی جو میرے ساتھ ہوا ہے۔" بیئر کا آدھا گلاس میز پر رکھتے ہوئے پرسھو دیال مہاجن نے زور کا قہقہہ لگایا۔ پھر اس نے جیب میں سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ڈھیر سارا دھواں کمرے کی فضا میں بکھیر دیا۔

"آپ کے ساتھ کیا ہوا؟ مے آئی نو؟"

"میں ایک معمولی دکاندار کا بیٹا تھا اور میری بیوی ایک امیر ماں باپ کی بیٹی تھی اور پھر محبت میں زخم کھائی ہوئی تھی۔"

"یہ کیسے معلوم ہوا آپ کو؟"

"بس ہو گیا۔ آپ میرے راز جاننے کی کوشش نہ کیجئے۔"

"آئی۔ ایم۔ سوری۔"

مجھے لگا کہ پرسھو دیال مہاجن نے جو بات بے دھیانی میں کہہ دی تھی اس کی مزید وضاحت کرنا اسے گوارہ نہ تھا۔ مجھے اپنی حرکت پر افسوس ہوا اور میں نے خفت مٹانے کے لیے بیئر کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

"میری کامیابی میں میری بیوی کا بڑا ہاتھ ہے۔"

"جی۔" میں نے صرف یہی مختصر جواب دینا مناسب سمجھا۔

"اس کی نجی فرسٹریشن، میری روح پر کوڑے لگا لگا کر مجھے در بدر بھٹکاتی رہی۔ میری ساری دوڑ دھوپ میری بیوی کے تعاقب کی وجہ سے تھی۔ میں بھاگتا رہتا تھا اور وہ میرا پیچھا کرتی رہتی تھی۔ میں کسی نہ کسی منزل پر اس لیے پہونچا کہ اس نے مجھے راستے میں کہیں رکنے نہ دیا۔" پھر وہ خاموش ہو گیا اور چپ چاپ بیئر پینے لگا۔

"آئی کین انڈر سٹینڈ دیٹ۔"

"اینی کمینٹ؟"

"میں دوڑ دھوپ اس لیے نہیں کرسکا کہ میری بیوی نہیں تھی۔"

میری اس بات کا پربھو دیال مہاجن نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ایک زوردار قہقہہ لگایا جس میں میرا قہقہہ بھی شامل ہوگیا۔

اور یہ سیشن یہیں ختم ہوگیا۔

میرے قانونی مشورے سے پربھو دیال مہاجن کو یہ فائدہ ہوا کہ اس کا پارٹنر اس کا جتنا نقصان کرنا چاہتا تھا اُتنا نہیں کرسکا۔ اس کی ساکھ بنی رہی۔ لیکن اس کا لڑکا برج موہن اس کے ساتھ ٹیلی ویژن کی فیکٹری لگانے پر راضی نہ ہوا۔ بعد میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا لڑکا اپنی بیوی کے ساتھ وشاکھاپٹنم چلا گیا تھا۔ پربھو دیال مہاجن کی بیوی رانو سے میری ملاقات بہت بعد میں ہوئی۔

ابھی کچھ دن پہلے اس نے اپنی لڑکی چیتنا کے لیے میٹری مونیل کالم میں ایڈ دیا تھا۔ جن لوگوں نے ایڈ کے رسپونس میں اس سے خط وکتابت کی اُن میں سے ایک پارٹی چنڈی گڑھ کی بھی تھی۔ پربھو دیال مہاجن نے مجھے لکھا تھا کہ میں اس پارٹی کے بارے میں اسے کچھ مزید تفصیلات لکھوں۔ جو کچھ میں معلوم کرسکا میں نے اسے لکھ دیا۔ اسی کے نتیجے میں پربھو دیال مہاجن اور اس کی بیوی رانو چنڈی گڑھ آئے تھے۔

مہاجن چاہتا تھا کہ وہ لوگ پہلے میرے گھر آئیں اور اس کے بعد میرے ہی ساتھ اس پارٹی سے ملیں۔ رانو نے یہ تجویز رد کردی تھی اور یہ رائے دی تھی کہ لڑکے کے ماں باپ کو اچانک ملنے سے صحیح حالات معلوم ہوسکیں گے۔ پربھو دیال مہاجن نے اب اپنی بیوی سے تکرار کرنا چھوڑ دیا تھا اور وہ وہی کرتا تھا جو رانو کہتی تھی۔

چنانچہ دونوں بجائے میرے پاس آنے کے ہوٹل میں چلے گئے اور وہاں سے شام کو اڑتیس سیکٹر میں پہونچے۔ اتوار کا دن تھا اس لیے وہ لوگ گھر ہی پر تھے۔ جو تفصیلات میں نے پربھو دیال مہاجن کو لکھی تھیں وہ اس طرح تھیں۔

لڑکے کا باپ ادھم پور سے تھا۔ جو جموں سے بہت دور نہیں ہے اور جہاں آج کل ایک بہت بڑی فوجی چھاؤنی بن گئی ہے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں اس نے ادھم پور چھوڑ دیا تھا۔ اُن ہی دنوں اس نے مہاجن فیملی کی ایک پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرلی، جو ایک پرائیویٹ گرلز اسکول میں پڑھاتی تھی۔ یہاں لڑکے کے باپ نے انڈسٹریل ایریا میں کولر تیار کرنے کی ایک فیکٹری کھول لی تھی اور اب انھوں نے ایچ ایم ٹی میں ٹریکٹروں کے پُرزے بنانے کا کام شروع

کردیا تھا۔ لڑکے کی ماں اب بھی ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتی تھی، حالانکہ اس کا بیٹا اس ملازمت کے خلاف تھا۔

شام کو جب پربھودیال مہاجن اور اس کی بیوی رانو لڑکے والوں کے گھر بغیر اطلاع کے پہونچے تو اُن لوگوں نے اُن کے اس عمل کو پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھا۔ لڑکے نے تو اس بات کا بہت ہی بُرا مانا۔

چائے کے دوران جب گفتگو شروع ہوئی تو اس میں زیادہ رول لڑکے ہی کا تھا۔ اس کے ماں باپ نے فیصلہ اسی پر چھوڑ دیا تھا۔ لڑکے نے کہا کہ اگلے دن چنڈی گڑھ میں رہائشی پلاٹ نیلام ہونے والے تھے۔ اگر پربھودیال مہاجن اسے ایک پلاٹ خرید کر دے سکتا ہے تو وہ اُن کی لڑکی سے شادی کے لیے تیار ہے۔

"مگر میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

پربھودیال مہاجن نے جواب دیا تھا۔

"آپ کو یہاں آنے سے پہلے ہمیں اطلاع دینی چاہیئے تھی۔"

"تو آپ لوگوں کی یہی شرط ہے مہاجن صاحب؟" رانو مہاجن نے لڑکے کے باپ سے پوچھا۔

"ہم نے سب کچھ لڑکے پر چھوڑ رکھا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ بھی چاہتے ہیں کہ کل آپ کے بیٹے کے لیے ایک پلاٹ خریدا جائے۔" رانو مہاجن نے کہا۔

"یہی سمجھ لیجئے۔"

"تو ہمیں منظور ہے۔"

"لیکن مجھے منظور نہیں۔ میری اتنی حیثیت نہیں ہے۔" پربھودیال مہاجن نے ٹوک دیا۔

"آپ کو یہاں آنے سے پہلے آپس میں فیصلہ کر لینا چاہیئے تھا۔" اس کا جواب لڑکے نے دیا۔

بس بات یہیں ختم ہوگئی۔ پربھودیال مہاجن اور اس کی بیوی مایوس ہو کر ہوٹل واپس آ گئے۔

رات کو پربھودیال مہاجن میرے گھر آیا۔ وہ اکیلا ہی آیا تھا۔ وہ بہت اُداس اور مایوس

لگ رہا تھا۔ مجھے بھی ساری تفصیل سُن کر افسوس ہوا۔ دراصل انہیں لڑکے والوں کے گھر بغیر اطلاع کے نہیں جانا چاہئے تھا۔

"میری بیوی تو کسی کی سُنتی ہی نہیں۔"

"کچھ بھی ہو، پلاٹ خرید کر دینے کی حامی تو انہیں بھرنی ہی نہیں چاہئے تھی۔"

"کیا کہوں وکیل صاحب۔ اب تو مجھ میں زیادہ بھاگنے کی سکت بھی نہیں رہی۔"

"آئی ایم سوری۔"

پربھو دیال مہاجن نے ڈرنک لینے سے بھی انکار کر دیا۔ میں نے اسے کار سے ہوٹل چھوڑ آنے پر اِصرار کیا لیکن وہ نہیں مانا۔ وہ کب اور کیسے اور کس حالت میں ہوٹل پہونچا مجھے معلوم نہیں۔

اگلی صبح آٹھ بجے کے قریب، پربھو دیال مہاجن کی بیوی رانو مہاجن کا فون آیا۔ اُس کے خاوند کو نیند میں ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا اور اچانک اُس کی موت ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے فوراً ہوٹل پہونچنے کو کہا۔ یہ خبر سُن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جب میں کار میں ہوٹل کی طرف جا رہا تھا تو میرے ذہن میں بار بار یہ بات آ رہی تھی کہ اپنی بیوی کے لگاتار تعاقب کی وجہ سے پربھو دیال مہاجن کامیابی کی دوڑ میں اس شدّت سے بھاگتا رہا کہ اب تھک ہار کر چُور ہو گیا تھا۔

موت شاید اس کی کامیابی کی آخری منزل تھی۔

پہلا دِن

ہم دس دِن کے اسٹڈی ٹُور پر راجستھان جا رہے تھے۔

ٹورسٹ بس، ہاسٹل کے پورچ میں کھڑی تھی اور ملازم سب کا سامان رکھ رہے تھے۔ انھوں نے کمروں سے سامان اکٹھا کر کے ایک جگہ رکھ لیا تھا اور اُٹھا اُٹھا کر بس کی چھت پر جما رہے تھے۔ میرے سوا سبھی اپنی اپنی چیزوں کی حفاظت کے لیے سامان کے ڈھیر کے پاس کھڑے تھے۔ بس کے اندر ہندی اور انگریزی میں لکھے ہوئے ان الفاظ کو شاید سب نے پڑھ لیا تھا کہ مسافر اپنے سامان کے خود ذمہ دار ہوں گے سب اپنی اپنی ذمہ داریاں خود سنبھال رہے تھے اور ایک میں تھا کہ اپنی ذمہ داریوں کا خیال کیے بغیر گیٹ کے پاس کھڑا سگریٹ پی رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ آج سے دو مہینے پہلے کی بات، جب میں ٹریننگ میں شامل ہونے کے لیے پورے بیس دن لیٹ پہنچا تھا اور ریلوے اسٹیشن سے پکڑی ہوئی ٹیکسی گیٹ کے اندر داخل ہوئی تھی۔ اُسی لمحہ ایک خاتُون ہاسٹل کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ میں نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی اور ٹیکسی پورچ میں آکر رُک گئی۔ میں نے ٹیکسی کا کرایہ دیتے ہوئے غیر اِرادی طور پر گیٹ کی طرف دیکھا۔ وہ خاتُون بجائے گیٹ سے باہر جانے کے اندر پلٹ آئی اور میرے قریب پہنچ کر بغیر کسی رسمی تکلّف کے بولی۔

"تو آخر آپ آ ہی گئے!"

"جی۔ مُجھے"

میں اپنا تعارف کرانے لگا تو اس نے بات کاٹ دی۔

"میں آپ کو جانتی ہوں۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوا ہے کہ آپ اپنی تصویر سے کہیں زیادہ اچھے لگتے ہیں تصویر اُتروانا کہانیاں لکھنے سے زیادہ مشکل فن ہے۔ اس حقیقت کو بہت کم لوگ جانتے ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ مُسکرادی اور میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

ڈرائیور نے سامان اُتار کر پورچ میں ایک طرف رکھ دیا اور سلام کر کے ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ لمحہ بھر میں ٹیکسی ہاسٹل کے گیٹ سے باہر نکل گئی۔

"آپ کا شُبھ نام؟" میں نے پوچھا۔

"بندی کو زینت کہتے ہیں"۔ مجھے اپنے عام سے سوال کے اتنے خوبصورت جواب کی توقع نہ تھی۔

"کہاں سے تشریف لائی ہیں آپ؟"

"آندھر پردیش سے۔

حیدرآباد میں کام کرتی ہوں"۔

"آپ تو جا رہی تھیں کہیں؟"

"لیکچر اٹینڈ کرنے جا رہی تھی۔ آپ کو دیکھ کر رُک گئی۔ سبھی چلے گئے ہیں۔ اس وقت ہاسٹل میں کوئی نہیں"۔

"میرے سامان کا کیا ہوگا؟"

"ملازم لے آئیں گے آپ آئیے"۔

اس نے مین اینٹرینس کا دروازہ کھولا اور میں اندر داخل ہوگیا۔ میرا بریف کیس اُس نے اٹھالیا تھا۔

"آپ نے کیوں تکلیف کی؟"

"اس لیے کہ آپ اس سے بیچ رہے تھے"۔

وہ میرے ساتھ اس کمرے میں آگئی جو میرے لیے ریزرو تھا اور پچھلے بیس دنوں سے

میرا انتظار کر رہا تھا، اور پھر وہ باہر چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد ہاسٹل کے دو ملازم میرا سامان اُٹھا لائے۔

"چائے پیجئے گا؟" اس نے پوچھا۔

"مل جائے تو ضرور پیوں گا۔"

"جاؤ چائے لے آؤ۔" اس نے ایک ملازم سے کہا۔

ہم کُرسیوں میں بیٹھ گئے۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سُلگایا۔

"کتنا انتظار دکھایا آپ نے۔ میں تو اب آپ کی جان کو۔"

اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"رو چکی تھی!" میں نے جُملہ پورا کیا۔

"اور کیا۔ یہاں تو ڈھنگ کا ایک بھی آدمی نہیں۔ یہ بیس روز بیس سال معلوم ہوئے ہیں مجھے۔"

اور پھر زینت ٹریننگ کورس کے بارے میں، روزمرہ کے پروگرام کے متعلق اور کچھ متفرق معاملوں کے سمبندھ میں باتیں کرتی رہی۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ میری خاطر اپنے لیکچر مِس کر رہی ہے۔

"اب آپ لیکچر اٹینڈ کیجئے، میں چائے پی لوں گا۔"

"تو آپ نہیں چاہتے کہ میں بھی آپ کے ساتھ چائے پی لوں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

لمحہ بھر کو رک کر اس نے کہا۔

"آج کئی روز کے بعد تو چائے پینے لگی تھی۔"

"کیوں؟ ــــ ہر روز چائے نہیں پیتیں آپ؟"

"پیتی ہوں لیکن اکیلی۔ جب تک کوئی ساتھ نہ ہو مجھے چائے کا لطف نہیں آتا۔"

"ڈھیر سارے لوگ ہیں یہاں تو!"

"اِن عورتوں اور مردوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو اکیلے پن کا احساس مٹا سکتا ہو۔

سبھی اکیلے ہیں۔ ایک دم سنسان اور ویران کھنڈروں کی طرح بے جان اور بے حس۔ اِن سے بات کرو تو محسوس ہوتا ہے جیسے کسی گنبد میں بول رہے ہوں۔ صرف اپنی ہی آواز سنائی دیتی ہے۔ پہلے سے زیادہ اونچی اور پھٹی ہوئی۔ اپنی اچھی بھلی بات کا مزہ جاتا رہتا ہے۔"

ملازم چائے لے آیا۔ جوان سا لڑکا ہے۔ نام ہے غریب چند کانگڑہ کا رہنے والا ہے۔ گورا چٹا رنگ اور معصوم چہرہ۔ یوں ہی مسکرائے جاتا ہے۔ پہاڑوں میں رہنے والے مفلوک الحال لوگوں کی طرح جو ہنستے ہیں تو ان کی آنکھوں سے پانی رسنے لگتا ہے جن کے گورے چہرے خزاں رسیدہ درختوں کی طرح ہیں، جو کسی آنے والی بہار کے انتظار میں سرنگوں ہیں۔ جانے وہ بہار کب آئے گی۔ جانے پھول کب کھلیں گے۔ کلیاں کب مہکیں گی اور ان ننگے درختوں کی ٹہنیاں سرسبز پتّوں سے کب بھر جائیں گی اور کب ان کی چھاؤں میں بیٹھ کر چرواہے بانسری بجائیں گے اور چرواہنیں گائیں گی:۔

میرے محبوب بہار آگئی ہے اب تم بھی آجاؤ۔
میں اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کے دیئے جلائے کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں!
آجاؤ میرے محبوب۔
کہیں یہ بہار بھی روٹھ کر نہ چلی جائے۔

میں نے یہ سب کچھ سوچتے ہوئے غریب چند کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی بیمار مسکراہٹ سے اپنے چہرے کو جگمگانے کی کوشش کر رہا تھا' جیسے شروع تاریخوں کا چاند اپنی ہلکی لرزتی ہوئی روشنی سے ڈھلتی ہوئی رات کے گیسوؤں کو روشن کر رہا ہو۔ غریب چند چلا گیا۔ اور اُس کے ساتھ اُس کی بیمار مسکراہٹ بھی چلی گئی۔

میرے سامنے گرم گرم چائے کی پیالی رکھی تھی۔

"چائے لیجئے"، زینت نے پیالی بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ"

"چائے پسند آئی؟"

"شکر ذرا زیادہ ہے۔"

"میں نے تو ایک ہی چمچ ڈالا ہے۔"

"تو پھر گھمایا زیادہ ہوگا۔"

زینت مسکرادی۔ میں بھی مسکرادیا۔

ہم چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ایسے جیسے دنیا بھر کی باتیں آج ہی ختم کر ڈالنی ہوں۔ جیسے اس کے بعد ہم دونوں ملیں گے ہی نہیں، جیسے آج کا دن ہماری ملاقات کا پہلا دن نہیں بلکہ آخری دن تھا۔ آغاز اور انجام دونوں ہی عجیب ہوتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں من بے چین ہوتا ہے۔ ایک دھڑکا سا چمٹا رہتا ہے، رُوح کے کسی نامعلوم گوشے کے ساتھ۔ لیکن اس کی بھی اپنی اہمیت ہے۔ ہر چیز کی اپنی اپنی جگہ ہوتی ہے زندگی میں۔

"آیئے آپ کو لیکچر ہال اور لائبریری کی طرف لے چلوں۔" چائے پی چکنے کے بعد زینت نے کہا۔

"کچھ دیر آرام کر لوں تو کیا حرج ہے؟"

"لنچ کے بعد آرام کر لیجیے گا۔"

زینت کرسی سے اُٹھی اور مجھے بھی اُٹھنا پڑا۔

ٹریننگ سنٹر ہاسٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم کچھ دیر میں وہاں پہنچ گئے۔ لیکچر ابھی ابھی ختم ہوا تھا۔ اور سبھی لوگ لان میں گھوم رہے تھے۔ ہم دونوں کو دیکھتے ہی سب کی آنکھیں ہم پر جم گئیں۔ جب تک ہم دونوں ان کے نزدیک نہ پہنچ گئے وہ سب ہمیں ایک عجیب انداز سے دیکھتے رہے۔ جس میں حیرت، حسد، اشتیاق اور بے نیازی سب کچھ شامل تھا۔ قریب پہنچ کر زینت سب سے میرا تعارف کرانے لگی۔ تعارف کراتے ہوئے وہ فخر اور مسرت محسوس کر رہی تھی۔ یہ سب لوگ ہندوستان کے مختلف حصّوں سے آئے ہوئے تھے۔ سب پر اپنے اپنے مخصوص ماحول اور کلچر کی چھاپ تھی، سب کی اپنی زبان تھی، اپنا ادب تھا، اپنی قدریں تھیں۔ لیکن سب کچھ مختلف ہوتے

ہوئے بھی ان سب میں ایک چیز سانجھی تھی کہ وہ سب انسان تھے۔ سب میں اپنی اپنی کمزوریاں اور خوبیاں تھیں، سب کے روشن اور تاریک پہلو تھے۔

یہ رام مورتی ہیں۔ میسور کے رہنے والے۔ قد چار فٹ کچھ انچ۔ دُور سے کسی مڈل اسکول کے طالب علم نظر آتے ہیں۔ آواز بھی قد کی طرح کم اونچی ہے۔ یہ پلّے ہیں۔ کیرل سے آئے ہیں۔ شکل وصورت سے کمیونسٹ نظر آتے ہیں۔ لیکن ہیں پکے نیشنلِسٹ۔ میں نے کمیونسٹ حکومت کی بات کی تو انھوں نے اس کی ایک سو ایک برائیاں گِنوانی شروع کر دیں۔

یہ ہیں چٹوپادھیائے۔ مغربی بنگال کے رہنے والے۔ عمر پچپن کے قریب ہے۔ اگلے برس ریٹائر ہونے والے ہیں۔ ان لوگوں کی داد دیجیے جنھوں نے انھیں اس عمر میں بھی ٹریننگ کے لیے بھجوایا ہے۔ سب انھیں دادا کہتے ہیں۔

یہ کھانڈیکر ہیں۔ مہاراشٹر سے پدھارے ہیں۔ چھالیا اور کُترنی ہر وقت جیب میں رکھتے ہیں۔ اب بھی چھالیا کُتر رہے ہیں اور بے مطلب مسکرائے جا رہے ہیں۔ مسکراہٹ میں بھی کچھ نہیں۔ خالی مسکراہٹ ہے۔ بغیر کسی جذبے کے۔ ایکدم بے جان اور مری ہوئی

یہ پٹنایک صاحب ہیں۔ اُڑیسہ کے قبائلی علاقے کی نمائندگی کرتے ہیں — آدی واسیوں کی کُندھو چکی کرختگی اب بھی اُن کی شخصیت میں ہے۔ انگریزی بولتے ہیں تو کسی اور ہی زبان کا گُمان ہوتا ہے۔

یہ شری ورما ہیں۔ راجستھان سے آئے ہیں۔ بالکل گئو کے سمان۔ بہت ہی شریف اور سیدھے۔ لگتا ہے کوئی بھی انھیں اہمیت نہیں دیتا۔

اور یہ ہیں مسٹر گوڑ۔ گورے چِٹے نوجوان۔ بہار سے سمبندھ ہے اِن کا۔ پان کھا کھا کر دانتوں کا ستیاناس کر رکھا ہے۔ دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ اس ماحول ہی سے نہیں بلکہ زندگی سے بھی غیر مطمئن ہیں۔ کچھ سناب سے لگتے ہیں۔ لیکن فوراً کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے؟

اُدھر کونے میں دو مہلائیں کھڑی ہیں۔ وہ اِس طرف نہیں آئیں۔

بلکہ ہمیں دیکھ کر اور بھی سمٹ گئی ہیں ، جیسے بہت ہی بے نیاز ہوں لیکن اخلاق کا تقاضا ہے کہ زینت مجھے اُن کے پاس لے جائے۔ سو وہ مجھے لے جا رہی ہے۔

آپ ہیں مس باپٹ، سوراشٹر سے آئی ہیں۔ بال بہت ہی لمبے ہیں مس صاحبہ کے۔ لیکن دانت ناہموار ہیں۔ اگر مسکرائیں نہیں تو مجموعی طور پر امپریشن بڑا اچھا رہتا ہے۔

یہ ہیں مسز جیٹرجی۔ عمر اور رنگ دونوں پکے ہیں۔ پان اور زردے کی بہت شوقین نظر آتی ہیں۔ اس وقت بھی پکّے رنگ کے ہونٹوں پر پان کی لالی مہک رہی ہے۔

" ویری گلیڈ ٹو ہیو میٹ یُو" سبھی نے کہا ہے۔

یہ سب لوگ تعلیمی اُمور کے ماہر ہیں اور اپنی اپنی ریاست سے کچھ ماہ کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ پھر الگ ہو جائیں گے۔ کون جانتا ہے، زندگی میں دوبارہ ملاقات ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس سمے انھوں نے مجھ سے مل کر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ یہ ان کی مہربانی ہے۔ ورنہ اس دَور میں کون کسی سے مل کر حقیقی طور پر خوش ہوتا ہے اور یہ بھی وثوق سے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ انھیں مجھ سے مل کر واقعی مسرت ہوئی ہے یا انھوں نے صرف اخلاقی تقاضہ ہی پورا کیا ہے۔

لیکن میں ان کی نیّت پر کیوں شُبہ کروں۔ سبھی اچھے ہیں اور اس وقت خوبصورت لان میں کھڑے رنگ برنگے پھولوں سے گھرے فروری کی نرم دھوپ میں اور بھی اچھے لگ رہے ہیں۔ انسان کو اچھا یا بُرا اس کا ماحول بناتا ہے۔ اس میں بذاتِ خود اچھا یا بُرا ہونے کی صلاحیت نہیں۔ اچھا بھلا آدمی گھٹیا ماحول میں اپنی اچھائی کھو بیٹھتا ہے اور نکھرے ہوئے خوبصورت ماحول میں ایک بُرا آدمی بھی اچھا بن جاتا ہے۔ انسان کو پرکھنے کے لیے کوئی بھی قابلِ اعتبار کسوٹی نہیں۔ انسان کو پرکھنا ہی بے کار ہے۔ جو جیسا ہے اُسے ویسا ہی رہنے دو۔ اُس کے بنیادی روشن یا کمزور پہلو خود ہی سامنے آجائیں گے۔

میں کیوں کسی کے بارے میں سوچوں؟

زینت ساتھی لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہوگئی ہے اور میں مردوں کے گروپ کی

طرف لوٹ آیا ہوں۔

"آپ تو دہلی سے بہت نزدیک ہیں؟" رام مورتی نے پوچھا۔

"جی ہاں"۔

"آپ تو ہر ہفتے اپنے گھر جا سکتے ہیں؟" یہ کھانڈیکر کی آواز ہے۔

"ہم تو اپنے گھروں سے سینکڑوں میل دور ہیں" مسٹر پٹنایک کہہ رہے ہیں۔

"اور یہاں کا ہوا اچھا نا ہیں ہے" دادا کہہ رہے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستان کی راجدھانی میں، ایک نہایت ہی اچھی لوکیلیٹی میں رہ کر بھی یہ لوگ خوش نہیں ہیں۔ سب کو گھروں کی یاد ستاتی ہے۔ سب کے بچّے ہیں، بیویاں ہیں۔ رشتہ دار ہیں اور اب وہ ان سے دُور ہیں تو ان کے من میں چُبھن سی ہوتی رہتی ہے اور اِدھر میں ہوں کہ خانہ بدوشوں کی طرح جگہ جگہ ڈیرے ڈالتا پھرتا ہوں۔ جہاں چھاؤں ذرا گھنی دیکھتی، سُستا لیا۔ تھک گیا تو کسی سنگ میل کا سہارا لیکر بیٹھ گیا، پھر چلنے لگا۔ لگتا ہے جیسے موہ تیاگ رہا ہوں۔ لیکن اپنی شخصیت کا موہ بڑا گہرا ہے۔ شخصیت کے وقار کو ٹھیس نہ لگے۔ لگاؤ تو ایک ہی قسم کا ہو سکتا ہے۔ لگن بٹ تو نہیں سکتی۔ وہ لگن اپنے آپ کی ہو یا دوسروں کی۔ اُسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ تقسیم کرنے سے وہ ٹوٹ جاتی ہے اور اس کی شکتی نشٹ ہو جاتی ہے۔ مجھے صرف اپنے آپ کی لگن ہے اور ان سب کو اپنے گھروں اور اپنے ماحول کی۔ دونوں میں کون درُست ہے۔ اس کا فیصلہ کون کرے؟

زینت مس باپٹ اور مسز چیٹرجی کے ساتھ کھڑی ہنس رہی ہے۔ دونوں نے لان میں اُگے ہوئے پھول توڑ کر جُوڑے میں لگا لیے ہیں۔ مس باپٹ نے جب زینت کے جُوڑے میں پھول ٹانکنا چاہا تو اُس نے ہاتھ بڑھا کر لے لیا۔ جوڑے میں نہیں لگایا۔ زینت نے جُوڑے میں پھول کیوں نہیں لگایا؟

کھانڈیکر چھالیا کُترے جا رہا ہے اور گوڑ کہہ رہا ہے کہ اُس کے سگریٹ ختم ہو گئے ہیں۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر آفر کیا ہے۔ لیکن اُس نے انکار کر دیا ہے۔

"میں سگریٹوں میں صرف سٹیٹ ایکسپریس پیتا ہوں اور وہسکی میں اسکاچ"۔
میں نے سگریٹ کا پیکٹ جیب میں ڈال لیا ہے اور اپنے لیے ایک سگریٹ سلگا لیا ہے۔ گوڈ یقیناً سناب ہے۔ میرا اندازہ غلط نہیں۔ وہسکی کا موضوع کہاں تھا، لیکن اُسے تو اپنی بات کہنی تھی۔

مس شرن آ رہی ہیں، لیکچر ہال کی طرف۔ سب اپنی اپنی جگہ سے ہلنے لگے ہیں اور ہال کی طرف جانے لگے ہیں۔ میں اپنی جگہ پر ہی کھڑا ہوں۔

"آپ آئے ہیں پنجاب سے ؟" اُس نے پوچھا ہے۔

"جی"

"اتنا لیٹ کیوں جوائن کیا ہے آپ نے ؟"

"کچھ ایڈمنسٹریٹیو اڑچنیں تھیں"

مِس شرن ہال کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ میں بھی ساتھ ساتھ چل رہا ہوں۔

"حیدر آباد کی مِس زینت بڑی ایڈمائرر ہیں آپ کی"

"اِٹ از گُڈ آف ہر" میں نے جواب دیا ہے۔

اُدھر سے زینت آ رہی ہے۔

"گُڈ مارننگ مِس شرن !"

"گُڈ مارننگ۔ آپ کے رائیٹر فرینڈ آ گئے ؟"

"ناٹ ایگزیکٹلی اے فرینڈ۔ ہیرو ورشپ کا سینٹی مینٹ ہے مِس شرن"

مِس شرن مُسکرا رہی ہے۔ وہ کرسچین ہے۔ اُسے انگریزی میں بات کرنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ زینت کو پسند کرتی ہے۔

"شی اِز اے گُڈ گرل"

"آل گرلز آر گُڈ مِس شرن" میری بات سُن کر مِس شرن زور سے ہنس دی۔
سب لوگ لیکچر ہال میں بیٹھ گئے تھے۔ یہ شاید اتفاق کی بات تھی کہ دیوار کے ساتھ والی قطار میں دو کرسیاں ساتھ ساتھ خالی تھیں۔ میں اور زینت ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔

مس شرن نے لیکچر ٹیبل پر اپنی کتابیں رکھتے ہوئے کہا۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ وی ہیو امنگ اَس اے ری ناؤنڈ رائیٹر لیٹ اَس ویل کم ہم"۔

میں مس شرن کی بات کا ردِ عمل دیکھ رہا تھا۔

زینت نے تالی بجائی۔ کچھ تالیاں اور بھی بجیں۔ لیکن کچھ لوگ بے حس و حرکت بھی بیٹھے رہے۔ میں نے گوڑ کی طرف دیکھا۔ وہ پریشان لگ رہا تھا۔ کھانڈیکر اور رام مُوتی بھی شاید مس شرن کے برتاؤ سے خوش نہیں تھے۔

"آئی ایم ایکسٹریملی تھینک فُل ٹُو یُو فرینڈز"۔ میں نے کھڑے ہو کر کہا اور مس شرن نے مسکرا کر سب کی طرف دیکھا اور پھر میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہوئی۔ کچھ لوگ مجھے غلط بھی سمجھنے لگیں گے۔

لیکن لمحوں کے بہاؤ کو کوئی کیسے روک سکتا ہے۔ لمحے تو زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہیں۔ اِن سے کون ٹکر لے سکتا ہے۔ لمحات کے ٹکراؤ سے سنگیت کی لَے بھی پھُوٹ سکتی ہے اور طوفان کی گرج بھی اُبھر سکتی ہے۔ سنگیت کی لَے اور طوفان کی گرج دونوں حقیقتیں ہیں۔ کسی کو ایک حقیقت پسند ہے، کسی کو دُوسری۔

لنچ کے بعد میں نے زینت سے کوئی بات نہیں کی۔ اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔ سوتے میں مجھے لگا جیسے کسی نے میرے کمرے کا دروازہ دِھیرے سے کھولا تھا۔ کون تھا؟ زینت کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ لیکچر اٹینڈ کرنے جا رہی ہو گی۔ مجھے ساتھ لے جانے آئی تھی سوتا دیکھ کر چلی گئی۔ دستور کے مطابق مجھے اس وقت آرام نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے زبردستی ہی یہ چھُوٹ لے لی تھی۔ دستوُر کے مطابق کام کرتے کرتے آدمی تھک بھی تو جاتا ہے۔ لیکن یہ قاعدے قانون ہیں کہ کمبخت کبھی نہیں تھکتے۔ اپنی برتری منوائے ہی جاتے ہیں۔

شام کو جاگا تو ویسے ہی بستر پر پڑے پڑے اخبار دیکھنے لگا جو صبح خریدا تھا۔ فرسٹ پیج پر خان بادشاہ کی تصویر تھی۔ جلسے کو خطاب کر رہے تھے۔ میں نے اس فقیر کو پچیس برس پہلے دیکھا تھا۔ کتنا جلال تھا اُس کے چہرے پر اور اب وہ کتنا بدل گیا

تھا۔ لیکن اُس کے اصول وہی تھے۔ پیغام وہی تھا، اہنسا، اتحاد اور بھائی چارے کا سبق۔

دروازہ کھُلا ہے۔ زینت ہوگی۔

نہیں غریب چند ہے۔

"مس صاحب نے ڈایئنِنگ ہال میں بُلایا ہے۔"

"کیوں؟"

"چائے کے لیے۔"

"کہہ دو مجھے چائے نہیں پینا ہے۔"

"اچھا صاحب!" غریب چند اپنی بیمار مسکراہٹ کو مزید بیمار بناتے ہوئے چلا گیا۔

کچھ لمحے گزر گئے۔

دروازہ پھر کھُلا۔

زینت آئی ہے۔

"مجھے آج بھی چائے اکیلے ہی پینا ہوگی کیا؟"

"کیسے؟"

"آپ نہیں آیئے گا؟"

"چلو کناٹ پلیس میں کہیں چائے پیئں گے۔"

"چلیئے۔"

کچھ دیر کے بعد ہم دونوں کناٹ پلیس کی طرف چل دیئے اور زینت کی چائے میز پر پڑی ٹھنڈی ہوتی رہی، جسے بعد میں کسی ملازم نے اٹھا کر واش بیسن میں اُنڈیل دیا ہوگا۔

بس میں بیٹھے ہوئے زینت نے پوچھا۔

"میرے بُلانے پر آپ نے اس تلخی سے جواب کیوں دیا تھا؟"

یہ زینت کتنی صاف دل ہے۔ نہیں چاہتی کہ کہیں بھی غلط فہمی کی کوئی پرچھائیں رہ جائے۔ بڑی سینسی ٹو ہے۔

"میں نئے ماحول سے جلدی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ اکثر تلخ ہو جاتا ہوں۔"

" لیکن مجھ سے تلخ نہ ہوا کریں۔" اُس نے میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے بڑے پُر اثر انداز میں میری طرف دیکھا۔ جیسے اُس کی آواز میں اُس کی رُوح کی آواز شامل ہیں۔

" مجھے افسوس ہے۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔"

میرا جواب سُن کر وہ پھول کی طرح کھل گئی۔ ہلکے سے سبز رنگ کی ساڑھی میں لپٹی وہ موسم سرما میں کھلنے والے پھولوں کی ایک کلی لگ رہی تھی۔

ایمبیسی ریستوران میں گئے مجھے ایک زمانہ ہوگیا تھا۔ اُن دنوں میرا ٹھکانہ یہی ریستوران ہُوا کرتا تھا، جب یونیورسٹی کے کچھ لوگ میرے ساتھ ہُوا کرتے تھے، کچھ حسین لوگ۔ جب سے وہ بچھڑے ہیں، میں نے ایمبیسی میں جانا چھوڑ دیا ہے۔ آج ایک زمانے کے بعد زینت کے ساتھ اندر داخل ہونے کے لیے جب دروازے کو دھکیلا تو میرے ہاتھ کانپ گئے۔ میزیں بھری تھیں۔ ویسے ہی جیسے آج سے چار برس پہلے بھری ہوتی تھیں۔ لوگ بدل گئے ہیں، لیکن جگہ وہی ہے۔ جگہیں نہیں بدلتیں۔ آنے والے بدل جاتے ہیں۔ منزلیں نہیں بدلتیں، راہرو بدل جاتے ہیں۔ میں ہال سے گزر کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اُوپر چلا گیا۔ زینت میرے ساتھ تھی۔ کونے والی جگہ جہاں میں بیٹھا کرتا تھا، خالی تھی۔ ہم دونوں وہیں بیٹھ گئے۔ ایک پرانا بیرا پیچھے سے آکر بولا۔

" بہت دنوں میں آئے صاحب؟"

" میں باہر چلا گیا تھا۔" میں نے جھوٹ بولا۔ لیکن اُس نے سچ مان لیا۔

" پُرانے بیرا لوگ سب چلے گئے ہیں۔ ایک میں رہ گیا ہوں۔"

" کہاں چلے گئے سب؟" میں نے پوچھا۔

" دوسرے ہوٹلوں میں بیرا گری کرنے۔"

" ہمارے لیے چائے لاؤ اور کچھ کھانے کو بھی۔"

" اچھا صاحب۔" بیرا چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد میں ایکدم خاموش ہوگیا۔ اسی جگہ پر ہم سب اکٹھا بیٹھا کرتے تھے، آج سے چار برس پہلے۔ زندگی کتنی آگے نکل گئی ہے اور لوگ کہاں سے کہاں

پہنچ گئے ہیں۔ ایک میں ہوں کہ ماضی کے تصوّر کو چھوڑ ہی نہیں پاتا۔ یہ لباس جو کبھی بڑا نازک اور خوبصورت ہُوا کرتا تھا' اب بالکل پھٹ چکا ہے۔ تار تار الگ ہو رہا ہے لیکن میں اِسے اب بھی اُتار کر نہیں پھینک رہا۔ کتنا ماضی پرست ہوں۔ چیتھڑوں کو کب تک سینے سے لگائے رکھوں گا۔ اسے پھینک دینا چاہیے۔ اب اس میں کچھ بھی تو نہیں رہا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" زینت نے بڑی مدھر آواز میں پوچھا۔

کیا جواب دوں اُسے۔ یہ کیا لگتی ہے میری۔ چند گھنٹوں کی تو جان پہچان ہے۔ اِسے پریشان کرنے کا کیا حق ہے مجھے؟

"کچھ بھی تو نہیں سوچ رہا۔ سوچنا بیکار ہے۔"

"کنگھی ہے آپ کے پاس؟ بال ٹھیک کر لیجئے گا۔ ہوا سے سب بکھر گئے ہیں۔"

میں نے جیب سے کنگھی نکال کر بال ٹھیک کر لیے۔

"شُکریہ!"

"بس اِسی طرح اپنا ذہن بھی ٹھیک کر لیجئے۔ ذہن میں شکنیں ہوں تو سوچنے کا انداز بگڑ جاتا ہے۔"

زینت کی بات سُن کر میں نے بڑی شُکر گُزار نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ کتنی سمجھ دار لڑکی ہے۔ اُس نے نظریں جُھکا لیں جیسے محسوس کر رہی ہو کہ اُس نے ضرورت سے زیادہ بڑی بات کہہ دی تھی۔ بات واقعی بڑی تھی اور کہنے کا ڈھنگ بڑا خوبصورت تھا۔

بیرا چائے لے کر آ گیا اور پَل بھر میں سارا سامان میز پر سجا کر چلا بھی گیا۔

میں نے سگریٹ سُلگایا اور زینت چائے بنانے لگی۔

کیا زینت نے میری ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا لیا تھا؟ شاید لگا ہی لیا ہو۔ شاید غلط ہو اُس کا اندازہ۔

اِس کے بعد ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بولا۔ خاموشی سے چائے پیتے رہے کچھ دیر کے بعد زینت بولی۔

"جب آپ مجھ سے بور ہونے لگیں تو مجھے کہہ دیا کریں۔"

میں اُس کی بات سے چونک اُٹھا۔ کتنا غلط آدمی ہوں۔ کئی دفعہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی دھیان نہیں رکھتا۔

"اکیلے رہنے کی عادت اس قدر پکّی ہو گئی ہے کہ دوسروں کے ساتھ بیٹھے ہوئے بھی خود کو اکیلا محسوس کرنے لگتا ہوں اور اپنے آپ میں کھو جاتا ہوں۔"

"لیکن دوسروں کے لیے یہ انصافی بھی ہو سکتی ہے اور بُرا ماننے کی وجہ بھی۔"

"ناانصافی تو خیر کیا ہو گی لیکن بُرا ماننے کی بات غلط نہیں۔"

"مجھ سے آپ تکلّف برت کر خود پریشان ہوں، یہ میں نہیں چاہتی۔ مجھے آپ صاف صاف کہہ دیا کریں۔"

"نوّے فی صدی عورتیں بور ہوتی ہیں لیکن آپ اُن میں سے نہیں ہیں۔ اچھی بھلی شام ان نکمّی باتوں کو سوچنے میں خراب نہ کرو۔ آؤ چلیں۔"

میں نے بل ادا کیا۔ بیرے کو ٹِپ دیا اور ایمبیسی سے باہر چلے آئے۔

"کہاں چلیے گا؟" میں نے پوچھا۔

"میں دہلی سے زیادہ واقف نہیں۔ جہاں جی چاہے چلیے۔"

"پکچر چلیں؟"

"نہیں۔ آپ مجھے کچھ کتابیں خرید دیں۔ یہاں صرف ایک ہی موضوع پر کتابیں پڑھتے پڑھتے تو دماغ خالی ہو جائے گا۔"

"انگریزی کی کتابیں پسند ہوں تو یہیں سے خرید لیتے ہیں۔"

"نہیں اردو کی کتابیں خریدیں گے۔"

ہم دونوں گھومتے گھامتے جامع مسجد کے علاقہ میں چلے گئے۔ اُردو کی جو کتابیں زینت نے پسند کیں وہ خرید لیں۔ کتابوں کا انتخاب اس بات کا شاہد تھا کہ زینت ایک سُلجھے ہوئے مذاق کی لڑکی تھی۔ میں اس طرف بہت دنوں بعد آیا تھا۔ کچھ پُرانے دوست بھی مل گئے۔ کچھ دیر اُن سے ملاقات رہی۔ ادب اور فن کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ زینت نے گفتگو میں برابر کا حصّہ لیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر ہم پھر کناٹ پلیس

آ گئے۔ کھانا بھی وہیں کھایا۔ جب واپس ہاسٹل پہنچے تو گیارہ بج رہے تھے۔

جب ہم ٹیکسی سے باہر نکلے اور چوکیدار نے گیٹ کھولا تو اُوپر کے کمروں کی تین کھڑکیاں کُھلیں اور پھر ایک دم ہی بند ہوگئیں۔ ظاہر تھا کہ کچھ لوگ ہماری خاطر اپنی نیند حرام کر رہے تھے۔

دوسری صبح ہمارے چائے کی میز پر پہنچنے سے پہلے سب لوگ جان گئے تھے کہ زینت گیارہ بجے تک میرے ساتھ رہی تھی۔

اور یہ ہماری ملاقات کا ابھی پہلا دن تھا !!

ایک سویا ہُوا شہر

وہ کئی برسوں کے بعد ادھر آیا تھا۔

جب وہ پچھلی بار یہاں آیا تھا تو یہ ایک چھوٹا سا خاموش ہل اسٹیشن تھا۔ ایک ہی بازار ایک ہی چھوٹا سا ہوٹل، بڑا ہی واجبی سا بس اسٹینڈ۔ لیکن اب تو اس کا رنگ رُوپ ہی بدل گیا تھا۔ پہلے یہ صرف ایک تحصیل کا ہیڈکوارٹر تھا لیکن اب ہماچل کا نیا پردیش بن جانے سے یہ تحصیل ہیڈ کوارٹر اب ایک ضلع بن گیا تھا۔ اور ضلع بن جانے سے شہر کا سوشل اسٹیٹس ہی بدل گیا تھا۔ جیسے کسی دفتر میں کام کرنے والا کوئی معمولی کلرک کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھے اور ایک دم سِول سروس میں آجائے اور کھٹ سے کہیں مجسٹریٹ لگ جائے۔ اس کا سوشل اسٹیٹس دُوسرے ہی روز بدل جاتا ہے۔ آدمیوں کی طرح جگہوں کے بھی سماجی مرتبے ہوتے ہیں۔ کوئی بہت چھوٹا، کوئی صرف چھوٹا کوئی بڑا۔ کوئی بہت بڑا۔ اور کوئی وی، آئی، پی۔ بس جب بازار سے گزری اور اُس نے دکانوں پر نگاہ ڈالی اور سڑک کو پہلے سے زیادہ کشادہ اور صاف ستھرا پایا تو اُسے لگا جیسے یہ چھوٹا سا خاموش، اونگھتا ہوا شہر کب کا وی، آئی، پی کے زُمرے میں آچکا تھا اور اسے خبر تک نہ ہوئی تھی۔

وہ ہوٹل کے سامنے کھڑا تھا اور قُلی اس کا سامان ایک طرف رکھ رہے تھے، اس نے دونوں قُلیوں کو فارغ کیا اور وہ اسے سلام کر کے چلے گئے۔ ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں اور اپنے سامنے پھیلی وادی کا بھرپور جائزہ لیا۔ دوپہر ہو چکی تھی لیکن دیودار کے درختوں سے گزر کر آئی خُنک ہوا بڑی پیاری تھی۔ دھوپ کے باوجود موسم خوبصورت اور خوشگوار تھا۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا۔ ہلکا ناشتہ کیا اور سو گیا۔

جب وہ جاگا تو شام ہو رہی تھی۔

اسے ایلن سے فوراً ملنا چاہیے۔

ایلین اس کا پرانا دوست تھا اور وہ دونوں دہلی میں اکٹھے پڑھتے رہے تھے۔ دراصل یہاں آنے کا اس کا مقصد اپنا ناول مکمل کرنا تھا، جو اس نے تین سال پہلے اسکیچ کیا تھا لیکن اسے شروع نہ کر سکا تھا۔ اُس ناول کا مرکزی کردار ایلین ہی تو تھا۔ وہ اس لیے یہاں آیا تھا کہ ایلین کے ساتھ ایک بار ڈسکشن کرنے کے بعد وہ فوراً ہی لکھنا شروع کر دے گا اور زیادہ سے زیادہ ایک مہینے میں اُسے مکمل کر ڈالے گا۔

اس نے ایلین کو اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔

وہ اُسے سرپرائز کرنا چاہتا تھا۔

اُسے معلوم تھا کہ ایلین نے یہاں آرچرڈ بنا رکھا تھا اور اب وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اِس لیے اُسے اطلاع دینے کی ضرورت بھی نہ تھی۔

وہ دن بھر لکھا کرے گا اور شام کو ایلین سے ملے گا اور جو کچھ لکھے گا، اُسے سُنائے گا، اور اس کی رائے لے گا۔ پھر شام سے لے کر آدھی رات تک وہ اس کے ساتھ رہے گا۔ ویسٹرن میوزک کے ریکارڈ سُنے گا۔ اس کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومے گا۔ رات کو دونوں وِسکی پئیں گے اور پھر ایلین اسے چھوڑنے اس کے ہوٹل آئے گا اور وہیں دونوں کھانا کھائیں گے اور پھر ایلین واپس اپنے گھر چلا جائے گا۔

جہاں تک اُسے یاد تھا۔ ایلین کی بڑی ہی شفیق اور مہربان ماں اس کے ساتھ رہتی تھی۔ ایلین اگر شادی کرتا تو اسے ضرور اطلاع دیتا۔ شادی اس نے نہیں کی ہوگی یہ اندازہ اُسے ویسے ہی تھا۔

سفر کی تکان اُتارنے اور تیار ہو چکنے کے بعد وہ شام کو ایلین سے ملنے گیا۔

یہ ایک چھوٹی سی کاٹیج تھی، جو شہر سے کوئی تین فرلانگ دُور تھی اور اس کے نیچے ایک پہاڑی نالہ تھا اور سامنے بڑی ہی سرسبز پہاڑیاں تھیں۔ ایلین کو یہ جگہ بہت ہی پسند تھی — جب وہ پچھلی بار یہاں آیا تھا تو اسے بھی یہ جگہ پسند آئی تھی۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔

کوئی ریس پانس نہیں ملا۔

اس نے دوبارہ دستک دی۔

اب کی بھی کوئی دروازہ کھولنے نہیں آیا۔

اس نے لمحہ بھر رُک کر ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھُلا۔

اس کے سامنے ایک نحیف سی، بزرگ خاتون کھڑی تھی، جس کے بال ایک دم سفید تھے اور بہت کم بھی ہو گئے تھے۔ یہ ایلن کی ماں تھی، لیکن کتنی بدلی ہوئی تھی۔

"گُڈ ایوننگ مدر"

"گُڈ ایوننگ" خاتون نے بڑی آہستگی سے جواب دیا۔

"ایلن گھر میں ہے؟"

"نہیں، یہاں نہیں"

"تو کہاں ہے وہ؟ میں اس کا فرینڈ گلشن ہوں"

"کم اِن سَن"

وہ خاتون کے پیچھے پیچھے کاٹیج میں داخل ہو گیا اور سوچنے لگا۔ کیا ایلن نے شادی کر لی تھی اور وہ ماں سے الگ ہو گیا تھا لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا۔ ماں کے لیے جان دیتا تھا۔ اُسے وہ اس حالت میں کبھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

وہ اندر آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔

صوفہ وہی تھا جس پر وہ بہت برس پہلے بیٹھا تھا لیکن اب بہت پُرانا اور بے رنگ ہو گیا تھا۔

"ایلن کہاں ہے مدر؟"

"ہی از ڈیڈ"! ماں نے دیوار کے ساتھ لگے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ڈیڈ!" وہ چیخا۔

"ہاں۔ ایک ایکسی ڈینٹ میں"

"کب؟"

"پانچ سال ہو گئے"

یہ سُن کر اس کی جان ہی تو نکل گئی۔

"ویری سیڈ مدر"

"خدا یہی چاہتا تھا"، ماں بولی۔

وہ کچھ دیر اپنے آپ کو اس بدلے ہوئے ماحول میں فٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کچھ نہیں بولا۔ ماں بھی خاموش تھی اور اپنی کمزور انگلیوں کو باری باری دبا رہی تھی۔ جیسے اُسے ایسا کرنے سے سکون مل رہا ہو۔

"میں نے کاٹیج کا آدھا حصّہ کرایہ پر دے رکھا ہے۔ نوسورس آف اِنکم" پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"اور وہ آرچرڈ"؟

"وہ ایلن نے بیچ دیا تھا۔

اس کے بعد وہ پھر خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا۔

"مدر میں ایلن کا بہت پرانا دوست ہوں۔ میں ایک بار یہاں آیا بھی تھا۔

ایلن اور میں دہلی میں اکٹھے پڑھا کرتے تھے"۔

"میری یادداشت کمزور ہو گئی ہے۔ اولڈ ایج سُن"۔ ماں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"ایلن بڑا گریٹ آدمی تھا"۔

"یس۔ مجھے یہی تو دُکھ ہے"۔ یہ کہہ کر وہ اٹھی اور الماری کھول کر اُس میں سے البم نکالا۔ اور اسے صوفے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تم پکچرز دیکھو۔ میں چائے بناتی ہوں۔ ذرا دیر لگ جائے گی سن ڈاونٹ مائنڈ"۔

"نہیں مدر" وہ ماں کو عزت دینے کے لیے اپنی جگہ سے اُٹھا اور پھر بیٹھ گیا۔

ماں کچن میں چلی گئی اور وہ البم کھول کر تصویریں دیکھنے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے تصویریں بول رہی تھیں۔ نہیں جس کی تصویریں تھیں وہ خود بول رہا تھا۔

یہ ایلن کی آواز تھی۔ اس کے پیارے دوست کی آواز۔ بڑی مدھم لیکن صاف۔

اور وہ بڑے غور سے سُن رہا تھا۔

یہ میں پانچ برس کا ہوں۔ میری ماں مجھے اسکول میں ایڈمِٹ کرانے جا رہی ہے۔ دیکھو کتنی خوبصورت ہے میری ماں! تم نے اسے بہت برسوں کے بعد دیکھا ہے۔ وہ اپنے وقت کی کوئین تھی کوئن۔ مجھے پرنس کہا کرتی تھی شہزادہ!

یہ دیکھو میرا قد۔ دیودار کے درخت کی طرح بڑھ رہا ہوں۔ ماں کہتی ہے اگر میں اسی طرح قد نکالتا رہا تو آسمان کو چھو لوں گا۔ مجھے بڑی تمنّا ہے آسمان کو چھونے کی۔ جی چاہتا ہے

آسمان کے دامن سے تمام تارے چھین لاؤں ۔ اس سال میں سینئر کیمبرج میں داخل ہو رہا ہوں۔
یہ ہے میرے برتھ ڈے کا جشن۔

سارا شہر اکٹھا ہو رہا ہے۔ ماں نے مجھے نیا سوٹ سِلا کر دیا ہے۔ کل تمام دن وہ کیک اور ختائیاں بناتی رہی ہے۔ دیکھو یہ لڑکی کتنی سویٹ ہے۔ یہ مجھے پیار کرتی ہے۔ اس کا نام جوزفین ہے۔ یہ جو ٹائی میں نے لگا رکھی ہے نا' یہ اُسی نے پریزنٹ کی ہے مجھے۔ یہ کچھ دنوں کے لیے اپنے انکل کے پاس جرمنی جا رہی ہے۔

یہ ہیں سینٹ سٹیفن کالج دہلی کے میرے دوست۔ اِن میں سے بہت سوں کو تم بھی پہچان سکتے ہو۔ یہ نروتم ہے۔ آج کل سالا کمیونسٹ لیڈر بن گیا ہے۔ یہ سانیال ہے جس کی تصویریں اب نمائشوں میں دکھائی جاتی ہیں یہ مریم ہے جسے میں پیار کرتا ہوں۔ جوزفین کی جگہ اب مریم نے لے لی ہے۔ اور یہ تم ہو ایک دم بھونڈو کھدر کے کرتے پاجامے میں بڑے انٹلیکچول بننے کی کوشش کرتے ہو۔ قہقہہ سُنا ہے نا میرا ! میں ایسے ہی قہقہے لگاتا رہا ہوں اُن پر جو شام کو کافی ہاؤس میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں' اور ٹھنڈے پانی کے گلاس خالی کرتے رہتے ہیں۔

مریم کے باپ نے آج مجھے مریم سے ملنے کو منع کر دیا ہے۔ میرا فادر جو نہیں ہے۔ وہ اپنی لڑکی کو ایک فادرلیس لڑکے سے نہیں بیاہ سکتا۔ آئی کانٹ گیٹ اے فادر ناؤ۔ میری آنکھوں میں آنسو ہیں اور میری آواز رُندھی ہوئی ہے۔ کیونکہ آج مریم کے فادر نے میری اِنسلٹ کی ہے۔

میں اب واپس گھر جا رہا ہوں۔ تم لوگ مجھے چھوڑنے آئے ہو دہلی اسٹیشن پر، تم اب واپس چلے جاؤ۔ گاڑی اگر ٹھیک وقت پر بھی چلی تو بھی گیارہ بج جائیں گے میں اپنی لینڈیڈ پراپرٹی کی دیکھ بھال کروں گا۔ اور پھر ــــ الیکشن لڑوں گا۔ مجھے کسی بھی پارٹی کے سلوگن میں اعتقاد نہیں۔ میں آزاد اُمیدوار رہوں گا۔ کیونکہ میں نے اپنی آزادی کو کسی قیمت پر نہیں کھویا۔ تم سب لوگ آنا میری کنویسنگ کے لیے۔

میرے آرچرڈ کے سیب بہت ہی اچھے ہیں۔ میں تم سب کو ایک ایک پیٹی بھجوا رہا ہوں۔ یہ میرے باغ کی پہلی فصل ہے۔ جب پہلی فصل تیار ہوتی ہے تو کسان کتنا خوش ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ ہم سب نہیں لگا سکتے۔ صرف وہی لگا سکتے ہیں جن کے پاس بڑی بڑی

آہنی تجوریاں ہیں۔ اور جن کی آنکھیں ہر اچھی فصل پر جمی رہتی ہیں۔ چاہے وہ دنیا کے کسی حصّے میں بھی تیار ہو۔

مدر بہت بوڑھی ہوگئی ہے۔ وہ چاہتی ہے میں شادی کروں جوزفین ایک بار جرمنی جاکر واپس نہیں آئی۔ ادھر مریم کے باپ نے اپنے گھر کے دروازے میرے لیے بند کر ڈالے ہیں۔ مدر اپنی کاٹیج کا دروازہ کُھلا رکھتی ہے اور کرسمس ایو کو تو وہ گیٹ کا دروازہ تمام رات بند نہیں کرتی۔ شاید سانتا کلاز کہیں سے ایک خوبصورت سی پری ہمارے گھر میں چھوڑ جائے، مدر کے شہزادے کے لیے۔

تم کہہ رہے تھے تم ایک ناول لکھو گے جس کا مرکزی کردار میں ہونگا، کب لکھو گے وہ ناول ؟ تم جس زبان میں لکھتے ہو۔ وہ تو ویسے ہی مر رہی ہے۔ ناول لکھنے میں دیر کروگے تو اسے پڑھے گا کون ؟ اب تم یہاں ہو تو اس کا خاکہ بنا ڈالو۔ پھر کسی روز یہیں میرے پاس، میری کاٹیج میں رہ کر اس ناول کو مکمل کرنا۔ مجھے بڑا فخر ہوگا اس پر۔

ایلبم کی آخری تصویر پر اس کی انگلیاں جمی تھیں اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر تھا۔

ایلن کی آواز مدھم ہوتے ہوتے آخر ختم ہوتی گئی۔

اُسی لمحہ ماں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چائے کی ٹرے تھامے اندر داخل ہوئی۔

"سوری سَن دیری ہوگئی"

وہ کچھ نہیں بولا۔ الفاظ اس کے حلق میں ریزہ ریزہ ہو رہے تھے۔ اور وہ انہیں سمیٹ نہیں پا رہا تھا۔ وہ صوفے سے اُٹھا اور چائے کی ٹرے ماں کے ہاتھوں سے لے کر میز پر رکھ دی۔

"میں بناتا ہوں چائے"۔ اُس نے اپنے کھدر کے کرتے کی آستین ہی سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔

"ارے تم رو رہے ہو میرے بچے!" ماں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا اور وہ پھپھک کر رو پڑا۔

"آئی ہیو بین لیٹ مدر۔ ایلن چاہتا تھا میں اپنا ناول یہاں آکر مکمل کروں"

"تم ہی اس کے رائٹر فرینڈ ہو۔ اب مجھے یاد آگیا!"

" لیکن میں نے بہت بڑی بے وقوفی کی ہے۔ میں وقت سے نہیں آیا۔"

" وہ تمہیں بہت یاد کیا کرتا تھا۔ ایکسی ڈینٹ کے بعد اسپتال میں وہ تمہیں اور مریم کو یاد کرتا رہا۔ مجھے تم دونوں میں سے کسی کا ایڈریس معلوم نہیں تھا۔ اور پھر وہ آخری ہچکی لے کر خدا کے پاس چلا گیا۔"

یہ کہتے ہوئے ماں اس کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور اس نے تصویروں کا البم اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔

" میں بڑی اذیت میں ہوں مدر۔"

" تم چائے پیو میرے بچے۔"

" آپ نہیں پئیں گی ؟"

" نہیں۔ میں شام کو کچھ نہیں لیتی۔ ایلن کی موت کے بعد میرا یہی دستور ہو گیا ہے۔"

اُس نے ماں کو مجبور نہیں کیا۔ اور دھیرے دھیرے چائے پیتا رہا۔

ماں کو چائے بنانے سے خاصا اسٹرین ہوا تھا۔ اس نے صوفے کے ساتھ پیٹھ ٹکا دی تھی اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اُسے محسوس ہوا جیسے ماں کی آنکھ لگ گئی تھی۔

کمرے کی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ اُس نے پلنگ پر پڑی گرم اُونی شال اٹھا کر بڑی آہستہ سے ماں کے کندھوں پر ڈال دی اور کچھ لمحے اسے اُسی طرح سکون سے آنکھیں بند کیے صوفے سے پیٹھ ٹکائے دیکھتا رہا اور پھر کمرے کا دروازہ آہستہ سے بھیڑ کر باہر نکل آیا۔ اس نے کاٹیج کا گیٹ بڑی آہستگی سے بند کیا اور پھر گیٹ کے سامنے رُک کر اپنے سینے پر دائیں ہاتھ سے کراس کا نشان بنایا اور اس سڑک پر واپس ہو لیا جو اس کے ہوٹل کو جاتی تھی۔

" اس ناول کو اب دوبارہ اسکیچ کروں گا۔ ایلن تم نے تو میرا تمام فریم ورک ہی بگاڑ دیا۔ ظالم! تمہارا گھر تو ایک سویا ہوا خاموش شہر ہے جس میں ہر چیز قرینے سے رکھی ہے۔ لیکن گلیاں، بازار، گھر، صحن سب سُنسان ہیں۔ ایک شخص بھی نہیں انھیں دیکھنے والا، اور شہر کی فصیل کے بڑے سے دروازے کے سہارے تمہاری ماں پیٹھ ٹیکے ایک پہرے دار کی طرح دن رات کھڑی ہے اور اب وہیں کھڑے کھڑے پتھر ہو گئی ہے۔"

وہ اپنے ہوٹل کے کمرے میں کھڑا اُن تمام کاغذات کو پھاڑ کے ٹکڑے کر رہا تھا جن پر وہ اپنے ناول کا اسکیچ تیار کرتا آیا تھا۔ اور دھیرے دھیرے بڑبڑا رہا تھا اور پھر اس نے کاغذات کے ایک ایک ٹکڑے کو کمرے کی کھڑکی سے باہر نیچے پھیلی عمیق کھائی میں پھینکنا شروع کر دیا۔ ■■

یہ بات ۱۶ جولائی کی ہے۔

پاکستانی اور ہندوستانی قیدیوں کے تبادلے کا موقع تھا۔ کل ۷۶ قیدیوں کا تبادلہ کیا گیا تھا۔ ہندوستان نے ۳۹ پاکستانی قیدیوں کو پاکستان کے متعلقہ افسروں کو سونپنا تھا۔ اس کے بدلے میں ہندوستان نے اپنے ۳۷ قیدی واپس لینے تھے۔

میں ان پریس رپورٹروں میں سے تھا، جو اپنے اخباروں کے لیے واہگہ کی سرحد پر اس اہم واقع کی تفصیلی رپورٹ حاصل کرنے کے لیے گئے تھے۔ پریس رپورٹروں کے علاوہ دونوں ملکوں کے اعلیٰ افسران بھی وہاں موجود تھے۔ فیصلہ تو یہ تھا کہ کل ۱۶۰ قیدیوں کا تبادلہ کیا جائے گا اور دونوں طرف سے ۸۰ قیدی ایک دوسرے کی سرحد سے رہا کیے جائیں گے۔ لیکن ہُوا یہ کہ قیدیوں کے نام کلیر نہیں ہو سکے تھے۔ اس لیے صرف ۷۶ قیدیوں کا ہی تبادلہ کیا جانا تھا۔

پریس رپورٹروں کی خاصی بھیڑ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ دونوں ملکوں سے آنے والے زیادہ سے زیادہ قیدیوں سے بات کر سکیں۔ سب سے پہلے ہندوستانی قیدیوں کا ہی تبادلہ ہُوا۔ یہ قیدی ننگے پاؤں اور زرد چہرے لیے زیرو لائن تک پہونچے تو ہندوستان کی پولیس نے انھیں اپنی سپردگی میں لے لیا۔ قیدیوں میں سے بیشتر بوڑھے اور جسمانی طور سے کمزور تھے۔ سات ایسے قیدی تھے جو اپنی یادداشت کھو چکے تھے۔ لگتا تھا کہ قید کے وہ شب و روز جو انھوں نے پاکستان کی مختلف جیلوں میں گزارے تھے ان کے لیے بہت ہی کٹھن رہے تھے۔

جن قیدیوں سے میری بات ہوئی تھی انھوں نے کُھل کر تو نہیں کہا لیکن دبے لفظوں میں اس امر کا اظہار کیا کہ قید کے دوران انھیں ڈاکٹری سہولت بھی کم دی گئی تھی اور جو خوراک انھیں دی جاتی رہی تھی اس کا معیار بھی اچھا نہیں تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ کسی قیدی کا دوست یا رشتہ دار اسے سرحد پر ریسیو کرنے نہیں آیا تھا۔ یہ قیدی۔ برسوں کے بعد اپنے دماغوں میں طرح طرح کے وسوسے لیے اپنے وطن لَوٹ رہے تھے۔ ہر قیدی کی اپنی ایک انفرادی دردناک کہانی تھی جسے وہ سُنانا تو چاہتا تھا لیکن اس کی کہانی کو سننے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے کوشش کی کہ کچھ قیدیوں سے بات کروں اور ان سے یہ معلوم کرسکوں کہ وہ پاکستان کے قیدی کیسے بنے تھے۔ ہر ایک کی کہانی مختلف تھی لیکن دو قیدیوں محمد اقبال اور محمد حنیف نے ایک بہت دلچسپ کہانی بیان کی۔ یہ دونوں پاکستانی شہری تھے۔ محمد اقبال صوبہ سندھ میں ایک وڈیو پارلر چلا رہا تھا۔ اسے ہندوستانی ایکٹریس جُوہی چاولہ بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ جُوہی چاولہ کو دیکھنے کے لیے راجستھان سیکٹر سے ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوکر سری گنگا نگر شہر میں پہونچ گیا۔ لیکن اس کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ بمبئی جانے والی ٹرین میں سوار ہونے سے پہلے ہی پولیس نے اسے پکڑ لیا اور اس طرح وہ ہندوستانی قیدی بن گیا۔

محمد حنیف امیتابھ بچن کا دیوانہ تھا اور صرف اسے دیکھنے کے لیے ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ اٹاری اسٹیشن پر اسے پولیس نے گرفتار کرلیا۔ امیتابھ بچن کو دیکھنے کی اس کی حسرت پوری نہ ہوسکی۔

لیکن سب سے انوکھی داستان مجھے ہریانہ کے ضلع جیند کے ایک نوجوان حاکل نے سُنائی۔ اس کی داستان عجیب وغریب تھی۔ حاکل کے پاکستانی قیدی بننے کی کہانی کچھ اس طرح سے تھی۔ حاکل ضلع جیند کے گاؤں اکلانا کا رہنے والا تھا۔ اس کے باپ کِشنے کی تھوڑی سی زمین تھی جس میں وہ سارا سال محنت کرنے کے باوجود مشکل سے گزارے کے لیے اناج جُٹا پاتا تھا۔ حاکل کا اصلی نام حکم چند تھا۔ لیکن اس کی ماں اسے حاکل کہہ کر پکارتی تھی۔ چنانچہ سبھی اُسے اسی نام سے پکارنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی اپنا اصلی نام بُھول گیا۔ کِشنے نے اُسے گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخل کردیا۔ لیکن حاکل کا پڑھنے لکھنے میں جی نہیں لگتا تھا۔ اس نے پانچویں کلاس صرف اس لیے پاس کرلی کہ سرکار کی پالیسی کے مطابق پانچویں جماعت تک لڑکوں کو فیل نہیں کیا جاتا تھا۔ حاکل جب پانچویں کرچکا تو اس کی تعلیمی قابلیت صرف اتنی تھی کہ اب وہ اپنا نام باپ کا نام اور گاؤں کا نام پتہ لکھ سکتا تھا۔ اسکول تو آٹھویں درجہ تک ہوگیا لیکن حاکل پانچویں کے بعد اسکول میں پڑھنے گیا ہی نہیں۔ پڑھائی میں نالائق ہونے کی وجہ سے اس کا باپ کِشنا چودھری اکثر اس کی پٹائی کرتا تھا۔ اس اکثر ہوتے رہنے والی پٹائی نے اسے اور بھی ڈھیٹ اور ضدّی بنا دیا۔ کئی بار وہ گاؤں سے بھاگ بھی

گیا اور خود ہی واپس بھی آگیا۔ واپس آنے پر اس کی پہلے سے بھی زیادہ پٹائی ہوتی۔ حاکل کی ماں اسے سمجھاتی کہ وہ کھیت میں جاکر اپنے باپ کا ہی ہاتھ بٹائے۔ وہ بیچارہ اکیلا ہی دن بھر محنت کرتا رہتا تھا۔ لیکن حاکل نے ماں کی یہ بات بھی نہیں مانی۔ اگر کبھی ماں مجبور کر کے اسے کھیت میں اپنے ساتھ لے بھی جاتی تو اس کا اپنے باپ سے کسی نہ کسی بات پر جھگڑا ہو جاتا اور بیچارا مار کھاکر گھر لوٹ آتا۔

حاکل کی تین بہنیں تھیں جو اس سے چھوٹی تھیں اور تینوں اس لیے اَن پڑھ تھیں کیونکہ لڑکیاں گاؤں کے اسکول میں داخلہ نہیں لیتی تھیں۔ دراصل ان کے ماں باپ لڑکیوں کو پڑھانا چاہتے ہی نہیں تھے۔ اسی لیے تو یہ غلط رواج پڑ گیا تھا۔ وہ تمام گھر کا کام کرتیں۔ گوبر اکٹھا کرتیں یا کھیت میں جاکر چارہ کاٹتیں۔ اس کے باوجود حاکل کی ماں ہر روز رات اسے پینے کو دودھ دیتی۔ صبح باسی روٹی پر مکھن بھی رکھ کر دیتی اور اسے کھیت میں کام کرنے کو کہتی۔ لیکن وہ رضامند نہ ہوتا اور یوں ایک مستقل خاموش جنگ اس کے اور اس کے باپ کِشنے کے درمیان بہت دنوں تک جاری رہی۔

لطف کی بات یہ تھی کہ اس سب کے باوجود قریب کے ہی گاؤں نتھانہ کے چودھری کنہیا نے اپنی بیٹی دروپدی کا حاکل سے رشتہ کر دیا۔ حاکل کے انکار کے باوجود اس کے باپ کِشنے نے حامی بھر لی۔ چودھری کنہیا سو روپے کا ایک نوٹ حاکل کے ہاتھ میں پکڑا کر رشتہ پکّا کر گیا۔ اس کے جاتے ہی کِشنے نے سو روپے کا وہ نوٹ حاکل سے زبردستی لے لیا اس بات پر باپ بیٹے میں خوب جھگڑا ہوا۔ وہ پہلا دن تھا جب حاکل نے اپنے باپ کے ہاتھوں خاموش رہ کر پٹنا برداشت نہ کیا۔ اس کی عمر تو زیادہ نہیں تھی۔ نہ ہی اس میں سوچ سمجھ زیادہ تھی لیکن سو روپے کا نوٹ اس طرح چھین لینا تو سراسر ناانصافی تھی۔

"بہت مار کھائی ہے میں نے۔ اب اگر ہاتھ اٹھاؤ گے تو بُرا ہوگا۔"

حاکل کے یہ الفاظ سن کر کِشنا چودھری آگ بگولہ ہوگیا۔

"اب یہ ہمت ہوگئی ہے تمہاری اُلّو کے پٹّھے۔"

"مُنہ سنبھال کر بات کرو چاچا۔"

وہ تو حاکل کی ماں نے بیچ بچاؤ کرا دیا ورنہ باپ بیٹے میں خوب جم کر جھگڑا ہوتا۔ حاکل کی تینوں بہنیں اس دوران ڈری سہمی ہوئی سی ایک طرف کھڑی رہیں۔ اگلی صبح حاکل گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔

کِشنے نے اسے تلاش کرنے کی بالکل کوشش نہ کی۔ بہت دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ حاکل اپنے ماما کے پاس چلا گیا ہے۔

"جاؤ اپنے بیٹے کو میرے مائیکے سے لے آؤ"۔ حاکل کی ماں نے کشنے سے کہا۔

"میری جاتی ہے جُوتی۔ میں تو حرام جادے کی سکل نہیں دیکھوں"۔

"بیٹا کھو دو گے جالم"۔

"کھو جائے بے سک"۔

"دنیا کو کیا مُنہ دکھاؤ گے"۔

"تم دکھاتی رہنا اپنا تھوبڑا۔ میں تو کسی سے بات نہیں کروں گا"۔ کشنا چودھری نہیں مانا۔ حاکل کو لانے کے لیے، حاکل کی بہنیں رو رو کر ماں سے کہتیں کہ وہ ان کے بھائی کو اپنے گھر لے آئے۔ باپ سے تو وہ بھی ڈرتی تھیں۔ اُس سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی ان میں۔

آخر حاکل کی ماں ہی اسے لینے کے لیے اپنے بھائی کے گھر گئی۔ حاکل تو ایکدم بدل چکا تھا۔ وہ تو ہر شام اپنے ماما کے ساتھ بیٹھ کر دارُو پیتا اور مامی سے گالیاں کھاتا تھا۔

"نند حاکل کو لے جاؤ۔ نہیں تو یہ کہیں کا بھی نہیں رہے گا"۔ حاکل کی مامی نے اس کی ماں سے مِنّت کرتے ہوئے کہا۔

"میں تو کھُد پریسان ہوں"۔

"تمہارا بھائی تو دونوں ہاتھوں سے گھر کو لُٹا رہا ہے"۔

"میں کل ہی چلی جاؤں گی حاکل کو لے کر"۔

اس رات ماموں بھانجے نے خوب ڈٹ کر پی اور خوب ہنگامہ کیا۔

"حاکل کو کچھ دن یہاں رہنے دو ساوتری"۔

"اور بگاڑو گے اسے"۔

"تم سمجھتی ہو کِشنا چودھری سُدھار لے گا اسے؟"

"مجھے کوئی نہیں سُدھار سکتا۔ میں ماما کا ساگرد ہوں"۔ حاکل نشے کی کیفیت میں بولا۔

"ساباس میرے ساگرد"۔ حاکل کے ماما نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور پھر دونوں نے دارُو کا آخری گھونٹ لے کر اپنے اپنے گلاس پھینک دیئے۔ ایک گلاس ٹوٹ گیا۔ دوسرا بچ گیا۔

اگلی صبح جب ساوتری اپنے بھائی کے گھر سے رُخصت ہوئی تو بھائی نے اسے روپے کپڑے

اور گُڑ کی بھیلی دی اور حاکل سے کہا۔

"ایک ادّھا ساتھ لے جاؤ۔"

"نہیں بھیّا۔"

"کِشنا چودھری سے مار کھانے میں آسانی رہے گی میرے بھانجے کو۔"

حاکل نے دارُو کا ادّھا اپنے کپڑے کے تھیلے میں رکھ لیا اور ماں کے شعلے اُگلتی آنکھوں کی طرف دیکھا تک نہیں۔ دیکھتا تو تپش سے جل جاتا۔

اس رات حاکل نے اپنے گھر میں پہلی بار دارُو پی اور نشے کی حالت میں پہلی بار باپ سے پٹا۔

"اور مارو" میں بہت نالائک ہو گیا ہوں۔"

حاکل مار بھی کھاتا رہا اور اوٹ پٹانگ بولتا بھی رہا۔ اب اس نے جینے کا ایک بنیادی راستہ اختیار کر لیا تھا۔ پھر حاکل کی شادی ہو گئی۔

حاکل کے ماما نے جی بھر کر خرچ کیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بہن کے گھر کی حالت بہت اچھی نہیں تھی۔ جب برات ڈولی لے کر واپس آئی تو آدھی رات کو حاکل کے ماما نے دارُو پی پی کر اپنے آپ کو دُھت کر رکھا تھا۔ بیچ میں ایک آدھ بار حاکل نے بھی چُھپ چُھپا کر دو ایک پیگ لگا لیے تھے۔ لیکن کسی کو اس کا علم نہیں ہوا تھا۔ اس کے باپ کِشنے کو بھی نہیں۔

جب ڈولی گھر پہنچ گئی، براتی بھی چھٹ گئے اور حاکل کی ماں اور اس کی بہنیں عورتوں کے جمگھٹ میں دُلہن کو سنبھالنے میں لگ گئیں تو حاکل کا ماما آنگن میں اُگے نیم کے نیچے بوتل لے کر بیٹھ گیا۔ حاکل بھی اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ کِشنا چودھری جانے کس کارن ادھر پہنچا۔

"اچھا سَبک پڑھا رہے ہو بھانجے کو؟"

"میرا سا گرد ہے یہ کِسن چودھری۔"

"اُٹھ حرام جادے۔" اس نے حاکل کو بازو سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔

"نہیں اٹھتا۔"

کِشنا چودھری نے اس کی طرف ہاتھ اٹھایا تو اس کے ماما نے ٹوک دیا۔

"چودھری کیوں تماسہ کرتے ہو۔ جاؤ کام کرو۔"

"دیکھ لوں گا۔ بچّو۔"

"دیکھ لینا۔" حاکل نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا۔

" اُلّو کا پٹّھا" یہ کہتے ہوئے کِشنا چودھری وہاں سے ٹل گیا۔ رات جب حاکل اپنی بیوی سے الگ کمرے کے اندھیرے میں ملا تو وہ نشے میں چُور تھا، وہ تمام رات بے سُدھ چارپائی پر پڑا رہا اور اس کی بیوی دروپدی روتی رہی۔ یوں ہُوا تھا حاکل کی ازدواجی زندگی کا آغاز۔

بیاہتا زندگی کے ایسے آغاز کے باوجود بھی پورے دس مہینوں کے بعد حاکل نے اپنی بیوی دروپدی کی جھولی میں ایک صحت مند لڑکی ڈال دی۔ ڈالی تو خیر گاؤں کی دائی بھاگو نے تھی۔ حاکل بے چارا تو سادھن ماتر تھا لیکن لڑکی کے پیدا ہونے پر کوئی بھی خوش نہ تھا۔ گھر میں لڑکیاں تو پہلے ہی موجود تھیں۔

" مجھے تو بہُو کے سروع سے یہی لچھن لگ رہے تھے"

حاکل کی ماں ساوتری کا یہ رِدّعمل تھا جب بھاگو دائی نے لڑکی پیدا ہونے کا اعلان کیا۔

" اس بے چاری کا کیا دوس ہے ؟" بھاگو نے جواب دیا۔

دروپدی اپنی ساس اور دائی کی بات چیت سُن رہی تھی اور روئے جا رہی تھی۔

شروع شروع میں تو حاکل کو بھی لڑکی کا پیدا ہونا بہت بُرا لگا تھا۔ وہ تو کئی دنوں تک دروپدی سے بولا تک نہیں۔ جیسے سارا قصور اُسی کا ہو۔ پورا ایک سال لگ گیا اسے اپنی بیٹی کو اپنانے میں۔ حالانکہ تین چار مہینوں کے بعد اس کی ماں اور بہنوں نے لڑکی کو قبول کر لیا تھا اور اسے گڈّی کہہ کر پکارنے لگی تھیں۔

وہ کمبخت لگتی بھی تو ایک پیاری سی گُڑیا کی طرح تھی۔ جو گدگُدانے پر مسکراتی اور آنکھیں مٹکاتی تھیں۔

اس ایک سال کے دوران اس نے دروپدی کے چھوٹے موٹے گہنے بیچ ڈالے تھے اور دارُو کا دھندہ اور بھی تیز کر دیا تھا۔ حاکل کو جب اور جتنی مقدار میں دارُو ملتی پیتا، بہکتا اور گھر والوں سے جھگڑا کرتا۔ ایک سال میں گڈّی بہت موٹی تازی اور خوبصورت ہو گئی تھی۔ حاکل کی بہنیں اسے سارا دن اٹھائے پھرتی رہتی تھیں ایک دن حاکل کو دروپدی نے بتایا کہ وہ پھر اُمید سے ہے تو اس دن حاکل بہت بے چین ہوا۔

" اس بار اگر تم نے لڑکی جنی تو گلا گھونٹ دوں گا"

" میرا کیا بس ہے اس پر"

" بس کی بچّی۔ گھر سے نکال دوں گا دیکھ لینا" اگلے روز اس نے دروپدی کے ٹرنک سے

اس کی دو چوڑیاں اور پچاس روپے نکالے اور گھر سے نکل گیا۔ یہ وہ روپے تھے جو دروپدی کی ماں اسے کئی مہینے پہلے دے گئی تھی۔

اس روز جانے کیوں وہ گُڈّی کو گود میں لے کر کافی دیر بیٹھا رہا اور اسے گُدگُداتا رہا۔ پھر اس نے اسے کھرّی کھاٹ پر ڈال دیا اور گُڈّی نے زور سے اپنے ہاتھ پاؤں چلانے شروع کر دیئے۔

حاکل نے گاؤں کے لالہ کی دکان سے سگرٹ کا ایک پیکٹ لیا۔ ایک سگرٹ سُلگایا اور جیند جانے والی سڑک پر آکر کھڑا ہو گیا۔ پہلی بس جو گاؤں کے اڈّے پر رُکی وہ اس میں بیٹھ کر جیند آگیا۔ وہاں اس نے ٹھیکے سے ایک اَدھا لیا۔ کچھ دارُو گلاس میں ڈال کر اُسے ایک ہی گھونٹ میں ختم کر کے پاس کے ڈھابے پر کھانا کھایا اور ڈھابے کے باہر بچھی چارپائیوں میں سے ایک پر لیٹ گیا۔ ڈھابوں کے باہر ڈھابوں کے مالک ٹرکوں کے ڈرائیوروں کے لیے چارپائیاں ڈال دیتے تھے۔ تاکہ وہ کھانا کھا کر آرام کر لیں اور پھر اپنے اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں۔ حاکل کو بہت زور کی نیند آرہی تھی۔ وہ پچھلی رات دروپدی کو اپنے ساتھ چمٹائے جاگتا ہی رہا تھا بھور تک۔ نہ خود سویا تھا نہ اُسے ہی سونے دیا تھا۔ دو ایک بار جب گُڈّی روئی تو حاکل نے دروپدی کو اُٹھنے نہ دیا اور اسے اپنی باہوں میں لئے پڑا رہا۔ ڈھابے کے باہر پڑی چارپائی سے حاکل جب اُٹھا تو شام ہونے کو تھی۔ اس نے ڈھابے والوں سے پانی کا جگ لے کر اپنی آنکھوں پر چھینٹے مارے۔ رومال سے ہاتھ مُنھ پونچھا اور اَدّھے میں جتنی دارُو بچی تھی اسے گلاس میں ڈال کر ایک ہی بار میں چڑھا گیا۔ اس نے ٹھیکے سے ایک اَدّھا اور خریدا۔ اسے اپنے کپڑے کے تھیلے میں ڈالا اور اس بس میں بیٹھ گیا جو دہلی جارہی تھی۔ ٹکٹ بھی اس نے بس کے اندر بیٹھنے کے بعد ہی لیا۔ دہلی وہ اس سے پہلے بھی کئی بار آچکا تھا اپنے ماما کے ساتھ، پہلی بار نہیں آیا تھا وہ آج۔ بس سے اُترنے کے بعد اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ اپنے گاؤں تو اب وہ واپس نہیں جائے گا۔ جانے کیوں اُسے یقین تھا کہ دروپدی اس بار بھی بیٹی ہی جنے گی اور اس کے ماں باپ اس کا جینا دُوبھر کر دیں گے۔ اس کا باپ اسے نہ جانے کیا کیا کہہ کر طعنے دے گا، حالانکہ وہ خود بھی لگاتار تین بیٹیاں پیدا کر چکا تھا۔ لیکن اپنی بات کہاں یاد رہی تھی اب اُسے۔ یہ سب باتیں سُننے کے لیے حاکل تیار نہیں تھا۔ اور پھر وہ دروپدی کی چوڑیاں اور روپے بھی تو چُرا لایا تھا۔ چور کی حیثیت سے تو وہ نہیں لوٹے گا اپنے گھر۔ گاؤں تو وہ واپس ہرگز نہیں جائے گا۔ البتّہ گُڈّی کا خوبصورت چہرہ ایک بار اس کی آنکھوں کے

سامنے ضرور گھوم گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کا دل بے چین ہو گیا۔ اپنوں کا موہ ایک بار جاگ گیا اس کے من میں، لیکن اب تو اسے مارنا ہی ہوگا۔ ایک بار ڈگمگا گیا تو عمر بھر ذلیل ہوتا رہے گا سب کے سامنے۔ اس نے جی کڑا کر کے آخری فیصلہ کر لیا کہ اب وہ گاؤں نہیں لوٹے گا۔

وہ بس سٹینڈ سے باہر نکل کر سڑکوں پر گھومتا رہا، بیچ بیچ میں کپڑے کے تھیلے سے اَدھا نکال کر گھونٹ دو گھونٹ حلق میں اُنڈیلتا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ پھر اندھیرا ہو گیا، بجلی کی روشنی میں دہلی کی سڑکیں چمک اُٹھیں اور اس کا حسن نکھرنے لگا۔ یوں آوارہ گھومتے ہوئے حاکل نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر پہونچ گیا۔ اسٹیشن تو جیسے نئی نویلی دلہن کی طرح سجا تھا۔ "نئی نویلی دلہن کیا تو بھی دروپدی کی طرح بیٹیاں ہی جنتی ہے؟" حاکل نے یہ سوال فضا میں اُچھالا اور پھر تھیلے میں سے اَدھا نکال کر دو تین گھونٹ حلق میں ڈال لیے۔

"ہمارے دیس کی سبھی دُلہنیں بیٹیاں ہی جنتی ہیں سالی!"

ایک اور جملہ فضا میں اُچھالنے کے بعد وہ نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کی باہنوں میں سما گیا۔

وہ پلیٹ فارموں پر گھومتا رہا جب اس کی بھوک تیز ہو گئی تو ایک ریڑھی والے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے گرم گرم پُوریاں سبزی کے ساتھ چٹخارے لے لے کر کھائیں۔ پھر پاس کے نل سے ڈٹ کر پانی پیا اور ایک بینچ کی ذرا سی خالی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اسے لگا وہ اونگھنے لگا تھا وہ بینچ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک بار پھر چلنا شروع کر دیا۔ جگمگاتے پلیٹ فارم پر کچھ دیر کے بعد اسے گیان ہوا کہ پلیٹ فارموں کے بھی صرف وہی حصے جگمگاتے ہیں جہاں تک مسافر آتے جاتے ہیں۔ اس کے بعد تو پلیٹ فارموں پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور پھر پلیٹ فارم بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ پلیٹ فارم کے ختم ہونے پر اس کی ڈھلان پر چند قدم چلا پھر اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے ریل کی لائینوں کا جال بچھا ہوا تھا اور لائنیں ایک دوسرے میں اُلجھتی جا رہی تھیں۔ ریل کی لائنوں پر اندھیرا تھا۔ اس نے ایک جگہ پر رُک کر بوتل میں سے بچی کھچی دارو حلق میں ڈالی، خالی بوتل کو لائنوں کے درمیان زور سے پھینکا پھر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور آگے بڑھ گیا۔

اب وہ تھک بھی بہت گیا تھا اور اسے نیند بھی بڑے زور کی آ رہی تھی، مگر وہ اور آگے بڑھتا گیا اور ریلوے یارڈ میں پہونچ گیا جہاں بغیر انجن کے ریل کے ڈبے کھڑے تھے۔ ایک دم الگ تھلگ کٹے ہوئے اندھیری رات میں اس طرح اپنے دروازے کھولے ہوئے جیسے قبریں مُنہ کھولے مُردوں کا انتظار کر رہی ہوں۔ حاکل ایسی ہی ایک اندھیری قبر میں داخل ہو گیا۔

کچھ دیر وہ ریل کے ڈبے کے ایک تختے پر بیٹھا رہا پھر آپ سے آپ اُونگھ گیا اور پھر اپنے پورے جسم کو تختے پر پھیلا کر لیٹ گیا پھر چند ہی لمحوں میں اسے گہری نیند آگئی۔

یہ سمجھوتہ ایکسپریس کے ڈبے تھے جو نئی دہلی سے لاہور تک جاتی تھی اور دونوں ملکوں کی دوستی کی مظہر تھی۔

اس کی نیند اس وقت کُھلی جب اس کی پشت پر ایک زور کا ڈنڈا پڑا۔

"اُٹھ اوئے حرام زادے" اس کے سامنے پولیس کا سپاہی تھا۔ جس نے ایک اور ڈنڈا اس کے رسید کر دیا تھا۔

یہ لاہور کا اسٹیشن تھا اور ——

پاکستان کی پولیس کا سپاہی تھا یہ۔

حاکل اب پاکستان میں تھا۔

وہ درد سے کراہ اٹھا۔ پولیس کے سپاہی چاہے پاکستان کے ہوں چاہے ہندوستان کے، ڈنڈے پشت پر ہی مارتے ہیں۔ ایک بار وہ ایسے ڈنڈے ہندوستانی پولیس سے بھی تو کھا چکا تھا۔

سپاہی اسے ہتھکڑی لگا کر پلیٹ فارموں پر گھماتے ہوئے پولیس چوکی لے گیا جہاں پہنچنے پر اس کے اور ڈنڈے پڑے۔

حاکل کا مقدر اب ڈنڈے کھانا ہی رہ گیا تھا۔

وہ پاکستان کی مختلف جیلوں میں قید کاٹتا رہا۔ مشقت کرتا رہا اور ڈنڈے کھاتا رہا۔ آخری جیل جس سے وہ رہا ہو کر واہگہ کی سرحد پر آیا تھا ملتان کی جیل تھی۔ تین سال کی قید کے دوران دارُو پینے کا تو خیر سوال ہی نہیں تھا۔ حاکل نے تو بیڑی یا سگریٹ بھی نہیں پی تھی۔ جب میں نے اسے سگریٹ پیش کی تو وہ ایک ساتھ تین چار سگریٹ پی گیا۔ اب وہ بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔ اور کہانی کا آخری حصّہ سُناتے ہوئے رو پڑا تھا۔ یہ حصّہ میں آپ کو اسی کی زبانی سُنا رہا ہوں کیونکہ میں اس کے جذبات کی عکاسی نہیں کر سکوں گا۔ ہندوستانی پولیس کا ایک سپاہی اسے بار بار چلنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے ایک پریس رپورٹر کی حیثیت سے اسے کچھ دیر اُو مجھ سے بات کرنے کی اجازت دینے پر راضی کر لیا تھا۔

حاکل نے چوتھے سگریٹ کا آخری ٹکڑا پھینکتے ہوئے کہا "ملتان جیل کا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ

حاجی عبدالرزاق مجھے سدا یاد رہے گا۔ اس جیل میں مَیں نے آخری چار مہینے کاٹے ہیں۔ سارے قیدی اس کو حاجی صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔"

"کیا خاص بات تھی اس میں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ سب قیدیوں سے عزّت سے پیش آتا تھا۔ اس وقت اس جیل میں کچھ اور بھی ہندوستانی قیدی تھے۔ وہ ہندوستانی قیدیوں سے خاص طور پر اچھا سلوک کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ یہ ہمارے مہمان ہیں۔ واپس اپنے ملک جائیں گے تو پاکستان کی تعریف کریں گے۔ معلوم نہیں وہ مجھ پر کیوں مہربان تھا۔ مجھ سے تو وہ کبھی کبھی اپنے گھر کا بھی چھوٹا موٹا کام کروا لیتا تھا۔ اس کی کوٹھی بھی تو جیل کے احاطے میں تھی۔"

"کیا کام کرتے تھے اس کے گھر میں تم؟"

"یہی، کھڑکیوں کے شیشے صاف کر دیتا۔ قالین جھاڑ دیتا۔ سبزی کاٹ دیتا۔ بس یہی کچھ۔ میں جب اس کے گھر جاتا تھا تو اس کی بیوی لسّی ضرور پلاتی تھی۔ وہ اِدھر حصار کی رہنے والی تھی شاید اس لیے۔"

"تمھیں بھی حاجی کے گھر جانا اچھا لگتا تھا؟"

"بہت اچھا لگتا تھا۔"

"کیوں؟"

"اس کی سب سے چھوٹی بیٹی کا نام گُڈّی تھا۔ اس کی عمر کوئی پانچ چھ برس تھی۔ وہ مجھے حاکل چاچا کہہ کر پکارتی تھی۔ بڑی ہی پیاری لڑکی تھی۔"

"تمھاری بیٹی کا نام بھی تو گُڈّی ہے نا؟"

"ہاں شاید اسی لیے وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ بڑی باتُونی تھی۔ مجھ سے بہت باتیں کرتی تھی۔ دو دن پہلے جب مجھے جیل سے رہا ہونا تھا۔ حاجی عبدالرزاق نے مجھے اپنے گھر بلا کر کھانا کھلایا اور کہا کہ میں ہندوستان میں اپنے ہر ملنے والے کو اس کا سلام کہوں اور اپنے بچّوں کو اس کی اور اس کی بیوی کی طرف سے دعائیں دوں۔ پھر گُڈّی نے مجھے ایک چھوٹا سا پیکٹ دیا۔ اس میں تازہ کھجوریں تھیں۔ یہ کھجوریں اس نے میری بیٹی کے لیے دی تھیں۔ اور کہا تھا حاکل چاچا یہ کھجوریں ہندوستان والی گُڈّی کو دے دینا۔ اس کی بات سُن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بولی۔ ابّا جان حاکل چاچا رو رہا ہے۔ تمھیں چھوڑنے پر رونا آ رہا ہے گُڈّی۔ یہ سُن کر وہ مجھ سے لپٹ

گئی اور بولی مجھے بھی تو رونا آرہا ہے تمھارے جانے پر حاکل چاچا۔ میری آنکھوں میں تو آنسو تھے۔ لیکن میں پھر بھی ہنس پڑا۔ اگلے دن جب میں جیل کے بڑے گیٹ سے نکل کر پولیس کی گاڑی میں بیٹھا تو حاجی عبدالرزاق کے ساتھ کھڑی گڈّی بھی ہاتھ ہلا کر مجھے خدا حافظ کہہ رہی تھی۔"

"تو تم اب اپنے گاؤں جاؤ گے؟"

"میں وہاں نہیں جانا چاہتا اب۔ چار سال میں وہاں کیا کچھ ہو گیا ہوگا۔ میری سوچ بدل گئی ہے۔ میں بہت سی باتیں برداشت نہیں کر پاؤں گا۔"

"ملتان والی گڈّی کی کھجوریں اپنی گڈّی کو نہیں دو گے؟"

"بس یہی دُودھا ہو رہی ہے من میں۔ پیکٹ تو پولیس والوں نے کھول دیا تھا۔ کچھ کھجوریں میں نے کھا بھی لیں۔ بہت میٹھی کھجوریں ہیں۔ ایک آدھ آپ بھی لے لو۔" اُس نے اپنے کپڑے کے پرانے تھیلے سے دو کھجوریں نکال کر مجھے بھی دے دیں۔

"یہ کھجوریں ہندوستان کے لیے پاکستان کی دوستی کا پیغام ہیں۔ اس پیغام کو اپنے لوگوں تک ضرور پہنچاؤ۔" میں نے مشورہ دیا۔

"تو مجھے اپنے گاؤں جانا چاہیے؟"

"ہاں حاکل، تمہاری گڈّی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ اسے یہ کھجوریں ضرور کھلاؤ۔ معصوم آرزوؤں کی رکھوالی کرو حاکل۔"

"کروں گا جی۔"

اُسی لمحہ ہندوستانی پولیس کا سپاہی آ گیا تو حاکل مجھ سے ہاتھ ملا کر اس کے ساتھ چل پڑا۔

میں دیر تک اُسے ننگے پاؤں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دیکھتا رہا جیسے وہ ایک لمبی یاترا پر جا رہا ہو۔ دوستی، محبّت اور امن کی یاترا پر۔

پھر میں اپنے ساتھی پریس رپورٹروں کے ساتھ اپنی کار کی طرف چل پڑا۔ یہ سوچتا ہوا کہ کیا میں حاکل سے حاصل کی ہوئی کہانی اپنے اخبار میں شائع کر دوں؟

گلنار

جولائی ۸۰ء کے شروع میں ہوائی جہاز کے ہائی جیک ہو جانے کے باوجود سری نگر سے جموں، چنڈی گڑھ اور دہلی جانے والے مسافروں کی تعداد میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ ایرپورٹ پر بھیڑ پہلے کی طرح ہی تھی۔

ہاں اتنا فرق ضرور پڑ گیا تھا کہ سیکورٹی اسٹاف اب چیکنگ زیادہ سختی سے کرنے لگا تھا۔ بریف کیس کھلوا کر ایک ایک چیز دیکھی جاتی تھی اور میٹل ڈی ٹیکٹر سے مسافروں کے جسم کے ہر حصے کو ٹٹولا جاتا تھا۔

جموں والی فلائیٹ کا اعلان ہو چکا تھا، مسافر چیکنگ کے لیے قطاروں میں کھڑے تھے۔ ایک طرف مرد اور دوسری طرف عورتیں۔ سیکورٹی چیکنگ کے بعد مسافر لاؤنج کی طرف چلے جاتے تھے۔

چیکنگ کے دوران سیکورٹی افسر نے میرا بریف کیس کھلوایا اور اس کی ایک ایک چیز باہر نکال کر میز پر رکھ دی۔ میں ایک تماشائی کی طرح یہ سب دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے اتنے سارے رنگوں کے بال پوائینٹ کیوں رکھے ہیں؟" سیکورٹی افسر نے پوچھا۔

"مجھے رنگوں کا اوبسیشن ہے، اس لیے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا کہ کسی قسم کی ٹینشن پیدا نہ ہو۔

لیکن آپ نے تو رنگوں کی نمائش لگا رکھی ہے، اپنے بریف کیس میں۔"

"اس سے کہیں بڑی نمائش تو میرے ذہن میں ہے۔"

"واٹ از ذہن!"

"سم تھنگ ہیر۔" میں نے اپنے سر کو چھوتے ہوئے جواب دیا۔

میرا جواب سن کر سیکورٹی افسر بھی مسکرا دیا اور پھر اس نے میز پر بکھری تمام چیزیں بریف کیس میں رکھتے ہوئے کہا "آپ تشریف لے جائیں۔"

"شکریہ"

میں اگلے کمرے میں داخل ہو گیا جو پہلے کمرے سے چھوٹا تھا۔ اس کمرے میں سیکورٹی اسٹاف کے ایک کرمچاری نے میرے جسم کو خوب ٹٹولا۔ میرا ٹکٹ دیکھا اور سیٹ کارڈ پر مہر لگا کر مجھے لاؤنج کی طرف جانے کو کہا۔

لاؤنج میں جا کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنا بریف کیس سنبھالا جسے سیکورٹی والوں نے اس طرف دھکیل دیا تھا۔ اور اب میں اپنے اس جلوس کو، جو کچھ دیر پہلے سیکورٹی روم میں دیکھ چکا تھا، دوبارہ دیکھ رہا تھا۔ اس جلوس کو میرے علاوہ کچھ اور لوگ بھی دیکھ رہے تھے، جن میں ایک مہیلا بھی شامل تھی، جس کے ساتھ پانچ چھ برس کی ایک نہایت ہی خوبصورت بچی، اس کی انگلی پکڑے کھڑی تھی اور میرے بریف کیس سے نکلی اِدھر اُدھر بکھری چیزوں کو دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ اسے ہنستا دیکھ کر میں بھی مسکرا دیا اور وہ خوبصورت بچی ماں کی انگلی چھوڑ کر میرے قریب آگئی اور بریف کیس کی بکھری چیزوں کو سمیٹنے میں میری مدد کرنے لگی۔

"آپ کا کیا نام ہے، بیٹی؟"

"گلنار، انکل۔"

"کس نے رکھا ہے یہ نام؟"

"ممی نے۔" اس نے اپنی ماں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

گلنار کی طرح اس کی ماں بھی خوبصورت تھی۔

جب میں نے اپنا بریف کیس سنبھال لیا تو گلنار میری انگلی پکڑ کر کرسیوں کی طرف لے جانے لگی۔ اس کی ماں بھی اس کے ساتھ ہو لی۔ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے اس کی ماں نے کہا۔

"میری بیٹی دوست بنانے میں بڑی ایکسپرٹ ہے۔"

"اپنے فادر پر گئی ہوگی۔" میں نے جواب دیا۔

"جی ہاں۔"

"بڑی ہو کر بہت اچھی پبلک ریلیشنز آفیسر بنے گی۔"
"لگتا ہے، آپ کا تعلق اسی ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔"
"جی۔"
"کہاں رہتے ہیں آپ؟"
"چنڈی گڑھ میں۔"
"بہت خوبصورت شہر ہے۔"
"سب یہی کہتے ہیں۔"
اسی طرح باتیں کرتے ہوئے ہم ہرے رنگ کی تین خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
"گُلنار کو ہرا رنگ بہت پسند ہے۔"
"شاید آپ کو بھی؟"
"تو آپ نے میری ساڑھی سے اندازہ کر لیا؟"
"یہی سمجھئے۔"
میرا جواب سن کر وہ مہلا بہت زور سے ہنسی۔ اس کی ہنسی واقعی دلکش تھی۔ جسے سُننے کے لیے کُرسیوں پر بیٹھے کچھ مسافر بھی اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ وہ ذرا سی جھینپ بھی گئی۔ پھر گُلنار میری انگلی پکڑ کر مجھے واٹر کُولر کی طرف لے گئی۔ اُسے شاید پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے اُسے پانی پلایا اور پھر پانی کا وہی گلاس بھر کر گُلنار کی ممّی کے لیے بھی لے آیا جب میں خالی گلاس رکھنے لگا تو گُلنار اپنی ماں سے بولی۔
"انکل بہت اچھے ہیں ممّی۔"
اُسی لمحہ اناؤنسمینٹ ہوئی کہ مسافر لاؤنج سے نکل کر ہوائی جہاز کی طرف چلے جائیں۔ لاؤنج سے جہاز تک کا فاصلہ ذرا زیادہ تھا۔ اور دُھوپ بھی تیز تھی۔ تھوڑی دُور تک چلنے کے بعد گُلنار تھک گئی۔ میں نے اسے اُٹھا لیا۔ اس کی ماں نے میرا بریف کیس میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔
"دو بوجھ آپ سے نہیں اُٹھیں گے۔"
"ایسا ہی لگتا ہے۔"
میرا جواب سن کر وہ مہلا ایک بار پھر زور سے ہنسی۔ کُھلے واتاورن میں نکھری ہوئی

دُھوپ کی شفاف چادر پر اُس کی ہنسی کے پھُول بکھر گئے۔ لگا کہ ہوائی جہاز کی طرف تیزی سے بڑھنے والے مسافر بھی پھُولوں کی بارش سے شرابور ہو گئے تھے۔

ہوائی جہاز کی سٹیر وے چڑھ کر میں نے گُلنار کو نیچے اُتار دیا۔ جہاز کے اندر، میرا سیٹ کارڈ دیکھ کر ایر ہوسٹیس نے مسکرا کر، بائیں ہاتھ کی دوسری لائن میں کھڑکی سے لگتی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ گُلنار کی ممّی کا کارڈ دیکھ کر اس نے اُسے پہلی لائن میں کھڑکی سے لگتی سیٹ لینے کے لیے کہا۔

"آپ چاہیں تو کسی اور مسافر سے سیٹ بدل لیں۔ ایر ہوسٹیس نے بڑی نمرتا سے سجھاؤ دیا۔ شاید یہ سوچ کر کہ گُلنار اور اس کی ممّی اور میں، ہم تینوں اکٹھے تھے۔

"نیور مائینڈ۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ مہلا اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی اور میں نے اُس سے اپنا بریف کیس لے لیا اور اُس کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور سیٹ کی بیک پر لگے چھوٹے سے ریک میں سے اخبار نکال کر دیکھنے لگا۔ میں اخبار دیکھ ہی رہا تھا کہ گُلنار اپنے ننھے منے پاؤں اپنی ممّی کی گود میں رکھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"میں انکل کے پاس جاؤں گی۔"

میں نے اخبار سے نظر ہٹا کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے میرے پاس آنے کے لیے اپنی چھوٹی چھوٹی بانہیں پھیلا دیں۔ میں نے سیٹ سے ذرا سا اٹھ کر گُلنار کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ بڑے سکون سے میری گود میں بیٹھ گئی۔ اور کھڑکی کے شیشوں سے باہر جھانکنے لگی اور باہر کا منظر دیکھنے میں محو ہو گئی۔

میرے ساتھ والی دو سیٹوں پر ایک بزرگ جوڑا بیٹھ گیا تھا۔ رنگ، چہرے اور بول چال سے دونوں کشمیری پنڈت لگتے تھے۔ گُلنار کی ممّی کی ساتھ والی سیٹوں پر دس بارہ برس کی ایک پنجابی لڑکی اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی تھی وہ جب سے بیٹھی تھی اپنی ماں سے کہہ رہی تھی "میں کھڑکی کے پاس بیٹھوں گی۔" میں نے محسوس کیا کہ لڑکی کی ماں گُلنار کی ممّی کو سجسٹ کر رہی تھی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ والی سیٹ پر شفٹ کر جانے کو کہے اور میں اس کی بیٹی کو اپنی سیٹ دے دوں۔ اُسے بھی شاید وہی غلط فہمی تھی جو کچھ لمحے پہلے ایر ہوسٹس کو ہوئی تھی۔ گُلنار کی ممّی، پیش کی گئی اس تجویز کو سُنتی رہی اور مُسکراتی رہی لیکن اس نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ غلط فہمی تو آخر غلط فہمی ہی تھی۔ لیکن جب اس لڑکی کا اصرار بڑھتا گیا تو گُلنار کی ممّی نے مجھ سے شفٹ ہو جانے کو کہا۔ اور میں نے گُلنار کو اُس کے

حوالے کیا اور اگلی سیٹ پر چلا گیا۔ وہ لڑکی مسکراتی ہوئی اور میرا شکریہ ادا کرتی ہوئی میری سیٹ پر بیٹھ گئی۔

جب میں گلنار کی ممّی کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا تو گلنار پھر میری گود میں آگئی۔ اسی لمحہ ایر ہوسٹیس ہمارے قریب آئی اور مسکرا کر بولی۔

"اِز اِٹ آل رائیٹ ناؤ؟"

"یس،" میں نے بھی اور میرے بائیں ہاتھ بیٹھی اس خاتون نے بھی جواب دیا۔ جس کی بیٹی اب میری سیٹ پر بیٹھ چکی تھی اور اپنی بیلٹ فِکس کر رہی تھی۔

اور پھر ہوائی جہاز نے ٹیک اوف کیا اور ایر ہوسٹیس نے اناؤنس کیا کہ ٹھیک بیس منٹ کے بعد ہم لوگ جموں ایرپورٹ پر اُتریں گے۔ صرف بیس منٹ کا ساتھ تھا ہم سب کا۔

اب پہلی بار گلنار کی ممّی کے اور میرے درمیان ذاتی قسم کی گفتگو شروع ہوئی تھی۔

"آپ جموّں جا رہی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"اور آپ چنڈی گڑھ۔"

"جی نہیں۔ میں بھی جموّں تک ہی جا رہا ہوں۔"

"آپ کیسے جا رہی ہیں جموّں آپ کے پیرینٹس ہیں وہاں؟"

"نہیں۔ میرے ہسبینڈ ہیں۔"

"اچھا۔ کیا کرتے ہیں جموّں میں آپ کے ہسبینڈ؟"

"ہوٹل سنتور کے منیجر ہیں۔ میں مہینے کے دوسرے سنیچر کو یہاں آجاتی ہوں۔"

"آپ کہیں جاب کر رہی ہیں سری نگر میں؟"

"جی ہاں۔ ٹورازم میں۔"

"سنڈے کو واپس جاتی ہیں؟"

"جی ہاں، دوپہر کی فلائیٹ سے۔"

"کیا نام ہے آپ کے ہسبینڈ کا؟"

"راکیش ملہوترہ۔"

"آئی تھنک آئی نو ہم۔ وہ لمبا، خوب صورت نوجوان ہے نا؟"

"جی۔"

"پہلے اے آئی آر میں تھا؟"

"جی۔"

"لڑکیاں اُس کے آگے پیچھے پھرتی تھیں؟"

وہ خاتون خاموش رہی۔

"اب کیا عالم ہے؟"

"اب بھی ویسا ہے۔ اسی وجہ سے میں بہت پریشان بھی رہتی ہوں۔"

"اُسے سمجھاتی نہیں آپ؟"

"بہت سمجھا چکی ہوں۔ سب بیکار ہے۔" پھر کچھ دیر کے لیے گفتگو رک گئی کیوں کہ گلنار مجھ سے کچھ معصوم سے سوال کر رہی تھی اور میں جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ جوابوں میں معصومیت نہیں تھی صرف مصلحت اور اخلاقی تقاضا تھا۔

میں تو ابھی اپنے آپ کو ذہنی طور پر سمیٹ بھی نہیں پایا تھا اور اپنی بیلٹ بھی اَن فکس نہیں کی تھی کہ ایر ہوسٹیس نے اناؤنسمینٹ کر دی "ہم چند لمحوں میں جموں ایرپورٹ پر اُترنے والے ہیں، مسافر مہربانی کر کے بیلٹس فکس کر لیں۔" گلنار کی ممّی نے میری طرف مُسکرا کر دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ ابھی تو ہماری جان پہچان بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ سفر ختم ہونے جا رہا ہے۔ گلنار میری گود میں پڑے پڑے سو گئی تھی۔

جہاز کے رَن وے پر اترنے کے بعد سٹیر وے سے سبھی مسافر اُترنے لگے۔ میں نے سوئی ہوئی گلنار کو کندھے سے لگا لیا اور اس کی ممّی نے میرا بریف کیس اُٹھا لیا۔ ہم سٹیر وے کی طرف بڑھے تو ایر ہوسٹیس نے مسکرا کر نمسکار کیا۔ دہلی جانے والے مسافر جہاز ہی میں بیٹھے رہے۔ صرف وہی مسافر اُتر رہے تھے جنھیں جموں آنا تھا۔ لاؤنج کی طرف جاتے ہوئے مسز ملہوترہ نے پوچھا۔

"آپ جموں میں کہاں ٹھہریں گے؟"

"کسی ہوٹل میں۔"

"تو ہمارے ہوٹل میں کیوں نہیں ٹھہرتے آپ۔ اپنے دوست سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

"ہوٹل سنتور میں رُک جاؤں گا۔ ایک ہی دن تو گذارنا ہے۔"

پھر ہمیں لاؤنج میں بیٹھ کر کچھ دیر اپنے سامان کا انتظار کرنا پڑا۔ گُلنار جاگ گئی تھی، بولی،

"پاپا ہمیں لینے آئے ہیں ممّی؟"

"نہیں۔"

"کیوں نہیں آئے۔"

"انہیں کام ہوگا۔ ہوٹل سے کوئی آدمی آیا ہوگا۔"

لیکن ہوٹل سے بھی کوئی آدمی گُلنار اور اس کی ممّی کو ریسیو کرنے نہیں آیا تھا۔ جب ہم ایرپورٹ کی بلڈنگ سے باہر نکلے تھے تو مسز ملہوترہ نے کچھ دیر رُک کر سڑک پر کھڑی سبھی گاڑیوں کو ایک ایک کر کے دیکھ لیا تھا۔ اور پھر ہم نے ایک ٹیکسی ہائر کر لی۔ گُلنار آرام سے میری گود میں بیٹھ گئی اور تھوڑی دیر بعد ہم ہوٹل سنتور پہنچ گئے۔

ری سیپشن پر کھڑے ہوٹل کے آدمیوں نے فوراً ہی مسز ملہوترہ اور گُلنار کو پہچان لیا۔ دو پورٹروں نے ہمارا سامان بھی اٹھا لیا تھا۔ "ملہوترہ صاحب کہاں ہیں؟"

مسز ملہوترہ نے ری سیپشن کاؤنٹر پر کھڑے آدمی سے پوچھا۔

"وہ تو صبح کی فلائیٹ سے سری نگر گئے ہیں۔"

"کیوں؟"

"کوئی گیسٹ آگئی تھیں۔ انھیں پہلگام تک چھوڑنے گئے ہیں۔"

"کب لوٹیں گے؟"

"جی منڈے کو۔" پھر اس نے پورٹروں سے کہا۔ "میم صاحب کا سامان صاحب کے کمرے میں لے جاؤ۔"

مسز ملہوترہ نے اُسے ٹوکا نہیں۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"وہ نہیں بدلے گا۔"

میں نے خاموشی سے سُن لیا۔ ہوٹل والوں کے سامنے کوئی جواب دینا واجب نہیں تھا کمرہ میں پہونچ کر مسز ملہوترہ کے ضبط کا باندھ ٹوٹ گیا۔ وہ ایک دم رونے لگیں۔

"اِس آدمی نے میری زندگی کو نرک بنا دیا ہے۔"

گُلنار سہم گئی تھی اور مجھ سے پوچھ رہی تھی "انکل، ممی کیوں رو رہی ہیں؟"

"معلوم نہیں، بیٹی۔"

"آپ کو بھی معلوم نہیں؟"

"ہاں۔"

"تو کس کو معلوم ہے؟"

"تمہارے پاپا کو۔"

"پاپا کہاں ہیں؟"

گُلنار نے سوال تو مجھ سے کیا تھا۔ لیکن جواب اس کی ممّی نے دیا۔ بہت غصّے سے ڈانٹتے ہوئے۔

"جہنم میں۔"

جواب سُن کر اور ماں کی بات کا لہجہ دیکھ کر گلنار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ سسکتی ہوئی مجھ سے چمٹ گئی۔

جب بیرا چائے لے کر آیا مسز ملہوترہ، اس وقت تک، باتھ رُوم میں جا کر اپنی آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مار آئی تھی اور چہرہ اچھی طرح صاف کر لیا تھا۔ اپنے بال بھی سنوار لیے تھے اُس نے۔

"ساتھ کا کمرہ خالی ہے؟" اس نے بیرے سے پوچھا۔

"جی، خالی ہے۔"

"تو اسے صاحب کے لیے ٹھیک کر دو۔"

"جی، رسیپشن پر کہہ دیتا ہوں۔"

مسز ملہوترہ نے چائے بنا کر پیالی میری طرف بڑھائی اور پھر گلنار سے پُوچھا۔

"تم کیا لو گی گلنار؟"

"فروٹ جُوس۔"

"گلنار کے لیے فروٹ جُوس لے آؤ۔ کمرہ ٹھیک ہو جائے تو صاحب کا سامان اُدھر رکھ دینا۔ صاحب، ملہوترہ صاحب کے دوست ہیں۔" اس نے بیرے سے کہا۔

پھر اس نے میری طرف مُسکرا کر دیکھا۔

میں جواب میں مُسکرا دیا۔

راکیش ملہوترہ کا اپنی وائف سے یہ رویہ مجھے کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔ من پر ایک قسم کا بوجھ سا پڑ گیا تھا۔ راکیش سے میرا تو خیر کبھی بہت گہرا سمبندھ رہا بھی نہیں تھا۔ تھوڑی بہت جان پہچان رہی تھی اُس سے، جن دنوں وہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب میرا بھی تعلق تھا ریڈیو سے۔ راکیش تو بس کنھیا تھا ریڈیو اسٹیشن کا جس کے گرد کئی رادھائیں گھومتی تھیں۔ وہ جموں کب اور کس طرح پہونچ گیا تھا، مجھے معلوم نہیں تھا۔ شام کو میں اکیلے ہی گھومنے نکل گیا۔ مجھے اکیلے ہی گھومنا پسند ہے۔ کوئی ساتھ ہو تو گھومنے کا لطف نہیں آتا۔ جب سے بلڈ پریشر بائی ہوا ہے شام کو سیر ضرور کرتا ہوں۔ کوشش تو خیر صبح بھی کرتا ہوں، تھوڑی دیر گھومنے کی، لیکن اس میں باقاعدگی نہیں رہتی۔ یوں ہی دریائے توی پر نئے بنے پُل کی طرف نکل گیا تھا۔ پرانا لوہے کا پُل اپنی عمر پوری کر چکا تھا اور اس میں استعمال ہوا لوہا کلکتہ کے کسی بہت بڑے بیوپاری نے واجب سے بہت کم داموں پر خرید لیا تھا۔

ہوٹل واپس آیا تو گلنار نے بڑے غصے سے پوچھا۔ "انکل کہاں چلے گئے تھے آپ؟"

"ذرا گھومنے نکل گیا تھا بیٹی۔"

"مجھے کیوں نہیں ساتھ لے گئے؟"

"خیال نہیں رہا گلنار۔"

"سوری کہئے۔"

"سوری مائی سویٹ گرل۔"

"آگے کے لیے خیال رکھئے۔"

"ضرور رکھوں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اس کے گال تھپتھپا دیئے۔

ڈنر میں نے مسز ملہوترہ کے کمرے ہی میں لیا اور پھر گلنار کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ نہ جانے کیوں اس قدر اٹیچڈ ہو گئی تھی مجھ سے۔ بیرا چار پانچ اخبار میز پر رکھ گیا تھا۔ میں کپڑے بدل کر پلنگ پر لیٹ گیا اور اخبار دیکھنے لگا۔ گلنار بھی میرے ساتھ ہی لیٹ گئی۔ کچھ دیر کے بعد جب میں نے اخبار ایک طرف سرکا کر گلنار کو دیکھا تو وہ سو چکی تھی اور اس کا ننھا سا گورا ہاتھ میرے سینے پر پڑا تھا۔ گھڑی دیکھی ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ سوچا گلنار

کو اس کی ممی کے پاس چھوڑ آؤں۔ رات کو کسی وقت جاگ گئی تو پریشان کرے گی۔ اُسے اپنے کندھے سے لگا کر باہر آیا اور پھر سامنے والے کمرے کے سامنے رُک گیا۔ کمرے میں روشنی تھی لیکن دروازہ بند تھا۔ میں نے بہت دھیمے سے دستک دی لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ ایک بار پھر دستک دی لیکن کوئی ردِّ عمل نہیں تھا۔ دروازے کو ذرا سا دھکیلا تو وہ کھل گیا۔

گلنار کی ممی گہری نیند سو رہی تھی میں نے اسے ڈسٹرب نہ کرتے ہوئے گلنا کو ساتھ والے پلنگ پر لٹا دیا۔ اور اسے چادر اوڑھا دی۔ سوچا کمرے کی روشنی بجھا دوں لیکن بجھائی نہیں۔ شاید وہ لوگ روشنی جلتی ہی رہنے دیا کرتے ہوں رات کو۔ میں نے گہری نیند میں سوئی اس مہیلا کے چہرے کو ایک بار غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ کتنا معصوم اور خوبصورت لگ رہا تھا لیکن اُس کے ذہن میں کتنا شدید تناؤ تھا۔ مجھے لگا جیسے اُس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ جیسے وہ خواب میں کسی سے کچھ کہہ رہی تھی۔

"اِس آدمی نے میری زندگی کو نرک بنا دیا ہے۔"

پھر میں نے دیکھا اُس کے گورے شفاف ماتھے پر ایک دم کچھ شکنیں اُبھر آئی تھیں۔ مجھے لگا جیسے وہ خواب کے کلائمکس پر تھی اور اس کی نیند ٹوٹنے ہی والی تھی اور مجھ میں اُن کھلی آنکھوں کا سامنا کرنے کی تاب نہ تھی۔ میری ہمت ایک دم جواب دے گئی تھی۔ میں فوراً دروازے کی طرف بڑھا اور کمرے سے باہر نکل کر دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

میرے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور بجلی کی تیز روشنی کاریڈار میں پھیل رہی تھی۔ میں نے اچھا ہی کیا تھا کہ گلنار کو اس کی ممی کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ ورنہ وہ رات کو مجھے ضرور پریشان کرتی۔

ڈریم لینڈ

میں کل یہاں آیا تھا۔ بس سے اُترا تو بارش ہو رہی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے بارش ہی میں میرا سامان کمرے میں رکھا تھا۔ بارش اتنی تیز تھی کہ میں سڑک سے ریسٹ ہاؤس تک پہونچنے میں ہی بالکل بھیگ گیا تھا۔ لیکن گرمی کے موسم میں بارش کی بوندیں خوشگوار لگتی ہیں، خصوصاً اسے جو میدانوں کی تپش سے بھاگ کر کسی پہاڑی مقام پر آیا ہو۔ میں نے بال تولیے سے پونچھے۔ چہرے سے پانی کے قطرے صاف کیے اور ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں کھڑا ہو کر سامنے کی پہاڑیوں سے گھٹاؤں کے ریلوں کو گھاٹی میں لہراتے ہوئے دیکھنے لگا۔ کرپال نے ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار کو سب ضروری ہدایتیں دے رکھی تھیں۔ چنانچہ اس نے برآمدے میں آرام کرسی بچھا دی اور تپائی سامنے رکھ دی۔ تپائی پر بچھا ہوا میز پوش گندہ تھا۔ اسے میں نے اٹھا دیا۔

"کل ایک صاحب جو یہاں ٹھہرے تھے، اسے خراب کر گئے ہیں۔ آج دھوبی میز پوش دے جائے گا تو بدل دوں گا۔" چوکیدار نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" میں نے جواب دیا۔

چوکیدار چلا گیا۔ میں نے سگریٹ سُلگایا اور خنک ہوا کے جھونکوں کے راحت بخش لمس کا لُطف لینے لگا۔

یہ ریسٹ ہاؤس اس علاقے کا بہترین ریسٹ ہاؤس سمجھا جاتا ہے۔ ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک الگ سی پہاڑی پر مین سڑک کے کنارے یہ ریسٹ ہاؤس واقعی بڑا خوبصورت ہے۔ میں اس ریسٹ ہاؤس میں پہلی بار ٹھہرا تھا۔ چیل کے درختوں سے گھری ہوئی سرخ رنگ کی عمارت، جس کی ڈھلوان چھت دور ہی سے نظر آجاتی تھی، ہریالی کے اس جنگل میں ایک دلکش

پھول کی طرح دکھائی دیتی تھی، جیسے کسی پہاڑی دوشیزہ نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں میں ایک بڑا سا جنگلی سرخ پھول اُڑس رکھا ہو۔

میں ماحول کی دلکشی میں ڈوبا آرام کرسی میں بیٹھ گیا اور کرسی کی بیک سے پیٹھ ٹیک کر اپنے گیلے کپڑوں کی ہلکی ہلکی ٹھنڈک محسوس کرنے لگا۔ کئی روز کے بعد گھٹا کا یوں کھُل کے برسنا، اور ایک خاموش جگہ پر اکیلے اپنے آپ میں ڈوب جانا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

چوکیدار نے چائے کا سامان میز پر رکھ دیا۔

"اس وقت چائے کی بہت ضرورت تھی مجھے، چوکیدار۔"

"صاحب کہہ گئے تھے چائے میں پلاؤں، شام کو وہ خود آکر باقی انتظام دیکھیں گے" اُس نے کہا۔

"اچھا شکریہ، تم جاؤ چوکیدار۔"

چوکیدار چلا گیا۔ اس وقت کسی کا بھی میری سوچ میں مخل ہونا مجھے اچھا نہ لگ رہا تھا۔ بلکہ میں چاہ رہا تھا کہ کرپال بھی اگر گھنٹہ دو گھنٹہ دیر سے آئے تو بہتر ہو۔

میں نے چائے کی پیالی بنائی۔ تازہ سگریٹ سُلگایا۔ گرم گرم چائے کا لمس لبوں پر محسوس کیا اور اُس کی ہلکی سی مٹھاس کو سگریٹ کے دھوئیں کی کڑواہٹ سے سہلاتے ہوئے سامنے کی گھاٹی کو دیکھنے لگا، جس پر چھائی گھٹاؤں کی تہیں ہلکی ہوتی جا رہی تھیں اور کہیں کہیں کوئی کچا پہاڑی مکان نظر آنے لگا تھا۔ ایسے اوقات جب مجھے بلندی نصیب ہو اور تنہائی کا ماحول ہو اور شہر کی مصنوعی فضا سے الگ کہیں کچھ سمے گذرنے کو مل جائیں تو میں زندگی کی بنیادی قدروں کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں اور پھر جانے کیسے میری ماضی کی کچھ یادیں دبے پاؤں میرے ذہن کی سطح پر چلنے لگتی ہیں اور میری سوچ ایک طویل سفر پر چل نکلتی ہے۔ ایسا سفر جس کی کوئی منزل نہیں۔ جس میں صرف راستے ہی راستے ہیں۔ کہیں کہیں پڑاؤ بھی ہیں، جہاں دن کے اُجالے میں درختوں کی چھاؤں مل جاتی ہے اور جہاں رات کی تاریکی میں ایک آدھ چراغ جل کر ہمت بندھائے رکھتا ہے۔ ایسی گھڑیوں میں مجھے محسوس ہونے لگتا ہے جیسے میں ایک سرکاری دفتر میں کام کرنے والا ایک عام کرمچاری نہیں بلکہ سُقراط جیسا بہت بڑا آدمی ہوں اور زندگی کی تلخیاں ڈر ڈر کر چکھنے کے بجائے زہر کا بھرپور پیالہ ہونٹوں سے لگا کر اُسے ایکدم ختم کر سکتا ہوں۔ زہر کے پیالے پینے والے میرے جیسے کئی اور بھی ہوں گے۔ ایسے اور بھی بہت

سارے لوگ ہیں جو زندگی کا زہر دھیرے دھیرے انجانے میں پیتے رہتے ہیں اور جن کے سینوں میں وہ زہر کینسر بن کر پھیلنے لگتا ہے اور کسی صبح ان کے حصے کے زہر کی مقدار ختم ہو جاتی ہے۔ ان کا پیمانہ بھر جاتا ہے اور وہ اپنے ہونٹوں پر زہر خند کی تلخی کھنڈائے اپنے رشتہ داروں، اپنے دوستوں، اپنے ساتھیوں اور اپنے محبوبوں کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں اور تعلقات کے مارے ہوئے ان کے ساتھی ان کی قبروں پر پھول چڑھاتے ہیں یا ان کی تصویروں کو اپنے مینٹل پیس پر رکھ کر کبھی کبھی انھیں یاد کر لیتے ہیں۔ یہی زندگی ہے۔ یہی ہستی کا سارا پروپیگنڈا ہے۔ یہی انسانی تواریخ کی داستان ہے۔ یہی دنیا بھر کے کلچر اور ادب کی رُوح ہے۔ انسان مر جاتا ہے لیکن اس کی رُوح زندہ رہتی ہے اور کبھی کبھی اپنی چھوڑی ہوئی جگہوں اور الگ ہوئے دوستوں کو تنگ کرتی ہے اور اُس سے محبت کا دام بھرنے والے اسے بھوت پریت کا نام دے کر اُس سے پیچھا چھڑانے کے جتن کرتے رہتے ہیں۔ زندگی کی یہ تصویر کشی دردناک ہے لیکن یہی اِس کی اصلی تصویر ہے۔

وہیں برآمدے میں بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی تھی۔ میں جب اپنی سوچ کے سمندر سے باہر نکلا تو محسوس ہوا جیسے میرے اِرد گرد پھیلی ہوئی ریت کے ذرّے انسانوں کے وہ ارمان تھے جو تشنہ رہ گئے تھے اور اب شام کے دھندلکے میں سمندر کی طرف اپنی پیاس بجھانے کے لیے دوڑ رہے تھے اور تشنہ ارمانوں کے اس ہجوم میں کوئی کسی کو نہیں پہچانتا تھا۔ میں نے آنکھیں جھپکیں، لمحہ بھر کو تو سوچ کا توازن ٹھیک نہ ہوا۔ پھر مجھے اپنے ماحول کا احساس ہوا۔ میں تو ایک پہاڑی ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں بیٹھا تھا جو سمندر سے ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا اور کہیں کوئی ریت کا ذرہ نہ تھا۔ یہاں تو سمندر کی لہروں کی آواز نہیں چیل کے درختوں میں سے سنسناتی ہوئی ہوا کا شور تھا۔ میں نے دیکھا سامنے سے کرپال آرہا تھا۔ گھٹائیں کب کی پہاڑیوں کے دامن میں سو چکی تھیں۔ آسمان نکھر گیا تھا اور دُور بستی کے مکانوں میں روشنیاں جلنے لگی تھیں لیکن ریسٹ ہاؤس کے کمروں میں اندھیرا تھا کیونکہ چوکیدار نے ابھی بجلی نہیں جلائی تھی۔

کِرپال میرا پُرانا دوست ہے۔ بہت پُرانا تو خیر نہیں، اچھا آدمی ہے۔ مجھے اپنے محکمے کے لوگ کچھ زیادہ پسند نہیں۔ وہی عام قسم کے لوگ جو اپنی چھوٹی چھوٹی ذاتی رنجشوں اور کڑواہٹوں کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ جو ایک دوسرے کی چغلی کرتے ہیں۔ ان کی پرائیویٹ زندگی کے بخئے اُدھیڑتے ہیں اور جب آمنے سامنے ہوں تو بناوٹی مُسکراہٹوں سے ایکدوسرے

سے ملتے ہیں۔ کرپال بھی میرے محکمے کا آدمی ہے لیکن ان سے مختلف ہے۔ وہ اپنی ذاتی رنجشوں سے باہر بھی نکل سکتا ہے۔ اور دوست کو دوست سمجھ کر بھی ملتا ہے۔ میں دوسرے چوتھے مہینے ان پہاڑوں کی طرف نکل آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی دو ایک دن کی مہلت لیکر۔ لیکن یہ مہلت بھی کبھی کبھاہی نصیب ہوتی ہے۔ اکثر نہیں۔ کرپال اس سب ڈویژن کا انچارج ہے اس لیے اس کی ڈویژن کے ریسٹ ہاؤس میں ایک آدھ دن گذارنے کا انتظام آسانی سے ہوجاتا ہے۔ جب کبھی میں ادھر آیا ہوں اسی کا مہمان رہا ہوں اور اب بھی اُسی کا مہمان ہوں وہ کافی وقت میرے پاس رہا اور میرے ساتھ کھانا کھا کر اپنے گھر چلا گیا جو ریسٹ ہاؤس سے قریباً ایک میل دور تھا۔ اگلی صبح اتوار تھا۔ اس لیے اُس کے آنے پر اِدھر اُدھر گھومنے کا پروگرام تھا۔

صبح اُٹھ کر ریسٹ ہاؤس کے وسیع احاطے میں نکل آیا۔ اب نظارہ ہی بالکل دوسرا تھا۔ پہاڑیاں جیسے نہا کر دُھل گئی تھیں۔ چیل کے درخت ایکدم تر و تازہ لگ رہے تھے۔ آسمان کی نیلاہٹ بہت ہی گہری ہوگئی تھی۔ چڑھتے سورج کی کرنیں پہاڑیوں کی چوٹیوں کو چھوتی ہوئی دُھوپ کی سیڑھیوں سے اُتر کر اِدھر اُدھر پھیلنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ مجھے لگا جیسے میرے ذہن پر چھایا ہوا کسل بھی قدرے کم ہوگیا تھا۔ اور میری سوچ کے آنگن میں بھی دھوپ پھیل رہی تھی اور میں اپنے آپ میں بڑا ہلکا پھُلکا محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر باہر گھوم کر میں اندر آگیا۔ نہا دھو کر تیار ہوا۔ چوکیدار نے میز پر ناشتہ لگا دیا تھا۔ ناشتہ کر چکنے کے بعد میں برآمدے میں آگیا اور سامنے بستی کے مکانوں کی چھوٹی چھوٹی ٹُکڑیوں کو دیکھتا رہا۔ بستی اسی طرح آبادی کے چھوٹے چھوٹے ٹُکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ڈھوان والی چھتوں کے مکانوں کے یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے دُھوپ میں چمک رہے تھے۔ ایسے ہی کسی جزیرے میں کرپال بھی رہتا تھا اور وہ اس جزیرے سے نکل کر اور اسی جیسے کئی اور جزیروں کو پار کرتے ہوئے میرے پاس آنے والا تھا۔ تاکہ ہم گھُومنے نکل سکیں اور جی چاہے تو کسی جزیرے میں داخل ہوکر کچھ لمحوں کے لیے وہاں کی زندگی کا حصّہ بن جائیں۔

اور پھر کرپال کی جیپ ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوئی اور کرپال مسکراتے ہوئے میری طرف لپکا۔

"ہیلو راجندر، کیا حال ہیں ؟"

"فائن"۔ میں نے جواب دیا۔

"کیا ارادہ ہے؟ یہیں بیٹھیں یا کہیں گھومنے چلیں"

"گھومنا چاہیے"

"دوپہر کا کھانا تمہیں میرے ساتھ کھانا ہے، گھر میں"

"ایز یُو لائک" میں نے کہا۔

"جیپ لے چلیں؟"

"نہیں پیدل چلیں گے، ڈرائیور سے کہہ دو جیپ لے جائے گا"

کِرپال نے ویسے ہی عادتاً ایک چکر ریسٹ ہاؤس کا لگایا۔ منٹ دو منٹ چوکیدار سے بات کی اور پھر ہم دونوں باہر سڑک پر آ گئے۔

"کس طرف چلیں؟" کِرپال نے پوچھا۔

"جدھر تمہارا جی چاہے"

"ہمارے یہاں واٹر سپلائی کا ایک نیا ٹینک بن رہا ہے مکمل ہو گیا تو شہر میں پانی کی قلت مستقل طور پر ختم ہو جائے گی۔ وہ سائیڈ بھی اچھی ہے۔ کچھ نئی کوٹھیاں بنی ہیں، کچھ لوگ اپنے آرچرڈ بھی بنا رہے ہیں۔ کہو تو اُس طرف چلیں"

"ٹھیک ہے"

تنگ سڑک پر چلتے ہوئے ہم نے اپنے اپنے سگریٹ جلائے اور باتیں کرتے ہوئے بڑے مزے کی چال سے چلنے لگے۔

"آجکل کس چھوکری سے رومانس چل رہا ہے؟"

"ان دنوں کنڑکی کا زمانہ ہے" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

"شادی کر لو یار اب"

"کبھی کبھی تو میں بھی اس معاملے پر سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہوں۔ جب ہی توجہ کسی لڑکی پر جمتی ہے اور اسے اس زاویئے سے پرکھنے لگتا ہوں کہ وہ کیسی بیوی ثابت ہو سکتی ہے تبھی کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے کہ معاملہ ایکدم ٹھپ ہو جاتا ہے"

"کوئی اور لڑکی ٹکرا جاتی ہے؟"

"کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے لیکن عام طور سے تو وہ محترمہ جسے میں بیوی کے رُوپ میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگتا ہوں لمحہ بھر میں اپنا کوئی ایسا پہلو اُجاگر کر دیتی ہے کہ میں اُس

سے اگلے روز اس سے ملنا چھوڑ دیتا ہوں۔"

"بیوی کا کیا تصور ہے تمہارے ذہن میں؟"

"جس پر اکثر بیویاں پوری نہیں اُترتیں۔" میں ہنس دیا۔" چھوڑ یار کیا بکھیڑا لے بیٹھا ہے۔"

"تو آجکل تنگی کا زمانہ ہے؟"

"کبھی کبھی عشق بھی کالے بازار کی چیز بن جاتا ہے۔ ڈھونڈنے سے ملتا ہی نہیں کم بخت۔"
میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ایک کار ٹھسا ٹھس لڑکیوں سے بھری قریب سے گزر گئی۔ جیسے میرے دعوے کو جھٹلا رہی ہوں۔

اسی طرح کی لائٹ ٹاک کرتے ہوئے ہم اس علاقے میں پہونچ گئے جہاں کئی نئے بنگلے بنے تھے۔ کچھ پرانے بنگلے پرانے مالکوں کی ملکیت سے نکل کر نئے مالکوں کے پاس آ گئے تھے، جنھوں نے انھیں چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹ کر کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ سڑک کے بائیں طرف دُور تک ایک کھائی سی چلی گئی تھی جہاں ایک پہاڑی نالہ بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ نالے کے اُوپر بنگلوں کی ملحقہ پہاڑی کے حصے میں لوگ سیب کے آرچرڈ ڈی ویلپ کر رہے تھے۔

"اگلے دو تین سال میں یہ ساری گھاٹی خوبصورت آرچرڈز سے بھر جائے گی اور بڑے اچھے سیب پیدا ہوں گے۔"

"سستے بھی ہوں گے کبھی؟"

"نہیں، عام آدمی کے لیے نہیں۔"

"کیا عام آدمی کے لئے کبھی بھی کوئی چیز سستی اور فراواں نہیں ہوگی؟"

"کم سے کم اس نسل کی زندگی میں تو نہیں۔" کرپال نے کہا۔

"اس نسل کے بعد کوئی اور نسل ہوگی کیا"

"ہوگی کیوں نہیں، لیکن اس کی نسبت زیادہ ٹارمینٹیڈ اور کہیں زیادہ سفوکیٹیڈ۔ ایک مائیڈ نسل جو چاند کی ریت پھانکے گی اور ایٹم بموں کی زہریلی گیسوں میں سانس لے گی۔"

"ایمان سے کیا بات کہہ دی ہے تم نے۔" میں نے کرپال کے کندھے کو تھپتھپایا۔

"راجندر، کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ انسان کی موت اس کے اپنے ارتقا کے ہاتھوں ہوگی۔ وہ اپنے ہاتھوں خلا میں بنائی جانے والی سُولیوں پر لٹکے گا اور اس کی لاش گریوٹی کی کھینچا تانی میں نہ زمین پر گر سکے گی نہ کوئی اور سیّارہ ہی اسے اپنی طرف کھینچ سکے گا۔"

مجھے آج محسوس ہوا کہ کرپال بھی کبھی کبھی میری طرح سُقراط بنتا ہوگا اور زہر کے پیالے کو غٹاغٹ پی جاتا ہوگا۔

اور چلتے چلتے میں ایک بنگلے کے لکڑی کے بنے چھوٹے سے گیٹ پر رُک گیا۔ گیٹ کے باہر لکھا تھا "ڈریم لینڈ" میرے ذہن میں جانے کیوں ایک تُندسی جھنجھلاہٹ ہوئی۔ دماغ کی نسیں تن گئیں۔

"ڈریم لینڈ" میں نے غور سے پڑھتے ہوئے کہا۔

"یہاں ایک ریٹائرڈ کرنل رہتا ہے، اپنی بیوی کے ساتھ، جو عمر میں اس سے کم سے کم تیس برس چھوٹی ہے۔ ان لوگوں نے کوئی پانچ برس پہلے یہ بنگلہ بنوایا تھا۔"

"کہاں سے آئے تھے یہ لوگ؟"

"کسی ریاست میں تھے۔ ان کے بارے میں لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔"

"کیسی باتیں؟" مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے دماغ کی نسیں اور بھی زیادہ تن رہی تھیں۔

"یہی کہ کرنل کی بیوی اس کی بیوی نہیں۔ کہیں سے ہتھیائی ہوئی ہے اور کرنل کے پاس جو روپیہ ہے وہ بھی چوری کا ہے۔"

"چوری کا کیسے؟"

"اس کا تعلق کسی گروہ سے تھا۔ یہ لوگ یہاں کسی سے ملنے نہیں جاتے۔ نہ ہی ان سے کوئی ملنے آتا ہے۔ باہر کے لوگ ہی ان کے پاس آتے ہیں اور یہ بھی اکثر باہر جاتے رہتے ہیں۔"

"تم کرنل کو جانتے ہو کیا؟"

"دو ایک بار بنگلے کی ایکسٹینشن کے لیے ڈیزائن بنوانے کے لیے مشورے کے واسطے بلایا تھا اس نے۔ ظالم نے گھر بڑا خوبصورت بنا رکھا ہے۔"

"کیا اس سے ملا جا سکتا ہے؟"

"کہہ نہیں سکتا۔ لیکن تم کیا کرو گے اسے مل کر؟"

"میرے دماغ کی نسیں بہت تن گئی ہیں شاید ڈھیلی پڑ جائیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"مجھے کرنل سے ملوا دو۔"

"آؤ ٹرائی کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر کرپال نے "ڈریم لینڈ" کا گیٹ کھولا اور جب ہم

دونوں اندر داخل ہو گئے تو گیٹ بند کر دیا۔

کرپال آگے تھا اور مَیں اس کے پیچھے کیونکہ راستہ تنگ تھا اور راستے کے دونوں طرف جنگلی پھُولوں کے انبار تھے اور فضا میں ایک عجیب سی بُو رچی ہوئی تھی۔ ہم جب بنگلے کے برآمدے میں پہونچے تو ایک نوجوان لڑکی برآمدے میں رکھی کرسیوں کو جھاڑ رہی تھی۔ غالباً وہ کوئی پہاڑی لڑکی تھی جو اُن کے گھر میں کام کرتی تھی۔

"کرنل صاحب اندر ہیں ؟" کرپال نے اس لڑکی سے دریافت کیا۔

"جی نہیں وہ کچھ دیر پہلے کہیں باہر گئے ہیں۔" لڑکی کے تیکھے اور نرم نقوش کی طرح لہجہ بھی تیکھا لیکن نرم تھا۔

لڑکی کا جواب سن کر کرپال نے میری طرف دیکھا۔

"مسز کرنل گھر میں ہیں ؟" میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"جی ہاں ، آپ بیٹھئے ، میں انھیں بھیجتی ہوں۔" لڑکی نے برآمدے میں پڑی ان کرسیوں کی طرف اشارہ کیا جنھیں وہ جھاڑ چکی تھی اور کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

کچھ لمحوں تک کوئی نہ آیا۔ میں برآمدے میں کھڑے کھڑے باہر ہی سے گھر کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن میرے دماغ کی نسیں اُسی طرح تنی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھُلا اور ہمارے سامنے مسز کرنل کھڑی تھی۔

"ارے انجنیئر صاحب ! آپ تو کئی دنوں کے بعد نظر آئے۔"

"جی بس یوں ہی مصروف رہا۔" کرپال نے جواب دیا۔ میں اس عورت کے سراپا کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"یہ میرے دوست ہیں مسٹر ملہوترہ ، پنجاب میں انجنیئر ہیں۔" مسز کرنل نے ایک بار بڑی توجہ سے مجھے دیکھا۔

"لگتا ہے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔" میں نے ابکی اُسے اور بھی دھیان سے دیکھا۔ انسان کی شخصیت کی کچھ ایک بنیادی چیزیں وقت کے ساتھ بھی نہیں بدلتیں۔ وہ چاہے کتنا بدل جائے۔ اس کے جسم میں کیسی بھی تبدیلیاں رونما ہو جائیں لیکن ایک نہ ایک پہلو ایسا رہ جاتا ہے جو فوراً پہچانا جا سکتا ہے۔

"جی ہاں ، مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔" مسز کرنل نے جب اپنے دماغ پر زور ڈالتے

ہوئے آنکھیں جھپکیں، تو دو گہری نیلی آنکھیں جن میں سرخ ڈورے ہوا کرتے تھے ایکدم میری نگاہوں کے سامنے چمک اُٹھیں۔ بیس برس پہلے کی گرد کی تاریکی میں جیسے کوئی شمع جل اٹھی ہو۔ اچانک اور غیر متوقع طور پر!

"او ماسٹر جی!" اور اس نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔

"کتنا زمانہ گذر گیا۔ ہم دونوں کتنے بدل گئے ہیں۔ ماحول اور حالات کتنے تبدیل ہو گئے ہیں۔" میں نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا جو ایکدم زیادہ نیلی اور زیادہ گہری ہو گئی تھیں اور جن میں ایک عجیب طرح کی چمک اُبھر آئی تھی۔ اس کے بازو کی گرفت بھی مضبوط ہو گئی تھی۔

"انجینئر صاحب میں ان کی سٹوڈنٹ رہی ہوں۔ ہائے کیا زمانہ تھا وہ۔ میں ان پر کتنا ڈیپینڈ کیا کرتی تھی۔ ان دنوں سوائے ان کے میرا کوئی رازدار نہیں تھا۔ کوئی دوست نہیں کوئی ایڈوائزر نہیں۔ ان کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔

آپ اندر آئیے۔ وٹ اے سٹوپڈ لیڈی آئی ایم۔" وہ مسکرائی۔

پھر اس نے دروازہ کھولا اور ڈرائینگ روم میں لے گئی اور میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ میرے دماغ کی نسوں کا تناؤ ویسا ہی تھا۔

"لالہ رُخ!" اس نے آواز لگائی اور وہی پہاڑی لڑکی لمحہ بھر کے بعد کمرے میں آگئی۔

"بہت بڑھیا قسم کی چائے بناؤ۔"

لڑکی چلی گئی۔

"آپ کو یاد ہے میں اپنے نوکروں سے کتنا تنگ تھی اُن دنوں۔ آپ سے میں نے کہا تھا کہ میں کسی خوبصورت لڑکی کو ملازم رکھوں گی اور اسے لالہ رُخ کے نام سے پکارا کروں گی۔

"جی ہاں یاد ہے۔"

"تو اس لڑکی کا اصلی نام لالہ رُخ نہیں۔" کرپال نے پوچھا۔

"اصلی نام تو بے چاری کا کلو ہے لیکن ہمارے اصلی نام کب تک ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ ہم اپنے اصلی ناموں سے چھٹکارا پانے کی ہمیشہ ہی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ماسٹر جی جب مجھے پڑھاتے تھے راجندر ناتھ تھے اب انجنیئر ملہوترہ بن گئے ہیں میں کبھی کمنی دیوی ہوتی تھی، پھر کمنی گپتا بنی، پھر سروج بھاردواج بنی اور اب مسز کرنل ہوں۔ یہ نام میں نے

اپنی مرضی سے ہی بدلا ہے۔ کسی اور کے کہنے سے تو نہیں۔"

"لالہ رُخ نام بہت پیارا ہے۔" کرپال نے کہا۔

"لڑکی کم پیاری ہے کیا؟" وہ ہنس دی۔ اور میں نے محسوس کیا تھا جیسے ایک ساتھ کئی عورتیں ہنسی تھیں۔ رکمنی دیوی، رکمنی گپتا، سروج بھاردواج اور مسز کرنل کی شخصیتیں ہنسی تھیں۔ کئی ماحول، کئی فضائیں۔ کئی لمحے، کئی زمانے ہنسے تھے۔ ایک ہی لمحہ میں ایک ساتھ کتنے لوگ ہنس سکتے ہیں، ایک ہی ہنسی میں۔ کتنے لوگ رو سکتے ہیں ایک ہی آنسو کی نمی میں۔ کتنی آہیں سُلگ اٹھتی ہیں ایک ہی آہ میں۔ ایک انسان کے مرنے یا جینے سے کتنے ہی انسان مر یا جی جاتے ہیں۔

مجھے لگا میرے دماغ کی نسیں ٹُوٹ جائیں گی۔

"آؤ ماسٹر جی آپ کو میں اپنا گھر دکھاؤں۔"

میں صوفے سے اُٹھا۔ کرپال بیٹھا رہا اور اس نے اسے اُٹھنے کو کہا بھی نہیں۔ جیسے وہ ایکدم مجھے دیکھ کر کسی دوسرے شخص کے وجود سے غافل ہو گئی تھی۔ ڈرائنگ رُوم سے نکل کر کھانے والے کمرے کی دیواروں پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے وہ مجھے دوسری طرف کے برآمدے میں لے آئی۔ جس کے سامنے وہ چھوٹی سی خوبصورت گھاٹی تھی جو اوپر سڑک سے نظر آتی تھی اور جس میں بہتے نالے کا پانی چمک رہا تھا۔ گھاٹی کے اوپر پہاڑیوں کا سلسلہ اور چیلوں کے درخت بھلے لگ رہے تھے۔

"یہ تمام پہاڑی وہ آرچرڈ ہے جسے ڈی ویلپ کرنے میں آج کل لگی ہوں۔ سب سے بڑھیا ویرائٹی کے سیب ہیں یہ۔" برآمدے کے سامنے ایک خوبصورت لان تھا جو پھولوں سے بھرا تھا۔ برآمدے میں بیلوں کی اتنی بہتات تھی کہ وہ خوشبوؤں سے بھرا ایک کُنج لگ رہا تھا۔ اُدھر سے گھوم کر وہ مجھے اپنے اسٹڈی رُوم میں لے گئی۔ جو کتابوں سے بھرا تھا۔ ایک طرف ایک بڑی صاف ستھری قیمتی میز تھی جس کے ساتھ لگی کرسی کا زاویہ بدلا ہوا تھا۔ لگتا تھا جب ہم آتے تھے وہ کرسی سے اٹھ کر گئی تھی اور کرسی کے سرکانے سے ہی زاویہ بدلا تھا۔ میز پر ایک اُدھ کھلی کتاب پڑی تھی جس کے ساتھ ایک سرخ رنگ کی پنسل تھی۔

"جیسا آپ نے مجھے بیس برس پہلے کہا تھا میں کتاب کے کسی صفحے کو موڑتی نہیں، نہ ہی کتاب کو اُلٹا رکھتی ہوں۔ جو سطر پسند آتی ہیں اس کے نیچے سرخ لکیر کھینچ دیتی ہوں۔ کتاب

کے پہلے صفحے پر اُوپر والے حصے کے بجائے سب سے نچلے حصّے کے دائیں کونے میں اپنا نام لکھتی ہوں اور جگہ اور تاریخ درج کرتی ہوں جہاں اور جب خریدی تھی یہی کہا کرتے تھے نہ آپ؟ " اس نے میری طرف دیکھا اور پھر بڑی شفقت سے اپنا ہاتھ میرے بالوں پر پھیر دیا۔

" ایسے ہی پھیرا کرتی تھی نا ہاتھ میں آپ کے بالوں پر ؟ "

میں ایکدم خاموش تھا اور اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی گہری نیلی آنکھوں میں نیم گلابی مدھم ڈورے اور سُرخ ہو رہے تھے۔

" اِن کتابوں میں وہ کتابیں بھی موجود ہیں جو آپ نے مجھے دی تھیں اور جن پر آپ نے اپنے ہاتھ سے میرا نام لکھا تھا۔ میں نے ان سب کتابوں پر اپنے نام کے اوپر بعد میں آپ کا نام لکھ ڈالا تھا۔ ان کتابوں پر دو نام ہیں اور دونوں کی تحریریں مختلف ہیں۔ جس کا نام ہے اس کی تحریر نہیں اور جس کی تحریر ہے اس کا نام نہیں"۔ وہ مسکرا دی۔

" لیکن آپ تو ایک دم سیریس ہو گئے ہیں "۔

" نہیں "۔ میں نے مُسکراتے ہوئے کہا " ایسی بات نہیں "۔

پھر وہ مجھے کندھے پر ہاتھ رکھے گیسٹ رُوم میں لے گئی۔ نہایت خوبصورت ڈھنگ سے آراستہ۔

" لیکن آپ کا قیام یہاں نہیں ہوگا۔ یہ مہمانوں کے لیے ہے "۔

" میں مہمان نہیں ہوں کیا ؟ "

" بیس برسوں کے بعد آنے والا مہمان نہیں ہوتا "۔

" تو کیا ہوتا ہے وہ ؟ "

" وہ ایک خدائی نعمت ہوتی ہے ، ایک فرشتہ ہوتا ہے ، ایک خُدا ہوتا ہے "۔

" سروج ! " میں جیسے چیخ اٹھا تھا " تم بیس برس کے بعد بھی اتنی ہی جذباتی ہو "۔

" بُرا لگا تمہیں ؟ "

" کہہ نہیں سکتا "۔

" کیا تمہاری زندگی نے ، تمہارے پروفیشن نے ، تمہارے مسائل نے ، تمہارے جذبات تم سے چھین لیے ہیں ؟ "

" نہیں ، میں نے کسی کو ایسا نہیں کرنے دیا۔ کچھ لوگوں کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی

بھی ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔"

اور پھر وہ مجھے اس کمرے میں سے نکال کر ایک اور کمرے میں لے آئی۔ یہ کرنل کا بیڈ روم تھا جس میں فوجی تمغے، تین چار قسم کی بندوقیں، ایک پریس کی ہوئی پرانی فوجی وردی، تین چار جوڑے پالش کیے ہوئے جوتے اور سامنے دیوار پر ایک شیر کا سٹفڈ سر ٹنگا ہوا تھا۔

مجھے ایکدم بیس برس پہلے کا منظر یاد آگیا۔ جب میں پہلی بار سروج کو پڑھانے گیا تھا۔ وہ زمانہ کرنل کے اقتدار کا زمانہ تھا جس کمرے میں مجھے بٹھایا گیا تھا وہاں بھی سامنے کی دیوار پر شیر کا سٹفڈ سر لکڑی کے فریم سے جوڑا ہوا ٹنگا تھا۔ میں گریجویشن کر چکا تھا لیکن انجینیرنگ میں داخلہ لینے کے لیے روپے نہیں تھے۔ میں نے دو برس ٹیوشن ورک کر کے رقم اکٹھی کر لی تھی۔ سروج سے ملاقات بھی انہی دنوں ہوئی تھی۔ میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تھا تو وہ ایک لڑکی نہیں تھی بھرپور عورت تھی جسے کرنل کہیں سے بیاہ کر لایا تھا۔ اس کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں تھیں لیکن جس شخص نے میرا نام تجویز کیا تھا ٹیوشن کے لیے اس نے میری بے حد تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ کرنل کی بیوی بی اے کا پرائیویٹ امتحان دینا چاہتی تھی، دو برس کے بجائے ایک برس میں۔ فیس معقول تھی میں نے حامی بھر لی تھی لیکن گھر کا فوجی رکھ رکھاؤ دیکھ کر من کچھ بجھ گیا تھا۔ جب میں نے ٹیوشن شروع کی تو مجھے معلوم ہوا کہ سروج کا کہیں بھی آنا جانا نہیں تھا۔ وہ تمام دن گھر ہی میں رہتی تھی۔ اُس لیے اس نے کئی برس کی چھوڑی ہوئی پڑھائی دوبارہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

سروج کی زندگی کی قدریں خاصی اُلجھی ہوئی تھیں۔ وہ شادی کر چکنے کے بعد بھی یہ فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ آیا اُسے ایسا کرنا چاہئے تھا یا نہیں۔ اس کا پہلا خاوند مرے پانچ برس ہو گئے تھے اور اُس نے اس عرصہ کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ کرنل اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے چکا تھا اور اُس نے بھی دوسری شادی کی تھی۔ دونوں کی یہ دوسری شادی تھی۔ کرنل بڑی عیاش قسم کا انسان تھا اور اس کے ساتھ شکی مزاج اتنا تھا کہ گھر کے اردلی پر بھی اعتبار نہ کرتا تھا۔ سروج کو مجھ میں اتنی دلچسپی تھی کہ میرے علاوہ گھر میں اسے کوئی نہیں ملتا تھا اور کہ میں اُس سے ادب کی اور فن کی اور تصویروں کی باتیں کر سکتا تھا اور یہ دلچسپی رفتہ رفتہ دوستی میں بدل گئی اور اُس نے میرے ساتھ زندگی کے کئی اہم مسئلوں پر گفتگو کرنی شروع کر دی اور ایک ایسا وقت آگیا جب میں اس کا ہم نفس، ہمدم اور رازدار بن گیا۔

ایک دن اُس کا طرزِ عمل بڑا عجیب ہو گیا تھا۔ اُس دن اس کا کرنل سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ اُس دن اس نے بیماری کا بہانہ کر کے مجھے باہر سے واپس کر دیا تھا اور میں واپسی پر سائیکل چلاتے ہوئے راستے بھر اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اور پھر میں کئی روز تک اُس کے ہاں نہیں گیا تھا اور پھر ایک روز اس کا اردلی مجھے گھر سے لینے آیا تھا۔ میں جب اس کے گھر پہونچا تو وہ برآمدے میں کھڑی منتظر تھی۔ اردلی میرے لیے گیٹ کھول کر بنگلے کے پچھواڑے میں اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ سروج نے میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ کمرے کا دروازہ کھولا۔ مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا اور پھر کمرے میں آکر مجھے ایکدم گھورنے لگی۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

"کون ہو تم، اور یہاں کیا کرنے آئے ہو؟" میں حیران سا اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"بولتے نہیں، تم کون ہو؟" وہ پھر بولی۔

"مجھے معلوم نہیں"۔ میں نے جواب دیا۔ "میں خود نہیں جانتا کہ میں کون ہوں"

"لیکن میں جانتی ہوں۔ تم وہ شخص ہو جس نے مجھے کئی مہینوں تک بھٹکایا ہے۔ مجھے نیم بیہوشی کی حالت میں اُس ڈریم لینڈ میں دھکیلتے رہے ہو جس کے دروازے باہر سے بند تھے"۔

"نہیں دروازے بالکل بند نہیں تھے۔ تمہاری آنکھیں بند تھیں"۔ میں نے کہا۔

"اور کتنی خوبصورت ہیں تمہاری آنکھیں۔ ان میں سینکڑوں ڈریم لینڈ بکھر رہے ہیں۔ کبھی دیکھا ہے تم نے اپنی آنکھوں کو آئینے میں؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں دیکھا ہے۔ تم اپنی فیس کا حساب کر لو، تم نے پچھلے چار ماہ سے فیس نہیں لی"۔

"مجھے سارا صِلہ مل گیا ہے مسز کرنل"۔ میں یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے دیکھا میز پر میرے نام کا کٹا ہوا، دستخط شدہ بنا رقم بھرے چیک پڑا تھا۔

"رُکو۔ یہ چیک لے جاؤ"۔

"اب نہیں، زندگی میں پھر کبھی مِلا تو لے لوں گا"۔

میں یہ کہہ کر چلا آیا تھا۔ اور وہ برآمدے میں کھڑی مجھے دیکھتی رہی تھی اور جب میں سڑک پر آگیا تھا تو وہ پچھواڑے کی طرف کُھلے ہوئے برآمدے میں کھڑی نظر آئی تھی۔

مجھے سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر اُس نے کہا۔

"شیر کو دیکھ کر ڈر گئے؟ یہ تو سٹفڈ ہے"۔

" اُس دن بھی تو یہ سٹفڈ ہی تھا" میں نے کہا۔

" سو تو تھا ہی " اس نے جواب دیا اور ایک بار پھر ڈرائینگ رُوم سے نکل کر ایک اور کمرے کی طرف مُڑی۔ ڈرائینگ رُوم میں میز پر چائے کا سامان رکھنے کی آواز آرہی تھی۔

" لالہ رُخ چائے لے آئی ہے" میں نے کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھے، وہ جس کمرے میں داخل ہوئی وہ اس کا بیڈ رُوم تھا۔ دیوار سے لگا ہوا ایک ہی پلنگ جس کے بستر پر نہایت ہی خوبصورت بیڈ کوَر بچھا تھا۔ دیواروں پر نہایت خوبصورت تصویریں تھیں سامنے کی کھلی ہوئی کھڑکیوں سے ہمالہ کی برف لدی چوٹیاں نظر آرہی تھیں۔

" یہ ہے میرا ڈریم لینڈ " اس نے کہا اور مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر میرا ماتھا چوم لیا۔

"میرے پرنس چارمنگ، گاڈ بلیس یو "

اور پھر باہر سے آواز آئی۔

" میم صاحب، چائے رکھ دی ہے "

اور پھر وہ بغیر کچھ کہے مجھے بازو سے تھامے ڈرائینگ رُوم میں لے آئی جہاں کرپال بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

چائے پی چکنے کے بعد کرپال نے اور میں نے جانے کی اجازت مانگی۔

" کرنل صاحب آتے ہی ہوں گے، انجینئر صاحب " اس نے مخاطب کرپال کو کیا تھا مجھے نہیں

" پھر کبھی حاضر ہوں گا " یہ کہہ کر کرپال نے دروازہ کھولا، میں بھی باہر آ گیا۔ سروج ہم دونوں کو بنگلے کے باہر والے چھوٹے سے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔ گیٹ سے باہر نکل کر پیچھے بند کرتے ہوئے کرپال نے کہا۔

" آپ نے بنگلے کا نام بڑا خوبصورت رکھا ہے "

" جی " وہ مسکرائی اور پھر ایکدم بنگلے کی طرف پلٹ گئی اور میں نے دیکھا، اُس کی گہری نیلی آنکھوں میں جانے کتنے ہی ڈریم لینڈز کے جلتے ہوئے کھنڈروں کا دھواں سُلگ اُٹھا تھا۔

کرپال اور میں کچھ دیر تک خاموش چلتے رہے جیسے ہمارے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ رہا تھا۔ جوں ہی ہم سڑک کے موڑ پر پہنچے تو میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کر دیکھا ایک پکّی عمر کا شخص ہاتھ میں فوجی چھڑی لیے ڈریم لینڈ کا گیٹ کھول رہا تھا۔

■■

اِس صدی کا آخری گرہن

کومل آنند اور راجیت رندھاوا پریس رُوم میں بیٹھے آج کے اخباروں کی اہم خبروں کے تراشوں کو بھی دیکھ رہے تھے اور آپس میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے ـــ یہ اُن کا روزمرہ کا معمول تھا۔

"اس کا مطلب ہے آج کا سُورج گرہن اس صدی کا آخری مکمل گرہن ہوگا" ـــ اجیت رندھاوا ایک نیوز کلپنگ کو غور سے پڑھنے کے بعد بولا۔

"ہاں اور اگلے ڈیڑھ سو سال تک ایسا گرہن لگے گا بھی نہیں۔" کومل آنند نے جواب دیا۔

"تو اس گرہن کو تو ہمارے پڑپوتے ہی دیکھ پائیں گے۔"

"اگر کبھی پڑپوتوں کے وجود میں آنے کا سانحہ دنیا پر گذرا، تبھی تو۔"

"تمہارا خیال ہے ہمارے پوتے، بے اولاد ہی رہ جائیں گے؟"

"صرف پوتے ہی نہیں، ہمارے بیٹے بھی بے اولاد ہی رہیں گے۔" کومل آنند نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ خود ہمارا ونش بھی ہمارے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔"

"آثار تو ایسے ہی ہیں۔"

"دیکھو تمہیں تو صرف اپنی ماں ہی کو راضی کرنا ہے۔"

"اور تمہیں؟"

"مجھے اپنی ماں اور اپنے باپ دونوں کو۔"

"میں تو اپنی وِدھوا ماں کو کسی نہ کسی طرح منالوں گی لیکن تمہارے سہاگ زدہ ماں باپ کبھی راضی نہیں ہوں گے۔"

"وہ اپنی ذات برادری سے باہر نہیں جانا چاہتے۔"

"یہ بات تمہیں مجھ پر ڈورے ڈالنے سے پہلے سوچنی چاہئے تھی۔"

"تو اب کیا کروں؟"

"شام ہوتے ہی اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہو جاؤ اور دوربین لے کر سورج گرہن کو دیکھنے کی کوشش کرتے رہو، جو ہندوستان کے کسی حصے میں بھی نظر نہیں آئے گا۔"

"مگر کیا کیا جائے؟"

"کینٹین کا چھوکرا چائے لیکر آرہا ہے۔ چائے پیو اور شادی وادی کا چکر چھوڑ دو۔"

یہ کہہ کر کومل آنند ہنسی اور کینٹین کے چھوکرے سے چائے کے دو گلاس لے لیے۔ ایک اپنے سامنے رکھ لیا اور دوسرا جیت رندھاوا کے سامنے سرکا دیا۔ اسی لمحے کئی دوسرے رپورٹر بھی پریس روم میں داخل ہوئے۔ سب نے ایک دوسرے کو وش کیا اور چائے کے ساتھ ساتھ اپنا اپنا بھاشن بھی جھاڑنے لگے۔ جیسا کہ پریس رپورٹرز اکثر کرتے ہیں۔

الگ الگ موضوعات پر بات کرنے کے بعد سب نے ایک ہی مسئلے پر بات کرنا شروع کر دی اور وہ تھا آج کا سورج گرہن

ہزاروں کی تعداد میں سائنس داں اور گرہن کا نظارہ کرنے والے لوگ ہوائی اور میکسیکو میں جمع ہو رہے تھے۔ یہ سورج گرہن سب سے طویل وقفے کا گرہن ہوگا اور اس کے راستے کی چوڑائی ۲۵۶ کلومیٹر اور لمبائی ۹۹۶ ۱۴۰ کلومیٹر ہوگی، جہاں سے گرہن نظر آئے گا۔ انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق گرہن رات کو دس بجکر اٹھاون منٹ سے لے کر گیارہ بجکر دو منٹ تک سورج کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لے گا۔ اور چار منٹوں تک دن پوری طرح رات میں بدل جائیگا۔ امریکہ اور جنوبی کناڈا میں گرہن کا صرف کچھ ہی حصہ نظر آئے گا۔ البتہ کیلیفورنیا کے کچھ حصے میں سورج گرہن کی مدت سات منٹ تک ہوگی۔ یعنی کیلیفورنیا میں گیارہ جولائی ۱۹۹۰ء کی صبح سات منٹوں کے لیے پھر پورہ رات میں تبدیل ہو جائے گی۔

سب رپورٹرز کو اس بات کا افسوس تھا کہ وہ اس صدی کے اتنے بڑے آسمانی سانحے کو نہ دیکھ سکیں گے اور جب اگلی صدی کے نصف میں کبھی یہ سانحہ پیش آئے گا تو اس وقت تک ان کی جگہ ان کی تیسری نسل آجائے گی اور پھر جب تک شاید ایسے آسمانی سانحوں کی نوعیت ہی بدل گئی ہوگی۔ ہوسکتا ہے اگلے گرہن کو دیکھنے کے لیے سائنس داں بجائے دنیا کے

کسی حصّے میں جانے کے کسی سیارے کی سطح پر کھڑے ہو کر اس حیران کن نظارے کو دیکھیں اور اس کی نئی نئی تھیوریاں پیش کریں۔

پھر کومل آنند اور اجیت رندھاوا اپنے اخبار کی نئی تعمیر ہوئی عمارت سے باہر نکلے۔ اپنے اپنے کیمرے کندھے پر فٹ کیے اور اسکوٹر اسٹینڈ کی طرف چل دیئے۔ دونوں نے اپنا اپنا اسکوٹر نکالا اور انہیں اسٹارٹ کرنے سے پہلے چند لمحوں کے لیے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

"آج وِشو جن سنکھیا دِوس کا فنکشن بھی تو ہے۔"

"ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ والوں کا نا؟"

کومل آنند نے پوچھا۔

"ہاں۔ شام کو ساڑھے تین بجے، چلو گی؟"

"ڈی پینڈز۔"

"ڈی پینڈز اون وٹ؟"

"تمہارے پیرینٹس کی رضامندی پر۔"

"مگر فنکشن میں جانے کے لیے اس کی کیا ضرورت ہے"؟

"یہ فنکشن جن سنکھیا کا ہے۔ اور جن سنکھیا کا سمبندھ ہم سے ہے۔"

"میں سمجھا نہیں تمہاری بات۔"

"دیکھو بات یہ ہے اجیت، میری مدر پر دباؤ پڑ رہا ہے کہ میں شادی کے لیے رضامندی کا اظہار کر دوں۔ میں صرف تمہاری وجہ سے فیصلہ نہیں کر پا رہی ہوں۔"

"اس کا فیصلہ ہونا آج ہی ضروری ہے کیا؟"

"ہاں۔ کیوں کہ کل وہ لوگ آنے والے ہیں۔"

"تمہاری مدر کا کیا خیال ہے میرے بارے میں؟"

"یہ میری ذمے داری ہے۔ تم اپنے پیرینٹس کی بات کرو۔"

"آج ہی؟"

"ہاں۔ فنکشن سے پہلے۔ وہیں ملیں گے۔ بائی۔"

یہ کہہ کر کومل آنند نے اپنا اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور گیٹ سے باہر نکل گئی۔

اجیت رندھاوا اسکوٹر کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے کچھ لمحے وہیں کھڑا رہا۔ ایک عجیب سے

دوراہے پر چھوڑ گئی تھی کومل اُسے۔ سوچنے کی طاقت ہی ختم ہو گئی تھی جیسے۔ دو گھنٹوں میں وہ اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتا تھا۔ اُس کے ماں باپ تو کبھی نہیں مانیں گے۔ ماں تو شاید مان بھی جائے لیکن ڈیڈی تو بڑے ضدی قسم کے آدمی تھے۔ وہ کسی بھی صورت میں فیصلہ اُس کے حق میں نہیں دیں گے۔ خود وہ اتنا بولڈ نہیں تھا کہ اپنے ماں باپ کی رضامندی کے بغیر کومل آنند سے شادی کر لے۔

یہاں کھڑا رہنا بھی اُسے مناسب نہ لگا۔ چنانچہ اُس نے اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور گیٹ سے باہر نکل کر سڑک پر آگیا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس وقت وہ کہاں جائے۔ گھر جانے کی کوئی تک نہیں تھی۔ اس وقت اپنے ماں باپ سے شادی کے مسئلے پر بات کرنے کا کوئی لاجک نہیں تھا۔ چنانچہ وہ کچھ دیر صرف اس لیے سڑکوں پر گھومتا رہا کہ وہ سوچ سکے کہ تین بجے سے پہلے کا سمے وہ کہاں گذارے۔ پھر خیال کی کسی رو کے تحت وہ نزدیک کے بیئر بار میں پہونچ گیا۔ اُس وقت بار میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ وہ کونے کی ایک الگ سی میز پر بیٹھ گیا اور بیئر پینے لگا۔ ٹھنڈی بیئر سے اُسے بہت راحت ملی۔ اُس نے اپنے اور کومل آنند کے بارے میں گہرائی سے سوچنا شروع کیا۔ کومل آنند نے تو اپنا فیصلہ اُسے بتا دیا تھا۔ فیصلہ تو اب اُسے کرنا تھا کومل آنند کو نہیں۔ اُس کے پاس وقت اتنا کم تھا کہ وہ کسی دوسرے کی مدد بھی نہیں لے سکتا تھا۔

کوئی دوسرا اِس معاملے میں اُس کی کیا مدد کر سکتا تھا؟ بیئر کی ایک بوتل کے بعد اُس نے دوسری بوتل منگوائی۔ لگاتار کئی سگریٹ بھی پھونکے۔ اگر ایک لڑکی بنا کسی کی مدد کے اپنا فیصلہ خود کر سکتی ہے تو کیا وہ اتنا گیا گذرا تھا کہ خود کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ بہت دیر تک وہ اپنے آپ سے سنگھرش کرتا رہا اور جب وہ کاؤنٹر نریل کی رقم ادا کرکے بار سے باہر نکلا تو گرم ہوا کا ایک ریلا اُس کے ماتھے سے آ ٹکرایا۔ اُس نے رومال سے اپنا ماتھا اور چہرا پونچھا اور اسکوٹر اسٹینڈ کی طرف چل دیا۔ اُس نے بغیر کسی دوسرے شخص کی مدد کے اپنا فیصلہ کر لیا تھا۔

ابھی فنکشن شروع ہونے میں کچھ وقت تھا۔

کومل آنند اجیت رندھاوا سے پہلے پہونچ گئی تھی اور اپنے جاننے والے کچھ لوگوں سے گفتگو کر رہی تھی۔ اسی لمحے سیلیتھ ڈیپارٹمنٹ کی ڈائرکٹر ڈاکٹر رنجنا اگروال کی سفید ایمبسیڈر رُکی۔ رنجنا اگروال نے کار سے باہر نکلتے ہی کومل آنند کو ہیلو کیا اور ایک آدھ منٹ کے لیے اس کے

پاس رُکی تھی۔ وہ اس وقت بڑی ہی خوبصورت اور گریس فُل لگ رہی تھی۔ کومل کو ڈاکٹر رنجنا اگروال بہت اچھی لگتی تھی۔ اُسے بھی کومل کی تحریریں پسند تھیں۔ وہ عام پریس رپوٹرز سے بہت مختلف تھی۔ ڈاکٹر رنجنا اگروال ہال کے اندر چلی گئی۔

اجیت رندھاوا ابھی تک نہیں آیا تھا۔

پھر کومل آنند فنکشن میں آنے والوں کا جائزہ لینے لگی۔ سرکاری فنکشنوں کا ایک ہی طرح کا پیٹرن ہوتا ہے۔ کچھ سرکاری افسر کچھ اُس محکمے کے کرمچاری جس محکمے کا فنکشن ہو، کچھ سیاسی لوگ۔ کچھ اُس کیٹیگری کے لوگوں کے نمائندے، جس کیٹیگری سے وہ محکمہ جُڑا ہو۔ اور کچھ ایسے لوگ جن کی فنکشن سے واقعی دلچسپی ہو۔ ایسے لوگ ہمیشہ ہی بہت کم گنتی میں ہوتے ہیں۔ اس فنکشن کا پیٹرن بھی لگ بھگ ویسا ہی تھا۔

جبھی ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کی تین چار بسیں ایک ساتھ رُکیں اور اُن میں سے پیپر کالونیوں اور جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والی عورتیں باہر نکلیں۔ ایک ہی جیسے رنگ رُوپ اور لباس والی عورتیں۔ جن کی پرانی خریدی ساڑیوں کے پھیکے پڑے رنگوں کی طرح ان کے چہروں کے رنگ بھی بہت پھیکے تھے۔ یہ وہ عورتیں تھیں جن میں خون کی کمی تھی اور جن کے لیے ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ والے یُونی سیف کے ساتھ مل کر انیمیا کنٹرول اور امیونائیزیشن کے پروگرام اکثر آرگنائز کرتے رہتے تھے۔ جن میں وہ ان عورتوں کو بڑے خوبصورت چھپے ہوئے پمفلٹ اور بروشر پلاسٹک کورز میں تقسیم کرتے تھے، جن کا ایک لفظ بھی وہ عورتیں نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ ایسے پروگراموں کے بعد ان عورتوں کو بہت اچھا ریفریشمنٹ دیا جاتا تھا اور پھر انہیں اُن ہی گاڑیوں میں اپنے اپنے گھروں میں چھوڑا جاتا تھا جہاں سے فنکشن میں حصہ لینے کے لیے انہیں اکھٹا کیا جاتا تھا۔

جب یہ مانگے پر اکھٹی ہوگئیں عورتیں گاڑیوں سے اُتر کر حال کی طرف بڑھنے لگیں تو کومل آنند نے اپنے کیمرے سے ان کی کئی تصویریں اُتار لیں۔

اُس نے آخری تصویر لے کر کیمرہ کندھے سے لٹکایا ہی تھا کہ اجیت رندھاوا اس کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔

"ان تصویروں کے بہت اچھے رزلٹ نکلیں گے۔"

"تم یہ بتاؤ کہ تمہارے رزلٹ کا کیا ہوا؟"

" امتحان کی فیس پوری نہیں بھری تھی۔ رزلٹ لیٹر اون ہے۔"
" مجھے معلوم تھا۔ یہی ہوگا۔ تم بہت بودے آدمی ہو۔"
" مجھے اب پیرنٹیس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنا فیصلہ خود کر لیا ہے۔"
" واہ رے میرے رستم۔ کیا فیصلہ کیا ہے؟"
" میں اس سنڈے کو تم سے شادی کر رہا ہوں۔"
" پھر۔"
" پھر اپنے پیرنیٹس کو چھوڑ دوں گا اور الگ مکان میں رہوں گا۔"
" میرا کیا ہوگا؟"
" تم میرے ساتھ رہوگی۔"
" اگر مجھے یہ منظور نہ ہو؟"
" تو جہنم میں جاؤ۔" اجیت رندھاوا کے چہرے پر واقعی ایک ایسا تاثر تھا جسے کومل آنند نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ مگر وہ تاثر اسے اچھا لگا۔

پھر وہ دونوں ہال کے اندر آ گئے اور پریس والوں کی ریزروڈ سیٹوں پر اگلی قطار میں ساتھ ساتھ دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دونوں ایک دم خاموش تھے۔ گفتگو ایک دم رک گئی تھی البتہ سوچ کا عمل جاری تھا۔

کچھ ابتدائی کارروائی کے بعد فنکشن شروع ہو گیا۔

لیبر کالونیز اور جھگی جھونپڑیوں سے آئی عورتیں ہال میں ایک طرف بیٹھی سامعین سے بالکل الگ کٹی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ جیسے اس تمام فضا کا ایک حصہ ہوتے ہوئے بھی ان عورتوں کی الگ شناخت تھی۔ جیسے ہر عورت کے ماتھے پر اس کی تقدیر لکھی ہو۔ اس لکھاوٹ کو پڑھ کر ہر کوئی اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ عورتیں جہالت کا سمبل تھیں اور وہی سمبل ان کی شناخت بن چکا تھا۔

ڈاکٹر رنجنا اگروال موضوع پر بولتے ہوئے سامعین پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہندوستان میں لگاتار بڑھتی ہوئی آبادی ملک کے لیے ایک بہت بڑا پرکوپ تھا۔ اس پرکوپ سے مکتی حاصل کرنے کے لیے ایک مضبوط ارادے اور طاقتور سنگھرش کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنی بات کو مزید واضح کرنے کے لیے آبادی کے تازہ ترین اعداد و شمار

کا بھی بڑے زوردار انداز میں ذکر کیا۔ ڈاکٹر رنجنا اگروال نے بتایا کہ جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا تھا ہماری کل آبادی صرف چونتیس کروڑ تھی۔ ۱۹۹۱ء میں ہماری آبادی چوراسی کروڑ سے زیادہ ہو گئی ہے اور جب ہمارا ملک اکیسویں صدی میں داخل ہوگا تو یہ آبادی بڑھ کر ایک سو کروڑ ہو جائیگی اور اس کے صرف پینتیس سال بعد یعنی ۲۰۳۵ میں ہندوستان کی آبادی دو سو کروڑ ہو جائے گی۔ اس نے اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ہندوستان کے حصے میں ساری دنیا کی زمین کا صرف ۴ فی صد حصہ آیا ہے۔ اور اس چھوٹے سے حصے میں تمام دنیا کی آبادی کا پندرہ فیصد حصہ بستا ہے۔ ہندوستان کی زمین تو ایک انچ بھی اور نہیں بڑھ سکے گی لیکن ہماری آبادی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔
جب ڈاکٹر رنجنا اگروال نے بتایا کہ جتنی دیر میں یہ فنکشن ختم ہوگا ہندوستان میں چھ ہزار بچے جنم لے چکے ہوں گے۔ کیوں کہ ہر منٹ میں اکتیس بچوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے تو جھُگی جھونپڑیوں سے آئی ہوئی عورتوں کے ہجوم میں ایک عجیب طرح کی ہل چل ہونے لگی۔ یہ احساس کی رمق کا پہلا ارتعاش تھا۔

ڈاکٹر رنجنا اگروال نے اپنا کلیدی ایڈریس ختم کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح آج کا سُورج گرہن اس صدی کا آخری سُورج گرہن ہوگا اُسی طرح ہندوستان کی ہر لمحہ بڑھتی ہوئی آبادی بھی اس صدی کا آخری گرہن ہے۔ اگر ملک کے سورج کو آبادی کے گرہن سے بچانے کے لیے وار لیول پر اقدامات نہ کیے گئے تو اگلے سُورج گرہن تک ہندوستان کے آسمان کو آبادی کا گرہن پوری طرح نِگل چُکا ہوگا اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے گا۔ انسانی زندگی کے بچاؤ کے سبھی امکانات ختم ہو چکے ہوں گے۔ بقا کے لیے آخری کوشش کی ضرورت تھی۔

جب ڈاکٹر رنجنا اگروال مائیک سے ہٹ کر اپنی کرسی کی طرف بڑھی تو ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ سب سے زیادہ زور کی تالیاں اسی طرف سے تھیں جہاں اپنی اپنی الگ شناخت لیے پسماندہ طبقے کی عورتیں بیٹھی تھیں۔

کچھ تقریریں اور ہوئیں اور پھر سامعین میں سے کچھ لوگوں کو بولنے کے لیے کہا گیا۔ آخری تقریر کومل آنند کی تھی۔ کومل آنند کی تقریر بیحد مختصر تھی۔ اُس نے کہا۔

"میں ڈاکٹر رنجنا اگروال کی تقریر سے بیحد متاثر ہوئی ہوں۔ میں بھی اس بات پر زور دیتی ہوں کہ بڑھتی ہوئی آبادی کا پرکوپ ہندوستان کی سلامتی کے لیے اس صدی کا آخری گرہن ہوگا۔
میں اس موقع پر پرتگیا کرتی ہوں کہ اس صدی کے ختم ہونے تک کسی بچے کو جنم

نہیں دوں گی۔"

تقریر کے درمیان میں ہی پریس رپوٹرز میں سے ایک نے ٹوک دیا۔

"ابھی تو نو سال پڑے ہیں، اس صدی کے ختم ہونے پر۔"

"اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ہی میں نے اپنی پرتگیا کی ہے۔" کومل آنند نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اور ایک ہلکا سا قہقہہ فضا میں لہرا گیا۔

اپنی الگ شناخت والے ہجوم میں سے ایک پتلی سی سانولی عورت نے اٹھ کر کہا۔

"لیکن یہ فیصلہ تو ہمارے سماج میں مرد کرتے ہیں۔ عورتوں سے کون پوچھتا ہے۔"

"یہ فیصلہ میرا مرد نہیں کرے گا میں کروں گی۔"

"اور اگر آپ کا مرد نہیں مانا؟"

"تو میں اُسے طلاق دے دوں گی۔"

ہال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ تالیوں کا زور اب کی بار بھی ان عورتوں کے ہجوم سے تھا جنھیں خاص طور پر اس فنکشن میں شریک ہونے کے لیے ان کے گھروں سے لایا گیا تھا۔

تالیوں کے اس شور میں کومل آنند، اسٹیج سے اُتر کر اپنی خالی کرسی کی طرف بڑھی۔ کرسی پر بیٹھتے ہوتے اُس نے دیکھا اجیت رندھاوا کا ماتھا پسینے کے قطروں سے شرابور تھا۔

"اپنا پسینہ پونچھ لو۔" اس نے مسکرا کر اجیت رندھاوا کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کہا۔ اُن کے پیچھے بیٹھا ہوا رپوٹر ہنس دیا۔ شاید اُس نے کومل آنند کی بات سُن لی تھی۔

اگلے دن کے اُسی اخبار کے پہلے صفحے پر، جس کی کومل آنند رپوٹر تھی، کومل آنند کی ہی تصویر چھپی تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

"اِس صدی کے آخری گرہن کی ساکھشی۔"

مالابار کی شہزادی

وہ شاید آخری ڈیلیگیٹ تھا جو کانفرنس میں شرکت کے لیے پہنچا تھا۔ کانفرنس کا افتتاح دس بجے تھا اور وہ ساڑھے نو بجے تو گیسٹ ہاؤس میں ہی پہنچا تھا۔ یونیورسٹی میں ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ نے ڈیپارٹمنٹ کی سبھی لڑکیوں کے ذمے کوئی نہ کوئی ڈیوٹی لگا رکھی تھی۔ لڑکیوں کے مختلف گروپ مختلف کاموں پر مامور تھے۔ ہمارے گروپ کی پانچ لڑکیوں کی ڈیوٹی اس گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے والے ڈیلی گیٹس کو کانفرنس کے دوران سہولیات بہم پہنچانے کی تھی۔ اس کی ٹیکسی جب گیسٹ ہاؤس کے پورچ میں رُکی تو اُس وقت میں ہی گیٹ پر موجود تھی۔ میں نے ہی ٹیکسی سے اُس کا سامان نکلوایا اور گیسٹ ہاؤس کے چوکیدار سے کہا کہ وہ سامان کو کمرہ نمبر سات میں لے جائے جو دوسرے فلور پر تھا۔

"سر، آپ کمرہ نمبر سات میں ٹھہریں گے"

اس نے کوئی جواب نہ دیا، صرف مسکرایا، اور میں اسے دوسرے فلور پر لے جانے کے لیے اُس کے ساتھ ہولی۔

اس گیسٹ ہاؤس میں جو پندرہ ڈیلی گیٹ ٹھہرے ہوئے تھے وہ سب کانفرنس کے پنڈال کی طرف جا چکے تھے تاکہ رجسٹریشن آفس سے کانفرنس کی فائلیں لے لیں۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"کانفرنس کے افتتاح کا کیا ٹائم ہے؟"

" سر! دس بجے "

" بہت ہی کم ٹائم رہ گیا ہے "

" آپ جلدی تیار ہو جائیے "

" ناشتے کا کیا انتظام ہے ؟ "

" بریک فاسٹ تو اولڈ ہوسٹل میں ہے "

" یہاں نہیں ؟ "

" سر! نہیں "

" یا تو بریک فاسٹ مِس کرنا پڑے گا - یا اِن اگوریشن ۔ دونوں کام نہیں ہو پائیں گے "

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا - لگا جیسے وہ کچھ پریشان ہے -

" چائے مل سکتی ہے "

" ہوسٹل سے منگوانا پڑے گی سر "

" تو ہمیں گیسٹ ہاؤس کی بجائے ہوسٹل میں ہی کیوں نہیں ٹھہرا دیا ؟ "

" سر! گیسٹ ہاؤس کے بیرہ لوگوں کی ڈیوٹی ہوسٹل ہی میں لگا دی گئی ہے "

" ٹو ہیل وِتھ یور ہوسٹل ؟ "

" اولڈ ہوسٹل سر "

" مے بی اولڈ آر اِیون ینگ " یہ جواب دیتے ہوئے وہ مسکرا دیا -

چوکیدار نے اس کا سامان کمرے کے اندر رکھ دیا تھا -

" سامان ٹھیک ہے سر ؟ "

وہ جواب دینے کی بجائے کھُلی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا جہاں سے یونیورسٹی کے سامنے بے شمار اونچے اونچے ناریل کے درختوں کا گھنا جنگل تھا اور اُس کے پیچھے دور تک پھیلا ہوا سمندر تھا - اور اُس کی حدوں کو چھوتا ہوا گہرا نیلا آکاش تھا -

" اے بیوٹی فل سائٹ !" اُس نے ایک گہرا لمبا سانس لیتے ہوئے پلٹ کر میری طرف دیکھا - میں مسکرا دی

"تمہارا نام ؟"

"ماتل پُو"

"وہاٹ اِز ماتل پُو ؟"

"اے فلاور ، سَر"

"اے فریش فلاور فرام مالابار"

میں اس کے اس ریمارک پر بلش کر گئی ۔

"میں اب جلدی سے تیار ہو جاؤں"

"یس سَر !"

میں کمرے سے باہر آگئی اور میرے ساتھ چوکیدار بھی آگیا ۔

جانے کیوں میں نے سوچا کہ اُس کے لیے کم سے کم گرم چائے کی ایک پیالی کا تو انتظام کرنا ہی چاہیے ۔ میرے گروپ کی سبھی لڑکیاں کانفرنس ہال میں جا چکی تھیں ۔ اگر وہ پانچ منٹ دیر سے آتا تو میں بھی جا چکی ہوتی ۔ اگر گیسٹ ہاؤس میں کوئی بھی نہ ہوتا تو بیچارے کو کتنی پریشانی ہوتی ۔ وہ کتنی دور سے آیا تھا ۔ چنڈی گڑھ سے جو یہاں سے ایک ہزار میل سے بھی زیادہ دُور تھا ، اور یہاں اُسے چائے کی ایک پیالی بھی نہ مل سکتی تھی ۔ ناشتہ تو خیر اب وہ نہیں کر سکے گا ، اتنا وقت ہی کہاں تھا ۔ میں خود ہی اولڈ ہوسٹل میں گئی ۔ اسی ہوسٹل میں میرا اپنا کمرہ تھا جس میں اب میرے گروپ کی ساری لڑکیوں نے اپنا اپنا سامان ڈال کر اسے کباڑ خانہ بنا ڈالا تھا ۔ میں نے اپنا کمرہ کھولا ۔ اُس میں سے تھرماس نکالا ، ہوسٹل کے کچن سے چائے کی دو پیالیاں بنوا کر اُس میں ڈالیں اور پھر ایکدم گیسٹ ہاؤس کی طرف لپکی گھڑی دیکھی دس بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے ۔ جب تک میں پہنچوں گی وہ تیار ہو کر کانفرنس ہال میں جا رہا ہوگا اور وہی ہوا ۔

میں جب چائے کا تھرماس لیے اس کے کمرے کے سامنے پہنچی تو کمرے کا دروازہ بند تھا اور کُنڈی میں تالا لٹک رہا تھا مجھے بیحد افسوس ہوا ۔ لگا جیسے اُس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ میں اس کے لیے اولڈ ہوسٹل سے چائے لینے

گئی تھی۔ اور پھر تالے کو دیکھ کر تو مجھے ہنسی آگئی۔ کنڈی میں تالا پڑا تھا لیکن وہ اسے شاید لگانا بھول گیا تھا۔ تالا کھلا ہی لٹک رہا تھا۔ میں نے کنڈی کھولی اور کمرے کے اندر آگئی۔ سامان اس طرح بکھرا پڑا تھا جیسے ایمرجنسی کے دوران کوئی ریڈ کر گیا ہو۔ کوئی چیز کہیں، کوئی کہیں۔ شیو کا سامان بھی ان دھلا واش بیسن کی ایک طرف پڑا تھا۔ گیلا تولیہ کرسی کے بازو سے لٹک رہا تھا۔ کریم کی شیشی کھلی پڑی تھی۔ ٹیلکم پاؤڈر ساری میز پر بکھرا پڑا تھا۔ دیر سے آکر وقت سے پہلے کسی جگہ پہنچنے کی کوشش میں کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ میں یہی سوچتی رہی اور تھرماس کو میز پر رکھ کر کھلی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ جبھی مردنگم کی آواز پر ملیالی نغمے کی گونج فضا میں لہرائی۔ کانفرنس کا افتتاح ہو چکا تھا۔ میں نے کمرے میں بکھرے ہوئے سامان کو ترتیب سے رکھا۔ شیو کا سامان دھو کر تولیے سے پونچھا اور گیلے تولیے کو کرسی کے بازو سے اٹھا کر باتھ روم میں پڑے ہینگر پر ڈال دیا اور پھر کمرے سے باہر آگئی۔ کھلا تالا اسی طرح کنڈی میں ڈالا اور کانفرنس ہال کی طرف چلی گئی۔

" اے فریش فلاور فرام مالا بار ! " اُس نے کچھ دیر پہلے مجھے مخاطب کر کے کہا تھا۔

لنچ کے بعد گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے سبھی ڈیلی گیٹ آرام کرنے کے لیے باری باری اپنے کمروں میں آنے لگے۔ میں گیسٹ کے ایک طرف ریسپشن کاؤنٹر کے سامنے کرسی پر بیٹھی اپنے گروپ کی لڑکی تارا سے بات کر رہی تھی کہ وہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس بار بھی وہ سب سے آخر میں آیا تھا۔ مجھے لگا جیسے آخر میں آنا اُس کی عادت تھی۔ وہ کاؤنٹر کے قریب سے گزرا تو میں اور تارا دونوں کھڑی ہو گئیں۔

" پلیز سِٹ ڈاؤن "۔ اُس نے مسکرا کر کہا۔ اور دوسرے فلور پر جاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

کانفرنس کے دوسرے سیشن میں جانے سے پہلے وہ کاؤنٹر پر رکا۔ تارا اُس سمے وہاں نہیں تھی۔

" میرے کمرے کا تالا کس نے کھولا تھا ؟ "

" مجھے معلوم نہیں، سر "

"میز پر چائے کا تھرماس کس نے رکھا تھا؟"

"میں نے رکھا تھا سر!"

"میری چیزیں کس نے سنبھالی تھیں؟"

"سر، میں نے سنبھالی تھیں۔"

"تو تالا بھی تمہیں نے کھولا ہوگا؟"

"نہیں سر، آپ ہی کھلا چھوڑ گئے تھے۔"

اُس نے پل بھر حیران سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"اس کا مطلب ہے میں کبھی اِمپرو نہیں کر سکتا ویری سیڈ۔"

میں نے اپنے بارے میں اُس کے کیے ریمارک پر کوئی کمنٹ نہ کیا۔

"تمہاری یہ یونیورسٹی تو شہر سے بہت دور ہے۔"

"یس سر۔"

"یہاں سے شہر جانا تو بہت مشکل ہوگا؟"

"کہاں جانا چاہتے ہیں سر آپ؟"

"کالی کٹ کی اولڈ پورٹ پر۔"

"میں لے چلوں گی۔"

"کیسے؟"

"بس سے سر!"

"اور واپس کیسے آئیں گے؟"

"بس سے یا ٹیکسی سے۔ ایز یو لائیک سر۔"

"تو پانچ بجے چلیں گے۔"

"او۔کے۔"

میرا جواب سُن کر وہ مُسکرایا اور پھر اپنی خاموش اونگھتی ہوئی سی چال سے کانفرنس ہال کی طرف چلا گیا۔

شام کو جب ہم اولڈ پورٹ پہنچے تو سورج غروب ہونے کو تھا۔

"واسکوڈے گاما نے یہیں لینڈ کیا تھا کیا ؟"

"نہیں سر، وہ دوسری جگہ ہے۔ یہاں سے کوئی پندرہ میل دور۔ اُس جگہ کا نام کاپڈ ہے۔"

"آئی سی، ہم وہاں نہیں جا سکتے ؟"

"نو سر!"

"کانٹ یُو سٹاپ دِس سَر، ماتل پُو۔" اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

"یُو ڈاونٹ لائیک اِٹ ؟"

"ناٹ ایٹ آل۔"

اس کے بعد میں نے اسے سر کہہ کر مخاطب کرنا چھوڑ دیا۔

وہ میرا ہاتھ تھامے دیر تک ساحل کی ریت پر خاموش کھڑا بڑھتی ہوئی لہروں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ سمندر میں دُور مچھیروں کی کشتیاں نظر آ رہی تھیں۔ پھر اس نے میری کچھ تصویریں اتاریں اور پھر خشک ریت پر بیٹھے ہوئے اس نے کہا۔

"تم میرے لیے چائے لائی تھیں تو مجھے پلائی کیوں نہیں ؟"

"آپ کانفرنس ہال میں جا چکے تھے۔"

"مجھے جانے سے روکا کیوں نہیں تھا تم نے ؟"

"میں کیسے روک سکتی تھی ؟"

"جیسے مجھے یہاں لائی ہو۔ اس اولڈ پورٹ کے ساحل پر جہاں کسی زمانے میں ہندوستان کی تاریخ کو اچانک ایک نیا موڑ ملا تھا۔"

پل بھر کو خاموش رہ کر وہ بولا۔

"تم کہاں کی رہنے والی ہو ؟"

"تریچور کے ایک گاؤں کی جہاں ناریل اور کاشونٹ کے بڑے گھنے کھیت ہیں۔"

"وہیں اُگتے ہیں ماتل پُو کے پھول ؟"

" وہ تو سارے مالا بار میں اُگتے ہیں"۔ میں مسکرائی۔

" تم میرے لیے مالا بار کی شہزادی ہو جو مجھے کالی کٹ کے ساحل پر ڈوبتے سورج کی کرنوں میں ملی ہے۔ میں تمہیں سلام کرتا ہوں مانل پُو"!

" یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟ "

وہ کچھ نہیں بولا۔ بس میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے دیر تک سہلاتا رہا۔ پھر اندھیرا ہونے لگا اور سمندر میں دُور دُور گئے ہوئے مچھیروں نے اپنی اپنی کشتیوں میں روشنیاں جلا لیں۔

جب ہم یونیورسٹی کیمپس میں پہنچے تو ڈیلی گیٹ ڈنر کے لیے اولڈ ہوسٹل میں جا رہے تھے وہ بھی اولڈ ہوسٹل میں چلا گیا اور میں گیسٹ ہاؤس میں آ گئی۔

رات کو کلچرل پروگرام ختم ہونے کے بعد جب کوئی بارہ بجے کے قریب وہ گیسٹ ہاؤس میں لوٹا تو میں کاؤنٹر پر اُس کا انتظار کر رہی تھی۔

" تم ابھی تک سوئی نہیں ؟ "

" آپ کا انتظار کر رہی تھی ! "

" جاؤ اب سو جاؤ۔ گڈ نائٹ "!

" گڈ نائٹ ! "

وہ دوسرے فادر کی سیڑھیاں چڑھ گیا اور میں اولڈ ہوسٹل کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ تارا نے مجھ سے پوچھا کہ میں شام کہاں گئی تھی تو میں نے اُسے سب کچھ بتا دیا۔

" لیکن وہ تو یہاں صرف دو دن کے لیے ہے ! "

" مجھے معلوم ہے تارا ! "

" پھر ؟ "

" پھر وہ کالی کٹ سے چلا جائے گا۔ لیکن میرے دل میں اُس کی یادوں کے چراغ جلتے رہیں گے۔ سمندروں کے گہرے نیلے پانیوں میں "!

تارا مجھے بہت دیر تک سمجھاتی رہی اور میں بہت دیر تک ––– اپنے ذہن کے کواڑوں کو بند کر کے کھلی آنکھوں سے اُس کی باتیں سنتی رہی۔

کانفرنس کے بعد یونیورسٹی میں ایک ہفتہ کی چھٹیاں ہو رہی تھیں۔ مجھے تارا کے ساتھ اپنے گاؤں جانا تھا اور وہ کانفرنس کے بعد کنیا کماری جانا چاہتا تھا اور پھر وہاں سے واپس آکر اُس کا چنڈی گڑھ جانے کا پروگرام تھا۔

"تم میرے واپس آنے تک یہاں نہیں رُکو گی؟" اُس نے پوچھا تھا۔

"مجھے اپنے گاؤں جانا ہے"

"تو جاؤ۔ میں تمہارا دیا ہوا کاشونٹ کے ننھے ننھے گلابی پھولوں کا گچھا اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور تمہارے اُس لوک گیت کی لائینز یاد کر لیا کروں گا جو تم نے کل شام سُنایا تھا۔ کیا لائنز تھیں وہ؟ سناؤ گی نہیں ماتل پُو؟"

اُس کی بات سُن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے اپنی آنسو بھری آنکھوں اور لرزتی آواز سے اُسے وہ ملیالی لوک گیت سُنایا جو اسے بیحد پسند تھا۔

"ماتل پُو۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا"

اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور میں پھوٹ پڑی اور اُس کے سینے سے لگی روتی رہی۔

"میں تارا کے ساتھ گاؤں نہیں جاؤں گی۔ یہیں ویٹ کروں گی آپ کا۔ کنیا کماری سے واپس آنے تک"

اور اُس نے میری گیلی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور میں مُسکرا دی۔

اسی شام وہ کنیا کماری چلا گیا۔

اُس سے اگلی صبح ہوسٹل کی سبھی لڑکیاں اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ تارا بھی چلی گئی جو میرے ہی گاؤں کی لڑکی تھی لیکن میں نہیں گئی۔ میں اس کا انتظار کرتی رہی۔

تین روز کے بعد وہ واپس آ گیا اور گیسٹ ہاؤس پہنچتے ہی مجھ سے ملا۔

"میں آپ کا انتظار کرتی رہی ہوں۔ گاؤں نہیں گئی"

"شکریہ" اُس نے مسکرا کر کہا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوم لیا۔

اُس کے ساتھ کچھ فارینرز تھے جو کنیا کماری ہی سے اُس کے ساتھ کالی کٹ آ گئے تھے اُن میں ایک خوبصورت، پتلی سی، بھورے بالوں والی امریکی لڑکی تھی۔ جو سچ مچ بڑی چارمنگ تھی۔

"رشی از دی پرنسس آف مالابار" اُس نے میری طرف اشارہ کر کے اس امریکی لڑکی سے میرا تعارف کرایا۔

"آف کورس!" اُس نے میری طرف بڑے پیار سے مسکرا کر دیکھا۔ میں بھی مسکرا دی۔

اور پھر وہ ان سب کو گیسٹ ہاؤس میں لے گیا اور دیر تک اُن سے باتیں کرتا رہا۔ میں اسی کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے کمرے میں آیا۔

"یو آر ہیئر؟"

"یس" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے ان لوگوں کے ساتھ واسکوڈے گاما کی لینڈنگ پلیس تک جانا ہے۔ دیر میں لوٹوں گا اور پھر شاید کل انہی کے ساتھ بنگلور چلا جاؤں گا"

وہ اتنی جلدی سب کچھ کہتا جا رہا تھا کہ میں کچھ بول ہی نہ سکی۔

"وہاٹ شُڈ آئی ڈو؟" (WHAT SHOULD I DO?)

"گو ہوم۔ تمہارے لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے" اس نے کس سکون سے یہ بات کہہ دی تھی۔

اتنے میں وہ امریکی چارمنگ لڑکی اُسے آوازیں دیتے ہوئے اسی کے کمرے میں آ گئی۔

"جوشی کم، یُو آل ویز ڈی لے اورز"

اور اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب کر لیا۔ اُسے جس کا نام جوشی تھا اور جس کا نام بھی میں نے اب تک نہ پوچھا تھا۔ صرف آفس ریکارڈ ہی سے

جانا تھا کہ اس کا یہ نام تھا اور وہ پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ میں کام کرتا تھا۔

"آل رائٹ مائی پو۔"

اُس نے میرا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا اور امریکی لڑکی کا ہاتھ پکڑے کمرے سے باہر نکل گیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد گیٹ پر کھڑی ٹورسٹ بس میں بیٹھ کر اپنے فارنرز دوستوں کے ساتھ چلا گیا۔

کبھی کبھی سب کچھ کتنی جلدی سے ہو جاتا ہے اتنی جلدی سے کہ ہم جذبات کا تاثر بھی پوری طرح قبول نہیں کر پاتے۔ بس یہی کچھ ہوا تھا میرے ساتھ بھی۔ میں یونہی گُم صُم اُس کے کمرے میں بیٹھی رہی۔ پھر کمرہ بند کیا۔ تالے کی چابی کاؤنٹر کی دراز میں رکھی جہاں پچھلے پانچ دنوں سے رکھتی آئی تھی اور پھر اولڈ پورٹ کے ساحل پر آ گئی۔

چار روز پہلے اسی ساحل پر اُسے ساتھ لے کر آئی تھی۔ اسی ساحل کی ریت پر ہم دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ یہیں مجھے اُس نے کیرالا کے گاؤں کی ایک معمولی سی لڑکی سے مالا بار کی شہزادی بنا ڈالا تھا۔ یہیں اُس نے میری تصویریں اتاری تھیں۔ یہیں میں نے اس کے لیے سیپیاں چُنی تھیں۔ یہیں کھڑے ہو کر اس نے سورج کو سمندر اور آسمان کی حدوں میں پگھلتے دیکھا تھا۔ یہیں مچھیروں نے اپنی کشتیوں میں مدھم سی روشنیاں جلا کر ہمارا استقبال کیا تھا۔ سورج اب بھی اسی طرح پگھل کر سمندر کا حصہ بن گیا ہے۔ اندھیرا دھیرے دھیرے لہروں کے پانیوں میں گھُل رہا ہے اور دُور دُور تک گئی ہوئی کشتیوں میں مدھم سی روشنیاں ایک ایک کر کے جلنے لگی ہیں۔ وہ اپنے فارنر دوستوں کو واسکوڈے گاما کی لینڈنگ پلیس دِکھا چکنے کے بعد انھیں اِدھر اُدھر کہیں گھما رہا ہوگا اور میں یہاں باتوں اور خوابوں کے اُس تاج کو اتار کر لہروں کے حوالے کر رہی ہوں جو اس نے مجھے چار دن پہلے ساحل کی اس ریت پر پہنایا تھا اور جس کے جادو کے زیرِ اثر میں اپنے آپ کو مالا بار کی شہزادی سمجھ بیٹھی تھی۔ باتوں اور خوابوں کے تاج میں ٹنکے ہوئے پھولوں کی پنکھڑیاں لہروں میں بکھر رہی ہیں اور مالا بار کی شہزادی بالکل گاؤں کی ایک معمولی سی دیہاتی لڑکی کے روپ میں اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی ناریل کی لکڑی کے بنے

ہوئے کمزور سے کواڑ پہ دھیرے دھیرے دستک دے رہی ہے، اور گھر کے اندر ایک مدھم سا چراغ جل رہا ہے۔ ویسا ہی ایک چراغ جو دور لہروں پر جھومتے ہوئے کسی مچھیرے کی کشتی میں جل رہا ہے۔ جو چار دن پہلے میرے دل کے آنگن میں بھی جلا تھا۔

ہوا اچانک تیز ہو گئی ہے۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا ہے اور کشتیوں میں جلتے ہوئے چراغ ہوا کی لہروں میں جھومنے لگے ہیں اور میں سوچ رہی ہوں کہ جو لوگ پہلی ہی ملاقات میں کسی کو چاہنے لگتے ہیں وہ کتنے ناقابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔

ہماری مطبوعات

ناول وافسانے

گردشِ رنگِ چمن	قرۃ العین حیدر	۱۷۵/-
بازگوئی	سریندر پرکاش	۷۵/-
آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر	۱۵۰/-
آتے جاتے موسموں کا سچ	ہرچرن چاولہ (ناروے)	۶۰/-
ناروے کے بہترین افسانے	ہرچرن چاولہ (ناروے)	۶۰/-
چاندنی بیگم	قرۃ العین حیدر	۱۵۰/-
پہلی نسل کا گناہ	صفیہ صدیقی (لندن)	۷۵/-
البم	ہرچرن چاولہ (ناروے)	۷۵/-
ٹوٹتے بکھرتے لوگ	یوگیش کمار	۶۰/-
بے نام قاتل	یوگیش کمار	۶۰/-
وہی قتل بھی کرے ہے (لندن)	حیدر مہدی رضوی	۷۵/-
خواب رو	جوگندر پال	۴۰/-
میرا شہر ادھورا سا	کشمیری لال ذاکر	۱۲۵/-
آدھے چاند کی رات	کشمیری لال ذاکر	۷۵/-
آخری آدمی	انتظار حسین	۹۰/-
ٹھکانہ	حیات اللہ انصاری	۶۰/-
فسانہ کہیں جسے	عاشور کاظمی (لندن)	۱۵۰/-
یروشلم یروشلم	قیصر تمکین (لندن)	۶۰/-
سنہری پت جھڑ	نثار راہی	۶۰/-
موج ہوا پیچاں	ساجدہ زیدی	۶۰/-
کینچلی	غضنفر	۶۰/-
سر سید احمد خاں پنجاب میں (سفرنامہ)	سید محمد اقبال علی	۲۵/-

شاعری

شاخِ منظر	جمشید مسرور (ناروے)	۶۰/-
سنہری آنچ	واجد سحری	۳۰/-
شوخیٔ تحریر	سید محمد جعفری	۷۵/-
سمن زار: منتخب فارسی اشعار مع ترجمہ	ضیاء احمد بدایونی	۱۰۰/-
صلاح الدین پرویز کے خطوط	صلاح الدین پرویز	۶۰/-
نسخہ ہائے وفا	فیض احمد فیض	۷۵/-
سلیکٹڈ پوئمس آف بلراج کومل (انگریزی اردو)	مترجم بید بخت	۴۰/-
دلِ خاک بسر	شفق سوپوری	۵۰/-
تازہ ہوا	باقر نقوی (لندن)	۵۰/-
مہر دو نیم	افتخار عارف (لندن)	۶۰/-
غالب کی رہگذر	واجد سحری	۳۵/-
صراطِ منزل	عاشور کاظمی (لندن)	۶۰/-
آبِ نیساں	فرید پربتی	۱۵۰/-
نغمۂ حیات	دھرمندر ناتھ بھنوت سرمست	۶۰/-
بے نشان	شاہین	۷۵/-

اسلامیات

ہند و پاک میں اسلامی جدیدیت	عزیز احمد / جمیل جالبی	۱۲۵/-
ہند و پاک میں اسلامی کلچر	عزیز احمد / جمیل جالبی	۱۵۰/-
رہبر کامل صلی اللہ علیہ وسلم	عبدالاحد بٹ	۳۰/-
آخر اسلام ہی کیوں	عبدالاحد بٹ	۴۰/-
معلمِ اعظم (سیرۃ النبی)	منورہ نوری خلیق	۱۰۰/-
غالب اور تصوف	سید محمد مصطفیٰ صابری	۶۰/-

Educational Publishing House

3108, Gali Azeezuddeen Vakeel, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-110 006 (India)

Phones : 526162, 7774965